تواریخ ادبیاتِ اُردو کا تحقیقی جائزہ

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار

شازیہ نسیم

انرولمنٹ نمبر: IS/38302/Ph.D/UR/08

نگران مقالہ

ڈاکٹر محمد وسیم انجم

اسسٹنٹ پروفیسر۔شعبہ اُردو

وفاقی جامعہ اُردو اسلام آباد

شعبہ اُردو

وفاقی اُردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس وٹیکنالوجی اسلام آباد

جولائی ۲۰۱۷ء

تواریخ ادبیاتِ اُردو کا تحقیقی جائزہ

مقالہ نگار: شازیہ نسیم

انرولمنٹ نمبر: IS/38302/Ph.D/UR/08

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

وفاقی اُردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس وٹیکنالوجی اسلام آباد

یہ مقالہ **پی ایچ۔ڈی (اُردو)**

کی ڈگری کی تکمیل اور حصول کے لیے پیش کیا گیا ہے

کلیہ فنون

شعبہ اُردو

وفاقی اُردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس وٹیکنالوجی اسلام آباد

جولائی ۲۰۱۷ء

شازیہ نسیم

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مقالہ ہذا پڑھا اور اس کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحان کی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور کلیہ فنون کو اس کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

عنوان مقالہ: تواریخ ادبیاتِ اُردو کا تحقیقی جائزہ

پیش کار: شازیہ نسیم

رجسٹریشن نمبر: IS/38302/Ph.D/UR/08

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اُردو

ڈاکٹر محمد وسیم انجم ....

نگرانِ مقالہ

بیرونی ممتحن ....

چیئرمین شعبہ (اُردو) ....

ڈین ....

کلیہ فنون

جولائی ۲۰۱۷ء

اقرار نامہ

میں شازیہ نسیم حلفاً بیان کرتی ہوں کہ مقالے کے سلسلہ میں کی گئی تحقیق میری ذاتی ہے۔ وفاقی اُردو یونیورسٹی برائے فنون سائنس وٹیکنالوجی اسلام آباد کے پی ایچ۔ ڈی (اُردو) اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد وسیم انجم کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میرا تحقیقی مقالہ کسی اور ادارے یا یونیورسٹی میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش کیا گیا ہے اور نہ ہی آئندہ پیش کیا جائے گا۔

دستخط:.........................

شازیہ نسیم

(مقالہ نگار)

وفاقی اُردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس وٹیکنالوجی، اسلام آباد

جولائی ۲۰۱۷ء

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ مقالہ نگار شازیہ نسیم نے اپنا پی ایچ۔ڈی (اُردو) کا تحقیقی مقالہ بعنوان: ''تواریخِ ادبیاتِ اُردو کا تحقیقی جائزہ'' میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ مقالہ نگار نے ذاتی کاوش اور انتہائی محنت سے اپنی تحقیق کو مکمل کیا ہے۔ میں مقالہ نگار کے تحقیقی اور تنقیدی کاموں سے مطمئن ہوں اور یہ سفارش کرتا ہوں کہ اس مقالے کو جانچ کے لئے بیرونی ممتحنین کی خدمت میں ارسال کر دیا جائے۔

ڈاکٹر محمد وسیم انجم
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو
وفاقی جامعہ اُردو اسلام آباد
نگران مقالہ
تاریخ: ....

فہرست ابواب

فہرست عنوانات

باب اول: ادبی تاریخ نگاری پر مباحث

باب دوم: عمومی تاریخ نگاری

باب سوم صنف وار تاریخ نگاری

باب چہارم: علاقہ وار تاریخ نگاری

باب پنجم : عہد وار تاریخ نگاری

باب ششم : ماحصل

ابتدائیہ

میرا موضوعِ تحقیق ''تواریخِ ادبیاتِ اُردو کا تحقیقی جائزہ'' ہے۔ جو اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخ کا مطالعہ دل چسپ،

حقیقت کُشا اور زندگی آفریں ہوتا ہے۔ایک تاریخ واقعات،شخصیات اور تبدیلیوں کی معروضیت کو پیش کرتی ہے۔ یہ تاریخ زیادہ تر اہم واقعات،شخصیات اور غیر معمولی تبدیلیوں پر مشتمل ہے۔اس کا مطالعہ بھی اہم ہوتا ہے تاہم ایک تاریخ ادب کی بھی ہوتی ہے جس میں زبان ٗتہذیب ٗ ساجیات اور انسانی فطرت شامل ہوتی ہے۔تاریخ کا یہ باطنی رُخ بہت اہم ہوتا ہے۔اس تاریخ کو باشعور اور حساس طبقہ ہی محسوس کرتا ہے۔جب تک علم اور شعور کی فراوانی نہ ہو،تاریخ کے اس رخ پر نظر نہیں پڑتی۔ادب،تہذیب اور انسانی فطرت کو پیش کرتا ہے۔ادب کی پیش کش جہاں خداداد صلاحیتوں سے ممکن ہوتی ہے۔وہاں اس کی تفہیم بھی غیر معمولی صلاحیتوں کا تقاضا کرتی ہے۔ادب کی تاریخ نگاری درحقیقت تہذیب اور ساجیات کی تاریخ نگاری ہے۔ادب اپنے ساج اور تہذیبی تبدیلیوں سے مواد حاصل کرتا ہے۔اس لئے ادبی تاریخ نگاری صرف تخلیق کاروں کی ادبی خدمات کا جائزہ لینا نہیں ہے بلکہ تخلیقات میں تہذیب اور کلچر کو تلاش کرنا ہے۔میرا موضوعِ تحقیق درحقیقت تاریخ کے ان دونوں پہلوؤں کا جائزہ لینا ہے۔

پہلا باب: ''ادبی تاریخ نگاری پر مباحث'' تاریخ کا ساجی پس منظر،تاریخ کی اہمیت،تاریخ اور ادبی تاریخ نگاری،اُردو زبان و ادب کی تاریخ،ادبی تاریخ نگاری میں تسلسل کا فقدان،ادبی تاریخ نگاری کا سنہری دور،ادبی تاریخ نویسی کے مسائل،مؤرخین ادب کی خدمات،مؤرخ کے اوصاف،ادبی تاریخ نگاری،مشاہیرِ اُردو کی نظر میں، کے ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے جس میں کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ کا مفہوم واضح کیا جا سکے۔ساج اور تاریخ کے تعلق پر بحث ہو سکے،تاریخ کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی جا سکے۔اس باب میں کوشش کی گئی ہے اُردو زبان وادب کی تاریخ کو ساجی تناظر میں دیکھا جائے۔ادبی تاریخ نویسی کا ایک سنہری دور تھا اس کو بھی واضح کر دیا گیا ہے۔اس باب میں اُن مسائل کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جو تاریخ نویسی کے لئے سدِّ راہ بن جاتے ہیں۔تاریخ نویسی ہر ایک لکھاری کے بس کی بات نہیں ہے۔تحقیقی جستجو اور تنقیدی نظر اگر لکھنے والے میں موجود نہ ہو تو وہ تاریخ نہیں لکھ سکتا۔اِس پر مفصل بحث کی گئی ہے۔مؤرخ کے اوصاف کیا ہوتے ہیں ان کو بھی بیان کر دیا گیا ہے۔اس باب میں تاریخ نگاری کی اہمیت وافادیت پر مشاہیر کے ارشادات کو بیان کیا گیا ہے تاکہ اس کا مطالعہ دلچسپ ہو سکے۔کہا جا سکتا ہے کہ یہ باب اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد باقی تمام ابواب کے لئے جستجو بڑھ جاتی ہے۔

دوسرا باب آبِ حیات،شعرالہند،تاریخِ ادب اُردو،نمونہ منثورات،مختصر ادبِ اُردو،داستانِ تاریخ اُردو،تاریخ زبانِ اُردو،اُردو ادب،آج کا اُردو ادب،اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،اُردو زبان کی قدیم تاریخ،اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام،مختصر ادب اُردو،موجِ کوثر،اُردو ادب کی مختصر تاریخ،تاریخِ ادبیاتِ اُردو (اوّل،دوّم) وغیرہ کے جائزہ پر مشتمل ہے۔ان کتب کا جائزہ تحقیقی بھی ہے اور تنقیدی بھی۔آبِ حیات،تاریخ کا نقش اوّل ہے تاہم دیگر کتبِ تاریخ بھی تاریخ کے اہم پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں۔مؤرخینِ ادب نے اپنے اپنے نکتہ نظر سے تاریخ کو بیان کیا ہے۔اس باب میں ہر مؤرخ ادب کے نکتہ نظر کو بھی بیان کر دیا گیا ہے۔یوں اس باب میں نہ صرف تاریخ کی ارتقائی صورتِ حال سامنے آتی ہے بلکہ تحقیق وتنقید کا سفر بھی سامنے آتا ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ حقیقت نگاری کے دامن کو تھاما جائے اور تحقیق کیلئے جس سچائی اور دیانت کی ضرورت ہوتی ہے اسے محسوس کیا جائے اور سامنے بھی رکھا جائے۔اس باب کے مطالعے سے ہر ایک کتاب کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ سامنے آتا

ہے۔

باب سوم میں صنف وار تاریخ بیان کی گئی ہے۔اس باب میں جن کتب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے وہ اصناف کی ارتقائی تاریخ کو بیان کرتی ہیں۔ یہ باب اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ پہلی دفعہ اصناف کی تاریخ کو یکجا کر دیا گیا ہے۔اس میں گُلِ رعنا، تاریخ نظم ونثر اُردو، اُردو میں ڈراما نگاری جدید اُردو شاعری، اُردو میں حج کے سفرنامے، اُردو کی نثری داستانیں، اُردو کی دوقدیم مثنویاں، اُردو کی منظوم داستانیں، شعرائے اُردو کے تذکرے، اُردو سٹیج ڈراما، اُردو افسانے کا ارتقاء، داستان کی داستان، دبستانِ لکھنؤ کے داستانیں ادب کا ارتقاء، اُردو میں مقدمہ نگاری کی روایت، اُردو میں نعت گوئی، اُردو واسوخت، اُردو ڈراما، اُردو مثنویاں، اُردو ادب کی فنی تاریخ، اُردو کی بہترین مثنویاں، ہماری داستانیں وغیرہ۔ جیسے اہم کتب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلی دفعہ اصناف کے حوالے سے ایک مفصل مگر جامع تجزیہ اور تحقیق وتنقید کو پیش کیا گیا ہے۔اس باب کا مطالعہ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بہت اہم ہوگا۔اس باب میں بھی غیر جانب داری کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

باب چہارم میں علاقہ وار تاریخ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب میں ان کتب کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں اُردو کے آغاز وارتقاء کے متعلق نکتہ نظر بیان کیا گیا ہے۔دکن میں اُردو، پنجاب میں اُردو، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، دہلی کا دبستانِ شاعری، اُردوئے قدیم، سندھ میں اُردو، تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان وہند (جلداول تا پنجم) کا تفصیلی اور تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ان کتب کے حوالے سے اُردو کے آغاز وارتقاء پر روشنی پڑھتی ہے اور اُردو کے سفر میں معاون زبانوں کا اثر بھی معلوم ہوتا ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ ان کتب کے مصنفین کے نکتہ نظر کو بھی بیان کر دیا جائے اور اپنا نکتہ نظر بھی بیان کیا جائے تاکہ علاقائی برتری کی خواہش یا حقیقت کی حقیقت معلوم ہو سکے۔اس باب کا مطالعہ اُردو سے دلچسپی لکھنے والوں کے لئے معلومات افزاء ہوگا۔

باب پنجم: ''عہد وار تاریخ نگاری'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔اس باب میں جن کتب کا جائزہ لیا گیا ہے وہ بہت اہم ہے اور مندرجہ ذیل ہے۔داستانِ تاریخ اُردو (ابتداء سے بیسوی صدی کے آغاز تک)، تاریخ ادب اُردو (جلداول تا چہارم) از ڈاکٹر جمیل جالبی، اُردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ (شمالی ہند میں) ۱۸۵۷ء تک، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، اُردو نثر کا ارتقاء (۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۷ء) ڈاکٹر عابدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج (تحریک اور تاریخ) پروفیسر سید وقار عظیم، اُردو ادب کی تحریکیں ڈاکٹر انور سدید، اُردو شاعری کا ارتقاء ڈاکٹر ناہید کوثر اور ہزارہ میں اُردو زبان وادب کی تاریخ پروفیسر بشیر احمد سوزؔ۔اس باب کا مطالعہ قارئین کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس کے مطالعے سے اُردو ادب کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔خصوصاً ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتب کا جائزہ ادب کی مفصل تاریخ کو پیش کرتا ہے۔

باب ششم ''ماحصل'' کے عنوان سے ہے جس میں تمام ابواب کا غائرانہ جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب میں باب اوّل سے باب پنجم تک کا اس طرح جائزہ لیا گیا ہے کہ اگر اس باب کا صرف جائزہ لے لیا جائے تو تمام مقالے کا سیاق وسباق سامنے آجاتا ہے۔اس باب میں کوشش کی گئی ہے کہ کوئی تشنگی نہ رہ جائے۔مقالے کی تحقیق نئے مروجہ اصولوں کے مطابق کی گئی ہے۔حوالہ

جات، کتابیات کا اندراج ٹھوس بنیادوں پر کیا گیا ہے اور آخر میں اشاریہ بھی مرتب کر دیا گیا ہے۔ مقالہ ہذا ڈاکٹر محمد وسیم انجم کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔

رب ذوالجلال کا جس قدر بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ جس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں وفاقی جامعہ اُردو کے شعبہ اُردو میں پی ایچ ڈی کا مقالہ پیش کرنے کے قابل ہوئی۔ اپنی زندگی میں پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے یہ سب کچھ ایک خواب لگتا ہے کہ میں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اتنے بڑے بڑے اہل علم و دانش لوگوں کے ساتھ وقت گزارنا، ان کے قیمتی لمحات اور اُن کے علم وفراست سے استفادہ کرنا میری زندگی میں حیران کن اور ایک خوب کی صورت ہے۔ بہر حال اللہ تبارک وتعالیٰ جسے چاہتا ہے اسے اپنی رحمتوں سے نواز دیتا ہے۔ اس کے مصداق اُسی رب نے مجھے یہ موقع بھی فراہم کیا کہ یونیورسٹی تک پہنچنے کے سفر میں ایک بڑا مسئلہ تو زندگی کی بے شمار مصروفیات کے باوجود باقاعدہ تعلیم جاری رکھنا تھا لیکن میرے اساتذہ کرام کی باقاعدہ رہنمائی نے اسے ممکن بنا دیا۔ دوسرے میرے مالی وسائل بھی اس قابل نہیں تھے کہ میں باقاعدگی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی۔ اس لئے یہ یہاں تک پہنچنے میں زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ ہمارا علاقہ بھی پسماندہ تھا لیکن اس کے باوجود ہمت نہ ہاری اور ہر بار آگے بڑھنے کے لئے تمام مسائل کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے تئیں کامیاب ہوئی۔ وفاقی اُردو یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمد وسیم انجم "تحقیق اور تاریخ ادب اُردو" کا نصاب پڑھانے آئے تو انہوں نے پہلے دن یہ لیکچر دیا:

"جب تک آپ کے اندر تحقیق اور تحریک پیدا نہیں ہوگی تو زندگی میں کوئی کام انجام نہیں دے سکیں گے"۔

میرے اندر تلاش وجستجو کی تحریک پیدا کرنے کے لئے بہت سے اساتذہ کرام نے بنیادی کردار ادا کیا اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اب میں تمام اساتذہ کرام کا شکریہ ادا کرنا شروع کروں تو میرے پاس الفاظ کم پڑ جائیں گے اور ان کا شکریہ مجھ پر زیادہ واجب ہوگا۔

ادبی تاریخ نویسی پر تحقیق کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس تحقیق کے دوران یہ بات شدت سے محسوس کی کہ ہمارے مؤرخین کی اکثریت ادبی تاریخ نویسی کے اصولوں اور تقاضوں سے روگردانی کرتی رہی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند نے عمومی تاریخ نویسی کی بیش تر کتب کو اکھٹا کرنے کی کوشش کی جو لائق ستائش ہے۔ راقمہ نے اس مقالہ میں ان اصولوں کی نشاندہی کر دی ہے جنہیں نظر انداز کیا جاتا رہا۔

زیرِ نظر تحقیقی مقالہ (پی ایچ۔ ڈی اُردو) میری تحقیقی کاوش ہے جسے میں نے مربوط ومبسوط مکمل کیا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ادب کے قارئین، اساتذہ کرام اور محققین کے لئے زیادہ سے زیادہ تحقیقی معلومات فراہم کر سکوں، تحقیق کے اس میدان میں دلچسپی کا باعث میرے اساتذہ کرام کا شفقت بھرا ہاتھ ہے۔

میرا تعلق کشمیر کے علاقے ضلع بھمبر، تحصیل برنالہ سے ہے۔ وہاں ادبی مراکز اور علم و ادب کے حوالے سے کوئی مستند ادارہ یا جامعہ نہیں ہے۔ اس لئے مجھے اسلام آباد کا رخ کرنا پڑا۔ والدین کی خصوصی شفقت اور تعاون نے مجھے آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا اور میں علم کے مدارج کی تکمیل میں کامیاب و کامران ہوئی۔ ادبی تاریخ کا موضوع اس لئے منتخب کیا کہ مجھے تاریخ سے گہری دلچسپی رہی اور میں نے تاریخ، اسلامیات، سیاسیات کے امتحانات بھی پاس کئے ہوئے ہیں۔

پی ایچ۔ڈی اُردو میں داخلہ لینے کے بعد پی ایچ۔ڈی کا یہ موضوع میرے چاروں ایم اے کی ڈگریوں سے مطابقت رکھتا تھا جس کی بدولت مقالہ کی تحقیق میں خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ میرا موضوع ''تواریخِ ادبیات اُردو کا تحقیقی جائزہ'' کے عنوان سے ہے۔

مقالے کے نگران ڈاکٹر محمد وسیم انجم اس موضوع کا محرک ہیں۔ انہوں نے مجھے اس موضوع کی طرف راغب کیا تو اگرچہ تواریخ کی کتب پر کام کرنا مشکل ہے مگر میرے اساتذہ کرام کی رہنمائی میرے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔

موضوع کے حوالے سے میری ملاقات ڈاکٹر عطش درانی سے ہوئی۔ انہوں نے اس موضوع کی نہ صرف تعریف کی بلکہ میری حوصلہ افزائی کی اور مقالے سے متعلق مواد کی نشاندہی کرتے ہوئے مجھے ڈاکٹر روبینہ ترین (ملتان) سے رابطہ کرنے کو کہا۔ میں نے ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے مواد کی فراہمی میں میری مدد و رہنمائی کی۔ میں ان کی تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ تحقیق کی تلاش و جستجو میں جب ادارہ فروغ قومی زبان گئی تو وہاں سے مجھے کچھ مواد مل گیا۔ اس ادارے کے صدر نشین معروف شاعر و محقق اور صاحبِ علم و دانش جناب افتخار عارف سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے میری مدد اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ موضوع بہت اچھا ہے۔ اس موضوع پر محنت کی بہت ضرورت ہے اور جب انہوں نے نگران کا پوچھا تو میں نے ڈاکٹر محمد وسیم انجم کا بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ آپ کے استاد محترم بہت شفیق، محنتی اور محقق ہیں۔ آپ یقیناً اُن کی نگرانی میں اس موضوع کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں گی (انشاءاللہ) اور بہت دعائیں دی اور مواد کے حصول کے لئے فرمایا کہ اگر ادارے کی لائبریری میں نہیں ہے تو جہاں بھی ہے وہاں سے اپنے خرچے پر منگوا دوں گا۔ یہ میرے لئے بڑے اعزاز اور فخر کی بات تھی۔ ان کے احسانات کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں کہ ان کا شکریہ ادا کرسکوں۔ اس کے علاوہ ادارہ فروغِ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) کی (ڈائریکٹر) ڈاکٹر انجم حمید کی بہت مشکور ہوں کہ وہ قدم بہ قدم پر میری رہنمائی کرتی رہی۔ میں اکثر پریشان ہوجاتی تو میری حوصلہ افزائی کرتیں۔ مجھے تحقیق کی جستجو کے لئے مختلف لائبریریوں میں جانا پڑتا تو وہاں کے لائبریرین کتابوں کے سلسلے میں میرے ساتھ بہت تعاون کرتے رہے۔ اسی طرح ادارہ فروغ قومی زبان میں امتیاز علی، محمد انور سرور (لائبریرین)، ریاض جنجوعہ، شگفتہ طاہر، عارف حسین، میونسپل لائبریری (لیاقت باغ، راولپنڈی) کے سٹاف ممبران شاہد ایوب مرزا، محمد رفیق بھٹی اور صائمہ صدف،

نیشنل لائبریری اسلام آباد کے محمد ریاض الصالحین، فیض الاسلام کے منیجر محمد اسلم، اکادمی ادبیات کے ڈائریکٹر ڈاکٹر راشد حمید، لائبریرین نصیر الدین آزر، فرزانہ خان، پبلک لائبریری (فیض احمد فیض روڈ، اسلام آباد) کے محمد ناصر اور کنٹونمنٹ لائبریری (راولپنڈی) کے عملہ کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں۔

اپنے والدین کی دعاؤں کے بارے میں عرض کرتی چلوں کہ میری والدہ اور میرے والد گرامی وہ ہستیاں ہیں جن کے بارے میں ہوش سنبھالتے ہی میرے ذہن میں ایک تصور پیدا ہو گیا تھا کہ دونوں ہستیاں باقی لوگوں کے مقابلے میں بلند مرتبہ اور مثالی ہیں اور ان جیسا عکس مجھے باقی لوگوں میں نظر نہیں آیا۔ یقیناً ان کی دعائیں میرے شامل حال ہیں اور میری والدہ مجھے ہمیشہ کہا کرتی ہیں کہ جب بھی تمہارے بارے میں کوئی سوال کرتا ہے تو میں تمہارے منصب کا ایک درجہ اوپر بتاتی ہوں اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتی ہوں اور تمہارا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ ان کے اظہار تشکر میں صرف اتنا کہوں گی کہ اس وقت ذہن میں الفاظ کی بجائے میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو ہیں۔

مقالہ ہٰذا کی تحقیق میں مذکورہ شخصیات کے ساتھ میرے اساتذہ کرام اور کلاس فیلوز کا بھی تعاون رہا ہے جو ہمہ وقت میرے اندر تحریک پیدا کرتے رہے کہ مقالہ کے کام پر توجہ دو۔ ان میں ڈاکٹر محمد وسیم انجم، ڈاکٹر حافظ عبدالرشید (اسلامیات)، ڈاکٹر منور ہاشمی، ڈاکٹر ناہید قمر، ڈاکٹر فہمیدہ تبسم، ڈاکٹر سید عون ساجد، ڈاکٹر روشن آراء راؤ، ڈاکٹر سعدیہ طاہر، ڈاکٹر علی کمیل قزلباش، ڈاکٹر عزیز الرحمٰن عزیز نظامی، ڈاکٹر حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر الطاف حسین بھٹہ، اطہر رفیق، حافظ محمود طاہر، محمد مزمل چشتی، نوشاد روفی، محمد نور شامل ہیں جن کا بھرپور تعاون رہا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ ہمیشہ اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور غیب سے ان کی مدد فرمائے۔ (آمین)

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

شازیہ نسیم

Abstract

RESEARCH OVERVIEW OF THE CHRONICLES/ HISTORY OF URDU LITERATURE

The human history commenced with Hazrat Adam, which we find with Koran-e-Hakim. Over the past two centuries, where man is able to discern and subdue the universe, he has also been successfully trying to perceive human history. God sent one lac and twenty four thousand prophets in the world. Until the time of Muhammad's (PBUH) conquest, the human history had set a distance of millions of years.

The history of the Muslims originated almost fourteen centuries ago with the holy being of the Prophet Muhammad (PBUH). Currently, Muslims are settled in every corner of the world but largely in Asia. Holy Kaa'ba (the holiest shrine in Islam) of Muslims is in Saudi Arabia. Arabic is the language of the Qur'an, therefore it has religious connotation. The official and religious language of the Muslims of Arab countries is Arabic. However, there are some countries which are Islamic but their official language is different.

Pakistan is also one such country in Asia. According to the Constitution of 1973, it has been affirmed that during the next fifteen years, such arrangements should be made to make Urdu an official language of Pakistan. In this regard, clear instructions have been promulgated by the Prime Minister and the Supreme Court of Pakistan and they are also being implemented. The story of the inception and amelioration of Urdu language is protracted and

enticing at the same time. Urdu language as well as Urdu literature keeps rank of an alluring and classical literature. My thesis is also hinge on the research review of the history of Urdu language and literature.

The Urdu language took birth in India during the era of independent Islamic kingdom (Khandan e Ghulama) but its seeds had been sown long before. After 'Khandan e Ghulama', when Mughal Emperor Zaheerud din Babur overthrew last Sultan of Delhi, Ibrahim Lodhi, Urdu language had successfully spent the time of its infancy. We mark its dawn from Behman Dynasty of south India while, its midday with the efforts of Adil Shah and Qutub Shah Dynasties of the same part of India. These two dynasties have vital contributions in the process of upbringing of Urdu literature and language to the level of sophistication. I have presented Research Overview of all the credible books published till now, on the subject of Origin and Evolution of Urdu language. This topic is assigned to me by Federal Urdu University for Science and Technology Islamabad for Ph .D Urdu. I have divided it into six chapters. Details are as follows:

"Debates on Literary Historiography" is the first chapter of my thesis. In this chapter, Origin, evolution, importance and functions of literary historiography are highlighted in detail. 'History of Urdu Literature and its Functions' is the key component of the chapter.

The title of second chapter is 'General Historiography'. It is

the most tedious andlengthy chapter of thesis. There are myriad books published on the theme of 'History of Urdu Literature', this chapter comprise of their critical overview which makes this chapter distinctly important as compare to the others. The books included in this chapter are the most accredited and appraised in academic and literary circles. From Maulana Muhammad Hossain Azad's 'Aab-e-Hayat' to Gar cin Dattasi's ' History of Urdu Literature', all handpicked books are included, and they reflect a vivid picture of the overall situation of literature.

"Historiography by Genres" is third chapter. Same like the previous one, it is a lengthy chapter. The books, remained under study for this chapter, belong to various genres of Urdu Literature. Books written on the topics of Daastan, Ma snave, Travelogue, Naa't, Wasoukht, Drama and other genres are being discussed and overviewed in detail in this chapter.

Fourth Chapter is with the title of "Area wise Historiography". The books regarding development of Urdu literature in assorted Areas are being scrutinized. All works of historians, who took review of distinct literary endeavors and School of thoughts related to diverse parts of subcontinent, especially Sind, Punjab, Dakin, Lahore, and Lakhnow, are included in this chapter.

'Era wise Historiography' is next chapter. This chapter presents the critique of those history books which discussed various eras of Urdu literature in particular. All authentic books which cover

literary periods in context of origin and evolution of Urdu Literature are included in this chapter. Urdu literature has created many literary movements in different time spans. That is why; books comprising history of literary movements are also part of this chapter.

Sixth Chapter is the "Conclusion". In this part the overall situation of the study has been reviewed.

I brought all available books under study, which was credibly authentic. The research has been conducted according to most modern research paradigms. References and bibliographies are given correctly with an elaborated index at the end.

Research work has been completed under the kind supervision of Dr. Muhammad Wasim Anjum (Asst. Prof. Urdu Department).

باب اوّل : ادبی تاریخ نگاری پر مباحث

ا۔ تاریخ

ادبی تاریخ کے مباحث میں جانے سے پہلے تاریخ اور ادبی تاریخ کے معانی اور مفاہیم اور ارتقاء پر بات کرنا ضروری ہے۔ تاریخ کے معانی کسی چیز کے ظہور کا وقت، ایک دن، رات مہینے کا ایک دن، وہ فن یا کتاب جس میں بادشاہوں اور مشہور آدمیوں کے حالات، پیدائش اور وفات درج ہوں، روایات، قصے اور افسانے، جنگ نامے۔ جمع تواریخ (۱) یعنی گزرا ہوا زمانہ، گزری ہوئی باتیں، یادداشتیں اور وہ سب کچھ جو ازل سے تا امروز ہوتا ہے سب تاریخ کے زمرے میں آئیں گے۔ تاریخ آدمؑ سے لے کر گزشتہ کل کو اگر ہم کوئی نام دینا چاہیں تو وہ نام تاریخ ہی ہوگا۔ انگریزی میں تاریخ کو ''History'' کا نام دیا گیا ہے گویا گزرے زمانے کو ہم عام الفاظ میں تاریخ کا نام دے سکتے ہیں۔

تاریخ کا میدان بہت وسیع ہے البتہ اس طرف توجہ نہ دینے کی وجہ سے اس موضوع کی اہمیت پر سیرِ حاصل گفتگو نہیں ملتی۔ کائنات میں گزرنے والا ہر ایک لمحہ اپنے اندر بہت سے واقعات رکھتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی اہمیت کو واضح کون کرے۔ اولادِ آدمؑ کا فرض ہے کہ کائنات کے ہر لمحے اور حقیقت کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کریں۔

تاریخ ان واقعات کا مجموعہ ہے جو معنی خیز ہوں اور مستقبل میں رہنما کا درجہ رکھتے ہیں۔ تاریخ ایک ارتقاء کا سفر ہے۔ ماضی سے روشنی لے کر مستقبل کو بہتر بنانے کا سفر ہے۔ ماضی کی کوتاہیوں سے سبق سیکھنے کا نام تاریخ ہے اور مستقبل کو مینارہ نور بنانے کا نام تاریخ ہے۔ تاریخ سے نہ صرف اقوام کے عروج و زوال کا علم حاصل ہوتا ہے بلکہ تاریخ سے اقوام کی تہذیب و تمدن اور ادب کا مطالعہ بھی ہوتا ہے۔ علم و فضل اور زبان و کلچر سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ گویا تاریخ تہذیب اور ادب کا نام ہے۔ سماج اور معاشرت کا نام ہے۔ تاریخ صرف واقعات کا نام نہیں ہے تاریخ تو کلچر کا نام ہے۔ تاریخ کا تعلق تخلیقی واقعات سے وابستہ ہے۔ زوار حسین کہتے ہیں:

> ''تاریخ کو ایک قبل از تاریخی بے نشان سطح سے اخذ کیا گیا ہے۔ ماضی قدیم کی اس صورتِ حال کے برعکس، تاریخ کے لئے لازم آیا کہ وہ واقعات کے زمان و مکان کی صحیح طور پر نشاندہی کرے۔ حقیقت اور افسانہ کی تفریق کا لحاظ رکھے اور واقعات کی تصدیق کے لئے مشاہداتی ذرائع اختیار کرے۔

تاریخ کا اساسی تعلق انسان کی طرف سے پیدا کردہ تخلیقی واقعات سے ہے‘‘۔(۲)

تاریخ کا آغاز اس وقت ہوا جب ماہ وسال اور واقعات کو قلم بند کیے جانے لگا تاہم تاریخ کا حقیقی آغاز اس وقت ہوا جب انسان کے تخلیقی فن پاروں کو احاطہ تحریر میں لایا گیا۔ڈاکٹر ناہید قمر نے تاریخ نگاری کے حوالے سے لکھا ہے:

’’اصل میں تاریخ نگاری کا مقصد ماضی کی بازیافت ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پرانی کتابوں میں لکھے گئے واقعات کو دہرایا جائے۔ پھر ماضی کی تاریخ لکھنے والوں کی ذمہ داری تو اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ ہر عہد کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی مدوجزر اور قدروں کو پیش نظر رکھ کر واقعات کو جانچنا، پرکھنا اور ان میں باہمی تعلق کو دریافت کر کے متعلقہ عہد کے صحیح خدوخال کو پیش کرنا آسان کام نہیں ہے‘‘۔(۳)

ڈاکٹر ناہید قمر نے تاریخ کو ماضی کی بازیافت اور معاشرتی، ثقافتی اور معاشی اہم واقعات کو پیش کرنے کا نام دیا ہے گویا تاریخ محض سیاسی واقعات کا تسلسل نہیں ہے۔

۲۔ تاریخ کا سماجی پس منظر

حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد تک تو تاریخ ایک ہی جگہ اور ایک ہی خاندان میں مقیم رہی۔ جوں جوں انسانی آبادی بڑھتی گئی تاریخ بھی اپنے آپ کو پھیلاتی رہی جب یہ سلسلہ باقی انبیاءؑ تک پہنچا تو تاریخ بھی مختلف خاندانوں میں تقسیم ہوتی گئی۔آج ہر نبی کی امت کی الگ الگ تاریخ موجود ہے۔ یہ سلسلہ آخری نبی حضرت محمدﷺ تک پہنچا تو تاریخ میں بے شمار خاندان منظر عام پر آ گئے لیکن اس کے باوجود وہ تاریخ جو ایک خاندان سے شروع ہوئی آج سوائے اللہ تعالیٰ کے اسے کوئی سمیٹ نہیں سکتا۔اس کا پھیلاؤ اتنا ہوا کہ آج اس کا بہت کم حصہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔ دنیا میں اربوں، کھربوں انسانوں نے جنم لیا جن کی مکمل تاریخ سے کوئی بھی انسان واقف نہیں ہے۔ سماج اور معاشرت تاریخ میں موجود ہوتے ہیں نہ صرف تاریخ ابتداً سماج اور معاشرت کی ابتدائی صورت کو بیان کرتی ہے بلکہ ایک عہد کے سماج اور معاشرت کا مجموعی تاثر پیدا کرتی ہے۔ ہماری معاشرت میں بنی نوع انسان کے رجحانات اور عادات واطوار شامل ہوتے ہیں۔طرزِ زندگی، رہن سہن، فکر وفلسفہ، معیشت، سیاست، ایک دوسرے سے لین دین، مفادات اور نقصانات سب شامل ہوتے ہیں۔تاریخ سب کو بیان کرنے کا نام ہے۔ تاریخ پڑھتے ہوئے معاشی اقدار کے عروج وزوال کا پتا چلتا ہے۔اسی معاشرت کی ابتدائی صورت تہذیب ہے اور اس کے بیانیہ کو تاریخ کہتے ہیں۔محمد مجیب لکھتے ہیں:

’’ہم جسے تہذیب کہتے ہیں اس کے معنی ہیں دین، ایمان، دھرم، قانون اور علم کے سائے میں زندگی بسر کرنا اپنی محنت سے اس زندگی کو سرسبز رکھنا، نیک حوصلوں سے اس کو رونق دینا اور صنعت وتجارت

کے ذریعے سے وہ چیزیں حاصل کرنا جن سے آرام پہنچتا ہے۔ ہر قوم اپنی زندگی اپنی طبعیت اور مزاج کے ڈھنگ پر بناتی اور سنوراتی ہے‘‘۔(۴)

تاریخ اپنے اندر بہت سے واقعات رکھتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان نے اس کو محفوظ کرنے کا عمل شروع کیا۔ جو آہستہ آہستہ بحرِ بے کراں کی صورت اختیار کرتا گیا۔ آج سماجی تاریخ ہر خطے اور ہر ملک کی طویل بھی ہے اور ضخیم بھی ہے۔ دنیا کا ہر خطہ ایک آزاد اور خود مختار باب کی طرح ہے جس کی کڑیاں دوسرے ابواب سے اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ ان کو الگ کرنا ناممکن ہے۔

۳۔ تاریخ کی اہمیت

تاریخ کی اہمیت ہر میدان میں مسلمہ ہے۔ جس قوم کی تاریخ جتنی پرانی ہوگی وہ اتنی ہی زیادہ ترقی یافتہ ہوگی۔ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ قومیں صرف اور صرف تاریخ سے بنتی ہیں۔ جس قوم نے بھی جغرافیہ یا وطن کی بنیاد پر اپنے آپ کو پروان چڑھایا اس نے کہیں نہ کہیں اپنی اس کوتاہی کو محسوس ضرور کیا ہوگا۔ بہت سے ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ تاریخ، تہذیب اور کسی خاص نظریے کے تحت جنم لینے والی قومیں ہمیشہ کامیاب رہتی ہیں اور ترقی کے نئے راستوں پر چلتے ہوئے دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتی ہیں۔

تاریخ کو محفوظ کرنے کا آغاز تخلیق آدم کے ہزاروں سال بعد ہوا۔ حرف سے حرف ملا تو لفظ بنا اور لفظوں میں جب اشتراکی عمل شروع ہوا تو فقرے کا ظہور ہوا۔ لفظ سماجی ضرورت تھا اس لئے اس نے ایک دن ایجاد ہونا ہی تھا۔ جس دن لفظ کی صورت میں انسان کو اسم اعظم مل گیا اسی دن سے تہذیب و تمدن کو محفوظ کرنے کے عمل کا آغاز ہو بھی گیا۔ یوں تاریخ عالم وجود میں آ گئی۔۔۔۔’’تاریخ۔ اس سے پہلے تاریخ‘‘ صرف اساطیر، قصص، روایات اور ضرب المثال کی صورت میں ملتی تھی۔(۵)

تاریخ کی اہمیت مسلمہ ہے۔ تاریخ سے ہی کلچر، تمدن اور تہذیب نے جنم لیا ہے۔ جس سے ایک ارتقائی صورت ہمارے سامنے آتی ہے تاریخ نے انسانوں کے رویوں اور رجحانات سے آگاہ کیا۔ تاریخ ہمارے سامنے نہ ہوتی تو آج کا انسان مہذب نہ ہوتا۔ اس کے پاس زبان نہ ہوتی۔ ادب نہ ہوتا اور معاشرت ترقی یافتہ صورت میں نظر نہ آتی۔ تاریخ کے آغاز سے پہلے انسان غیر مہذب اور وحشی تھا۔ یہ تاریخی سفر ہی ہے جس نے آج کے معاشرے کو جنم دیا ہے۔ سبط حسن تاریخ سے جنم لینے والے تمدن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’تمدن کی بنیادی شرط شہری زندگی ہے۔ تمدن اسی وقت وجود میں آتا ہے جب شہر آباد ہوتے ہیں۔

دراصل تمدن ہی ان رشتوں کی تنظیم کا ہے جوشہری زندگی اپنے ساتھ لاتی ہے۔خواہ یہ تنظیم انسان کے باہمی رشتوں سے تعلق رکھتی ہو یا انسان اور مادی چیزوں کے باہمی ربط سے وابستہ ہو۔تحریر کا رواج بھی تمدن ہی کا مظہر ہے کیونکہ وہ معاشرہ جوفن سے ناواقف ہومہذب کہا جاسکتا ہے لیکن متمدن نہیں کہا جاسکتا''۔(۶)

معاشرت ایک جامع حقیقت کو پیش کرتی ہے۔انسان،تحریراورتمدن کا ملاپ ہوتو متمدن معاشرت کہلاتی ہے۔ان کو ایک دوسرے سے جدا رکھ کرنہیں دکھایا جاسکتا۔

۴۔ تاریخ اورادبی تاریخ نگاری

تاریخ کے بعدادبی تاریخ نگاری پر بات کی جائے تو ہمیں ادب اورادبی تاریخ نگاری کے معنی متعین کرنے ہوں گے۔جس طرح ہرقوم کی اپنی تاریخ،تہذیب وتمدن اور کلچر ہوتا ہےاسی طرح ہرقوم علاقائی زبانوں کےساتھ ساتھ ایک خاص زبان بھی بولتی ہے جواس کی پہچان ہوتی ہے۔جوقوم جتنی قدیم ہوگی اس کی زبان بھی اتنی ہی قدیم ہوگی۔قوم اورزبان کی قدیم تاریخ ہی دراصل ادب کی تاریخ بنتی ہےاس لئے زبان جتنی پرانی ہوگی اس کا ادب بھی اعلیٰ،مضبوط،معنی خیزاورکلاسک ہوگا۔ ہرزبان کا خاص ادب ہوتا ہے۔جواس کی عکاسی اورترجمانی کرتا ہے۔ہردورمیں ادب کے موضوعات مختلف ضرورر ہے ہیں۔ دنیاکےجس ادب میں آفاقیت کا عنصرتھاوہ اب تک زندہ ہےاورآئندہ بھی زندہ رہے گا جن زبانوں کےادب نے دنیا کومتاثر کیا۔ان میں عربی، فارسی،فرانسیسی، روسی، یونانی،انگریزی اوراُردوایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ان زبانوں کےادب میں وہ تخلیقیت کی قوت پائی جاتی ہے۔جوعالمی ادب میں اپنے آپ کوزندہ رکھ سکے۔

ادبی تاریخ نگاری عام تاریخ کے مقابلے میں پیچیدہ اورنازک ہوتی ہے۔عام تاریخ میں محض ماہ وسال اورمعلومات مرتب کی جاتی ہیں۔جبکہ ادبی تاریخ نگاری میں تخلیق کار کی تخلیقات کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور معاشرے کے احساسات، جذبات،تہذیب اورکلچرکو بیان کیا جاتا ہے۔مؤرخ ذاتی پسندوناپسندکی پرواہ کئے بغیر وہاں ادبی تاریخ مرتب کرتا ہے۔جانب داری کے نتیجے میں ادب کلاسکیت سے دورہوجاتا ہے۔گویاادبی تاریخ کے معیارات عام تاریخ سے جداگانہ اور گہری بصیرت کا تقاضا کرتے ہیں۔

تاریخ اورادبی تاریخ نگاری کا گہراتعلق ہے۔ادب،معاشرت اورسماج کا عکاس ہوتا ہے۔خصوصاً معاشرے کے باطن جذبات واحساسات کوادب بیان کرتا ہے۔ادب سفرحیات کے داخل کا ترجمان ہوتا ہے۔ادبی تاریخ نگاری نہ صرف ادب پر گہری نظر کا تقاضا کرتی ہے بلکہ معاشرے کےتہذیبی،تمدنی عناصر پرتوجہ دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ڈاکٹرعلی جاوید لکھتے

ہیں:

’’ادبی تاریخ کو نہ محض ادب پاروں کے جمالیاتی کیفیات یا تنقید قرار دیا جاسکتا ہے نہ محض بدلتے ہوئے مذاقِ سخن کی دستاویز بلکہ وہ زبان اور ادب کے نشوونما کی داستان بھی بیان کرتی ہے اور ان کے پیچھے بدلتے ہوئے ادبی ذوق کی کہانی بھی کہتی ہے۔ ادبی تاریخ ادب اور سماج دونوں کو مکمل اکائی کی شکل میں دیکھتی ہے اور ادب کو سماج کی تخلیق اور ادب کے سماج پر اثرات، دونوں کے رابطے سے بحث کرتی ہے‘‘۔(۷)

ادبی تاریخ ادب، تنقید اور زبان و ادب کی ارتقائی صورت کو متوازن انداز میں بیان کرنے کا نام ہے اور ادب اور سماج کو ایک یونٹ کی صورت میں پیش کرنے کی سعی ہے۔ جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

’’تاریخ ادب پڑھتے ہوئے یہ بات بھی محسوس ہونی چاہیے کہ جہاں مخصوص واقعات و رجحانات شخصیتوں کو جنم دے رہے ہیں وہاں ادبی شخصیات بھی واقعات و رجحانات کو جنم دے کر تاریخی دھارے کو نئی جہت دے رہی ہیں۔ زندگی میں جو حرکت و عمل نظر آتے ہیں ان کی واضح جھلک ادبی تاریخ میں بھی نظر آنی چاہئے‘‘۔(۸)

ادبی تاریخ نگاری ان واقعات کو بھی پیش کرتی ہے جو بڑی شخصیتوں کو جنم دیتے ہیں۔ ادبی تاریخ نگاری غیر معمولی واقعات کی پیش کش کا نام ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

’’ادبی تاریخ ایک طرف تاریخ ہے، دوسری طرف ادب۔ یہ سوانح نگاری اور تنقید کے امتزاج سے بنی ہے لیکن اسے تحریک ملی۔ سیاسی تاریخ سے جس کی مماثلت پر اس نے سوانحات کو ترتیب دیا۔ بعد میں ادبی اصناف کی شعریات کا بھی اضافہ کیا۔ ادبی تاریخ اور سیاسی تاریخ میں ایک بڑا فرق ہے۔ سیاسی تاریخ کے واقعات ماضی کے پردہ عدم میں مکتوم ہیں جب کہ ادبی تاریخ کی ماضی کی تخلیقات ہمارے سامنے موجود ہیں جن کی وجہ سے ٹی ایس ایلیٹ نے ادب میں ماضی و حال کی تقسیم سے انکار کیا تھا۔ ادبی تاریخ رقم کرنے سے پہلے اس کی نظریاتی بنیاد متعین کر لینی چاہئے‘‘۔(۹)

ادبی تاریخ نگاری، ادب واقعات، سوانح نگاری، سیاسی تاریخ کے اہم واقعات کو مبسوط طور پر بیان کرنے کا نام ہے۔ اس سلسلے میں آسیہ نورین کا مقالہ ’’ادبی تاریخ نویسی‘‘ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ادبی تاریخ نویسی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:

’’اُردو ادب کا سرمایہ بے شمار وسعت کا حامل ہے۔ نظم و نثر کی متنوع اصناف و جہات ہیں۔ جب ان اصناف و جہات کا احاطہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، ادب کے بکھراؤ کو ایک جگہ سمیٹ دینے پر سوچا گیا تو ادبی تواریخ لکھی گئیں۔ ادبی تاریخ اپنے اندر تہذیب، ثقافت، ورثہ اور ادبی پہچان رکھتی

ہے۔ بہت سے مؤرخین نے ادب کے دریا کو کوزے میں سمویا ہے اور ادبی تواریخ قلمبند کی ہیں۔
ان میں انفرادی کاوشیں بھی شامل ہیں اور اجتماعی طور پر بھی کام کیا گیا ہے۔ سب نے اپنی ہمت و
قابلیت کے مطابق اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان تواریخ ادب سے طالبان علم، محققین،
ناقدین مستفید ہوتے ہیں''۔(۱۰)

آسیہ نورین نے بھی ادبی تاریخ میں ثقافت اور تہذیب کے بیان کو ادب کے ساتھ ملا کر لکھنے پر زور دیا ہے۔

۵۔ اُردو زبان و ادب کی تاریخ

اُردو زبان کی تاریخ نگاری ہمیشہ اہم موضوع رہا ہے۔ اُردو زبان و ادب کی تاریخ پر مؤرخین ادب نے ہمیشہ توجہ دی ہے اور ادب نظم و نثر میں تخلیق ہوا اور تاریخ کا حصہ بنا۔ ابتداً تذکروں کی صورت میں محفوظ ہوا اور بعد میں تاریخ کے اصولوں کو مدنظر رکھا گیا۔ بے شک اولاً کوئی اچھا معیار مرتب نہ ہو سکا مگر آہستہ آہستہ اُردو ادب کی تاریخ نگاری قواعد و ضوابط میں کی جانے لگی۔ آج اُردو ادب کی تاریخ کا ایک قابل قدر ذخیرہ موجود ہے۔

جب بھی کوئی زبان اپنے ابتدائی مرحلے میں ہوتی ہے سب سے پہلے اس میں نثر کی نسبت شاعری جنم لیتی ہے۔ دنیا کے تمام ادبوں کی ابتداء بھی نظم سے ہوئی۔ اس لئے یہ دنیا فطری عمل ہے جسے اُردو ادب نے بھی قبول کیا۔ رام بابو سکسینہ زبان و ادب کی ابتداء کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''زبان اُردو کی دیوی اپنے ساز طرب سے آراستہ و پیراستہ اس طرح نمودار ہوئی کہ ادب اُردو جو
دراصل فارسی کا متبع و ناقل ہے اس کو اپنے پیش رو کی تقلید، بہ نسبت نثر کے نظم میں زیادہ آسان اور
دلچسپ معلوم ہوئی کیونکہ نقل و ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں نثر میں اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا
کہ فی الحقیقت نظم میں ہوتا ہے''۔(۱۱)

اُردو شاعری کے مقابلے میں نثر کے نمونے زبان اُردو میں خال خال نظر آتے ہیں۔ سوائے چند کتب یا رسائل کے نثری سرمایہ کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ محمد عطا حسین تحسین خان کی ''نوطرزِ مرصع'' سے لے کر ''فضلی کی کربل کتھا'' خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی ''معراج العاشقین''، عین الدین گنج العلم کی نثر اور دیگر چند نثری کتب کے علاوہ مرزا غالب کے خطوط اور فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات تک باقاعدہ نثر کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد سرسید نثر میں اہمیت رکھتے ہیں عصر حاضر تک اُردو ادب تخلیق ہو کر تاریخ کا حصہ بن رہا ہے۔ ڈاکٹر سعدیہ طاہر اُردو زبان و ادب کی تاریخ کے بارے میں لکھتی ہیں:

''اُردو میں ادبی تاریخ نگاری کے حوالے کئی نام اور تاریخیں سامنے آتی ہیں جن میں محمد حسین آزاد کی
''آب حیات''، حکیم عبدالحی کی ''گل رعنا''، عبدالسلام ندوی کی ''شعر الہند''، محمد یحییٰ تنہا کی ''سیر

المصنفین''، شمس اللہ قادری کی ''اُردوئے قدیم''، رام بابو سکسینہ کی ''اُردو ادب کی تاریخ (انگریزی)''، احسن مارہروی کی ''تاریخ نثر اُردو''، حامد حسن قادری کی ''داستان تاریخ اُردو''، مخمور اکبرآبادی کی ''صحیفہ تاریخ اُردو''، محمد یحییٰ تنہا کی ''مراۃ الشعر''، عبدالقادر سروری کی ''اُردو ادب کی تاریخ''، ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو، جلد اول''، ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند''، ملک حسن اختر کی ''تاریخ ادب اُردو''، محمد صادق کی ''اُردو ادب کی تاریخ (انگریزی)''، ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اُردو''، (جلد اول، دوم وسوم)''، سیدہ جعفر اور گیان چند کی ''تاریخ اور اُردو ادب کی تاریخ از ڈاکٹر تبسم کاشمیری'' وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کئی مختصر تاریخیں بھی سامنے آئیں''۔(۱۲)

ڈاکٹر سعدیہ طاہر نے ادبی تاریخ لکھنے والوں کے بارے میں محققانہ انداز میں معلومات فراہم کی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادبی تاریخ نگاری پر خوب توجہ دی گئی ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل اپنے مضمون ادبی تاریخ نویسی: صورت حال اور تقاضے میں لکھتے ہیں:

''اس سے قطع نظر کہ ادب کیا ہے؟ تاریخ کسے کہتے ہیں؟ اور ایک ادبی تاریخ کیا ہوتی ہے۔ یہاں میری معروضات کا محور اس بنیادی نکتے پر مرتکز رہے گا کہ ادب کی تاریخ نویسی میں ہمارے ادبی مؤرخین کے پیش نظر ادب کو جانچنے کے لئے معیار کیا رہا ہے؟ پھر یہ بھی دیکھنا مقصود ہے کہ ان کے مقرر کردہ معیار کے مطابق اُردو میں معیاری ادب کی نوعیت کیا ہے؟ یہ امر منطقی اور ساتھ ہی متفقہ ہے کہ تاریخ اور تحقیق کے معیاری نتائج تحقیق اور تجزیے کے بغیر ممکن نہیں۔ خود تنقید بھی، اپنی نوعیت کے لحاظ سے، تحقیقی عمل کے بغیر شاید معیاری نہ ہو۔ ہمارے ہاں اُردو میں بھی تنقید و تحقیق ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور آغاز میں بھی یہ رشتہ دونوں ہی کے درمیان باہم استوار رہا ہے''۔(۱۳)

اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں تذکروں کی خاص اہمیت ہے کیونکہ تاریخ اُردو کا نکتہ آغاز یہی تذکرے ہیں۔ انیسویں صدی تک یہی تذکرے حوالہ تھے۔ اگرچہ ابتدائی تذکرے فارسی میں تھے مگر ان تذکروں کے موضوع اُردو شعراء ہی تھے۔ تذکروں میں اہم تذکرے مندرجہ ذیل ہیں۔

نمبر شمار	نام شاعر	نام تذکرہ	تاریخ تکمیل	زبان
۱۔	میر تقی میر	نکات الشعراء	۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء	فارسی
۲۔	فتح علی حسینی	تذکرہ ریختہ گویاں	۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء	فارسی
۳۔	قیام الدین قائم	مخزنِ نکات	۱۱۶۸ھ/۱۷۷۴ء	فارسی

۴۔	قدرت اللہ شوق	طبقات الشعراء	۱۱۸۸ھ/۷۴-۱۷۷۴ء	فارسی
۵۔	میر حسن	تذکرہ شعرائے اُردو	۱۱۹۱ھ/۷۸-۱۷۷۷ء	فارسی
۶۔	علی ابراہیم خلیل	گلزارِ ابراہیم	۱۱۹۸ھ/۸۴-۱۷۸۳ء	فارسی
۷۔	غلام ہمدانی مصحفی	تذکرہ ہندی گویاں	۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۸۳ء	فارسی (۱۴)

اُردو زبان وادب کی تاریخ میں دوسرا اہم قدم ''آب حیات'' ہے۔ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تذکروں کے بغیر ''آب حیات'' تاریخ اُردو ادب کی طرف پہلی جست ہے۔ اس سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں:

''ہوا کا رخ اور دریا کا بہاؤ نہ کسی کے اختیار میں ہے نہ کسی کو معلوم ہے کہ کدھر پھرے گا۔ اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب زبان کیا رنگ بدلے گی۔ ہم بھی جہاز کے ناخدا ہیں۔ توکل بخدا بیٹھے ہیں۔ زمانے کے انقلاب کو رنگِ چمن کی تبدیلی سمجھ کر دیکھتے ہیں''۔ (۱۵)

آب حیات کے بعد اُردو ادب کی تاریخ کی کتب سامنے آتی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔	اُردو کی تاریخ	چرنجی لال دھلوی	۱۸۸۴ء
۲۔	کاشف الحقائق	امداد امام اثر	۱۸۹۷ء
۳۔	New school of Urdu literature	سر عبد القادر	۱۸۹۸ء
۴۔	خمخانہ جاوید	لالہ سری رام	۱۹۰۶ء
۵۔	سیر المصنفین (پہلی جلد)	محمد یحییٰ تنہا	۱۹۱۴ء
۶۔	گلِ رعنا	عبد الحی	۱۹۲۰ء
۷۔	اُردو زبان کی تاریخ	جوئل واعظ لال	۱۹۲۰ء
۸۔	شعر الہند	عبد السلام ندوی	۱۹۲۵ء
۹۔	دکن میں اُردو	نصیر الدین ہاشمی	۱۹۲۵ء
۱۰۔	اُردوئے قدیم	شمس اللہ قادری	۱۹۲۵ء
۱۱۔	اربابِ نثر اُردو	سید محمد	۱۹۲۷ء
۱۲۔	تاریخ ادبِ اُردو	رام بابو سکسینہ	۱۹۲۷ء
۱۳۔	پنجاب میں اُردو	حافظ محمود شیرانی	۱۹۲۸ء
۱۴۔	اُردو شہ پارے	محی الدین قادری زور	۱۹۲۹ء
۱۵۔	A History of Urdu literature	گراہم بیلی	۱۹۲۹ء

۱۶۔ نمونہ منثورات	احسن مارہروی	۱۹۳۰ء	
۱۷۔ تاریخ ونثر اُردو	آغا محمد باقر	۱۹۳۰ء	
۱۸۔ مختصر تاریخ ادب اُردو	ڈاکٹر اعجاز حسین	۱۹۳۴ء	
۱۹۔ تاریخ زبان وادب اُردو	صغیر احمد جان	۱۹۳۸ء	
۲۰۔ تاریخ شعرالہند	احسن مارہروی	۱۹۳۸ء	
۲۱۔ داستانِ تاریخِ اُردو	حامد حسن قادری	۱۹۳۸ء	
۲۲۔ صحیفہ تاریخ اُردو	مخمور اکبرآبادی	۱۹۴۶ء	(۱۶)

ان کتب کی تفصیل دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اہل علم نے تاریخ ادب اُردو کو ایک فن کے طور پر لیا ہے اور ایک سنجیدہ کام کیا ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب کی تصنیف کی اصلی غرض یہ ہے کہ ادب اُردو کی تدریجی ترقی کا خاکہ زمانہ قدیم سے زمانہ حال تک کا مع مشہور شعراء اور نثر نگاروں کے مختصر حالات زندگی اور ان کے کلام اور تصانیف پر ایک مختصر تنقید کے کھینچا جائے۔ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ ایک طبقہ کے تعلقات دوسرے طبقہ کے ساتھ اور ایک فرد کے تعلقات دوسرے فرد کے ساتھ اس میں وضاحت سے بیان کئے جائیں اور نیز مختلف تحریکوں اور طرزوں کی ابتداء اور ترقی اور زوال کے اسباب بتائے جائیں اور اس دور کے تاریخی حالات وواقعات بھی نظرانداز نہ کئے جائیں جس میں وہ شعراء اور نثر نگار گزرے۔ یہ کتاب محض کسی زمانے کے واقعات کا ذخیرہ نہیں بلکہ ان خیالات وخصوصیات دکھانے کی اس میں پوری کوشش کی گئی ہے جن کا اثر اس زمانہ پر تھا۔ اس کی تصنیف میں میرے پیش نظر یہ رہا ہے کہ زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں کے مطابق بطور ٹکسٹ بک تیار کی جائے تا کہ انگریزی دان جماعت بھی اُردو ادب سے کما حقہ واقف ہو جائے''۔(۱۷)

اُردو ادب کی تاریخ کی اہمیت کے پیش نظر اس کی تدریس بہت اہم ہے۔ اس کی تدریس کس طرح ہونی چاہئے۔ سہیل احمد کہتے ہیں:

''اُردو زبان وادب کی تاریخ پاکستانی جامعات میں شعبہ ہائے اُردو کے نصاب کا لازمی حصہ ہے تاہم اس کی تدریس کے طریقے اور مواد دونوں ہی نہ صرف از کار رفتہ ہو چکے بلکہ یہ معروضیت سے بھی عاری ہیں اور علم کے بجائے تعصّبات اور یک رخی نظریات کی ترویج کا باعث ہیں۔ اس مقالے میں اُردو ادب کی تاریخ کے پرچے میں کیا پڑھایا جائے اور کیسے پڑھایا جائے۔ اس بحث کو سات مختلف نظری اور عملی نکات میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ سات نکات اس ترتیب سے ہیں: مقاصد

تدریس کا تعین، طلباء میں ادبی تاریخ سے رغبت پیدا کرنے کے ذرائع اور طریقے، ادبی تاریخیت کے درست تصور سے تعارف، لسانیات کے حوالے سے اُردو میں درکار وسعت، دکنی ادب کی تدریس کے خصوصی امتیازات، تاریخ اُردو ادب کی تدریس میں ادوار کو بنیاد بنانا اور اس کی اہمیت اور تاریخی ادوار کے درمیان ربط اور تکرار مطالب کی اہمیت پر نکتہ بنیادی بحث کے ساتھ ساتھ موجود طریقہ کی خامیوں اور بہتر طریقہ کار تجویز کرنے کے علاوہ مجوزہ طریقہ کار کے حق میں دلائل بھی فراہم کرتا ہے''۔(۱۸)

سہیل احمد کے اس اقتباس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ تاریخ نگاری کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ نگار کا مطالعہ وسیع ہو اور وہ تاریخیت کے درست تصور سے آگاہ ہو۔ ڈاکٹر سبینہ اویس نے بھی تواریخ نگاری پر بڑی جامع رائے دی ہے ملاحظہ ہو:

''تواریخ ادب میں کسی قوم کا طرزِ فکر، طرزِ احساس اور روح منعکس ہوتی ہے لہٰذا زندہ قوموں کی حیات اور بقاء تاریخ ادب میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کسی قوم کے موروثی علمی و ادبی ذخیروں میں اس قوم کے قومی خصائص بھی شامل ہوتے ہیں۔ اگر کسی قوم کو ان علمی و ادبی ذخیروں سے محروم کر دیا جائے تو قوم کی وحدت کا شیرازہ بکھرنے کا اندیشہ ہے اور قوم عقلی غلامی کا شکار ہو جائے گی۔ چناں چہ قومی تشخص کی تلاش کے لئے ادب کی تاریخ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ تاریخ ادب میں تخلیق کاروں کی شخصیت کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہے اور فن پاروں کے محاسن و معائب پر بھی نظر ڈالی جاتی ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو مؤرخِ ادب فن پارے کا جائزہ لیتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ تخلیق کار کے ادبی مقام و مرتبہ کا تعین بھی کرتا ہے۔ اُردو ادب کا مؤرخ ادب کے ماضی پر بھی نگاہ ڈالتا ہے۔ حال کو بھی بیان کرتا ہے اور مستقبل پر بھی گہری نظر رکھتا ہے۔ وہ ان تینوں کو لمحہء موجود میں بند کر کے شائقین ادب کے سامنے پیش کرتا ہے''۔(۱۹)

ادبی تاریخ نگاری کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ میں اقوام کی ثقافت، فکر، احساس اور زبان کی روایت موجود ہو۔

۶۔ ادبی تاریخ نویسی میں تسلسل کا فقدان

ادب کو ایک تسلسل میں دیکھنے کی ضرورت ہے لیکن ادبی تاریخ نویسی میں تسلسل کا فقدان ہے۔ تاریخ میں دیکھیں تو سکوت کے لمبے لمبے وقفے ملتے ہیں۔ جیسے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے بعد امیر خسرو اور پھر آپ کے عہد سے لے کر دکن کے ادب تک لاعلمی حائل ہے۔ اگر چہ اب سکوت کو ختم کرنے کا احساس جاگا ہے اور کام ہونے لگ گیا ہے لیکن دوسرے پہلو کو دیکھیں تو تسلسل یوں ٹوٹ جاتا ہے کہ تاریخ مختلف حصوں میں ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے جس میں اصناف کے حوالے

تحاریک کے حوالے سے یا ایسے ہی مؤرخین کی اپنی تقسیم کے حوالے سے تاریخِ ادب کو لکھا جاتا ہے جبکہ قاری کو ایک تسلسل اور روانی چاہیئے ہوتی ہے۔(۲۰) اگر تسلسل نہ ہو تو واقعات اور زبان وادب کا ارتقاء سمجھ میں نہیں آتا کہ زبان وادب نے کیا کیا کامیابیاں اور ناکامیاں دیکھیں ہیں۔

آج کا مؤرخ اس بات کے حق میں تو ہے کہ تاریخ میں جھول نہ آئے لیکن وہ اپنے آپ پر لاگو کرنے میں ناکام رہا ہے۔اس کی ناکامی کی اہم وجہ یہ ہے کہ ادبی مؤرخ کا غالب رجحان ادب برائے ادب کی طرف رہا ہے جبکہ تخلیقی ادب کا اکثر حصہ ادب برائے زندگی کا باسی ہے۔ جو مؤرخ ادب اور زندگی کو ساتھ لے کر چلے گا کامیاب رہے گا اگرچہ ہمارے ہاں اس بات کا فقدان بہت زیادہ ہے۔(۲۱)

ادبی مؤرخ کا غالب رجحان ادب برائے ادب کی طرف رہا ہے جب کہ تخلیقی ادب کا اکثر حصہ ادب برائے زندگی کا منظر پیش کرتا ہے جو مؤرخ ادب اور زندگی کو ساتھ لے کر چلتا ہے وہ تاریخ میں تسلسل اور ادب وتہذیب میں ربط پیدا کرتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''ادب کی تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں ہم زبان اور اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی و تہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں ادب میں سارے فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت، ایک اکائی بناتے ہیں اور تاریخ ادب ان سارے اثرات، روایات محرکات اور خیالات ور جحانات کا آئینہ ہوتی ہے۔'' (۲۲)

لیکن مؤرخین نے زیادہ توجہ محض ادب کی تاریخ بیان کرنے پر دی ہے اور ادب کو ادوار میں تقسیم کر کے دیکھا ہے جس کی وجہ سے ادبی تاریخ نویسی میں تسلسل کا فقدان پیدا ہو گیا ہے۔جب کہ کلچر، فکر اور تاریخ کے تخلیقی امتزاج سے ادب کی تاریخ مرتب ہونی چاہئے اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''تاریخ ادب میں جہاں کسی دور کے اپنے معیار اور نظام اقدار کی مدد سے ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہاں ساتھ ساتھ دائمی معیاروں سے بھی تخلیقات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔تاریخ ادب پڑھتے ہوئے یہ بات بھی محسوس ہونی چاہئے کہ جہاں مخصوص واقعات اور رجحانات شخصیتوں کو جنم دے رہے ہیں وہاں ادبی شخصیات بھی واقعات اور رجحانات کو جنم دے کر تاریخی دھارے کو نئی جہت دے رہی ہیں۔'' (۲۳)

تاریخ ادب میں صرف واقعات یا تخلیقی فن پاروں پر روشنی نہیں ڈالی جاتی بلکہ معیارات ادب اور غیر معمولی شخصیتوں کا ذکر بھی آتا ہے۔ ظفر الاحسن لاری کے مطابق:

> ''پچھلے دنوں اُردو ادب کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔اور اس میں شک نہیں کہ تنقیدی کارناموں میں ارتقائی تسلسل کے آثار واضح اور نمایاں ہیں۔تنقیدی معیار بھی ہر عہد و زمانہ کے ساتھ بدلتا رہتا

ہے۔ابتدائی تنقیدیں تذکروں کی شکل میں تھیں اوران کا معیار صنعتی اور شخصی تھا۔صنعتی کا لفظ میں اس معنی میں استعمال کرر ہاہوں کہ ادب کے کارنامے ادبی صنعت کے معیار سے جانے جاتے تھے۔ لفظوں کی بندش، ترکیبوں کی چستی اور قواعد عروض وقوانین کی پابندی ان امور پر نقاد کی نظر محدود تھی۔ یہ تنقیدیں بعض اوقات بہت ناگوار شکل اختیار کرلیتی تھیں۔'' (۲۴)

معیاری تاریخ نگاری کیا ہے اس پر ظفر الاحسن لاری نے خوب روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کے مطابق:

''اُردو کے ان تمام ادیبوں، عالموں، محققوں اور ماہر لسانیات کے خیالات ونظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ اُردو ایک مخلوط یا 'ملواں' زبان ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد شمالی ہندوستان میں معرض وجود میں آئی اوراس پر دہلی اوراس کے آس پاس کی بولیوں کے نمایاں اثرات پڑے ان میں سے مسعود حسین خان اُردو کی پیدائش کو'' دہلی اور نواح دہلی'' سے حافظ محمود خان شیرانی '' پنجاب'' ، سے سید سلیمان ندوی ''وادی سندھ سے''، اور سہیل بخاری ''مہاراشٹر'' سے منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح محمد حسین آزاد کے خیال کے مطابق '' اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے''۔گیان چند کے نظریے کے مطابق '' اُردو کی اصل کھڑی بولی ہے''۔اور مسعود حسین خان کی تحقیق کی رو سے '' قدیم اُردو کی تشکیل براہِ راست دوآبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیرِ اثر ہوئی ہے''۔علاوہ ازیں شوکت سبزواری اس نظریے کے حامل ہیں کہ اُردو کا سر چشمہ ''پالی'' ہے۔ان تمام عالموں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اُردو ایک خالص ہندوستانی زبان ہے۔اس کا ڈھانچا کینڈا یہیں کی بولیوں کے خمیر سے تیار ہوا ہے۔اس کے ذخیرہ الفاظ کا معتدبہ حصہ ہند آریائی ہے لیکن عربی اور فارسی کے بھی نمایاں اثرات پڑے ہیں۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے کیونکہ اس کی پیدائش کے دونوں ذمہ دار ہیں''۔(۲۵)

پروفیسر مرزا خلیل بیگ نے اُردو کے ارتقاء پر جامع روشنی ڈالی ہے۔عربی، فارسی کے اثرات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ خدمات کو سراہا ہے۔اسی سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے بھی اہم ہے:

''تذکروں میں سے سیرت وسوانح اور شاعری کے حسن وقبح کے بارے میں بعض کارآمد ارشاد ضرور مل جاتے ہیں لیکن صرف ان کی بنیاد پر اُردو ادب کی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ادب کی تاریخ میں اپنے عہد کے ثقافتی وتہذیبی آثار واحوال کے ساتھ پورے ادب یعنی نثر ونظم دونوں کی جملہ اصناف اوران کے اسالیب کو زیر بحث لانا ضروری ہے''۔(۲۶)

ڈاکٹر موصوف کے نزدیک ادب کی تاریخ میں ثقافت کے آثار جو نظم ونثر پر مرتب ہوئے ان کو پیش کرنا ضروری ہے

جبکہ ڈاکٹر خواجہ زکریا کہتے ہیں:

''ادبی مؤرخ کا کام ادب کا ارتقاء دکھانا ہے۔ یعنی قدیم ماضی سے لے کر جہاں سے اس کو اس زبان کے ادب کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں وہاں سے شروع کر کے اور اس کے بعد عہد بہ عہد گزرتے ہوئے موجودہ دور تک جو شکل ادب نے اختیار کی ہے عہد بہ عہد گزرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مختلف رجحانات آئیں گے۔ اس میں خیالات کی تبدیلی ہوگی اس میں عہد بہ عہد حالات بدل جائیں گے۔ سیاسی، سماجی پس منظر بدل جائے گا۔ جوں جوں وقت آگے گزرتا جاتا ہے نئے رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ مؤرخ اس کے مطابق دکھاتے جاتے ہیں اور عام طور پر دور بندی یعنی Chapter کی تقسیم اس اصول پر کی جائے گی۔ یعنی جہاں ہمیں تبدیلی کے واضح آثار نظر آتے ہیں وہاں ہم نیا دور یا نیا Chapter بنا دیتے ہیں۔ اگر ادب ایک ہی انداز میں چل رہا ہے تو پھر نیا دور بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ ادب کا فن یہ ہے کہ جہاں کوئی بڑی تبدیلی آتی ہے وہاں اس تبدیلی کا اظہار نئے دور یا نئے باب کی شکل میں کیا جاتا ہے''۔(۲۷)

ڈاکٹر خواجہ زکریا نے کیا خوب کہا ہے کہ تاریخ ادب اُردو کے لئے روایت سے رشتہ جوڑنا ضروری ہے ورنہ تاریخ معلق ہو جائے گی۔ کچھ مؤرخین واقعات کو زمان و مکان سے آزاد ہو کر بیان کرنے کے قائل ہیں حالانکہ ایسا ممکن نہیں کیونکہ ادب کو تہذیب و کلچر سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور تہذیب و کلچر زمانی شعور کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ واقعات اور حالات ہو سکتے ہیں کہ مختلف ادوار میں ایک جیسے ہوں لیکن زمانی شعور کے بغیر ارتقاء ادب سمجھ نہیں آ سکتا۔ جب تک اجتماعی بود و باش اور تہذیبی ماحول سمجھ نہیں آئے گا اس وقت تک ادبی تاریخ نویسی میں تسلسل کا فقدان رہے گا۔ تواریخ میں تسلسل کی عدم موجودگی پر بات کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ ہمارا ادب تسلسل سے عاری ہے بلکہ تاریخی کتب میں تسلسل موجود ہے۔ عہد بہ عہد تاریخی تصانیف کا خزانہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے ایک ہلکی کمی جو ہمیں کیا عام قاری کو بھی نظر آتی ہے اس کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی جائے گی تو آج کا مؤرخ بھی اس بات سے آگاہ ہو کر ادب کی تاریخ مرتب کرے گا۔

۷۔ ادبی تاریخ نویسی کا سنہری دور

بیسویں صدی کے پہلے دو عشروں کے بعد اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء کے نظریات پر مبنی ایک طویل بحث کا آغاز ہوا جو نشیب و فراز سے گزرتا ہوا علاقائی تعصب پر ختم ہوا۔ اس سلسلے میں زبان کو علاقائی تناظر میں دیکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ مختلف مؤرخین تاریخ زبان و ادب اُردو نے اپنے اپنے نکتہ ءنظر سے تاریخ ادب لکھنے کے سعی کی ہے اور ایک دوسرے سے اختلافِ رائے کا اظہار بھی کیا گیا ہے مگر یہی دور تاریخ ادب کا سنہری دور بھی ہے کیونکہ اختلاف رائے سے تحقیق کے نئے

دروازے وا ہوتے ہیں اور جستجو حق میں تیزی آتی ہے۔ سید سلیمان ندوی، حافظ محمود شیرانی، نصیرالدین ہاشمی اور دیگر نے اپنے اپنے انداز میں تاریخ ادب تحریر کی ہے۔ سید سلیمان ندوی نے اُردو کو سندھ میں دیکھا تو حافظ محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اُردو'' کا نعرہ لگایا۔ نصیرالدین ہاشمی نے ''دکن میں اُردو'' لکھی تو بنگال، سرحد، دہلی، لکھنؤ، میسور، گجرات اور دیگر بہت سے علاقوں کی نسبت سے مؤرخین نے کتب تحریر کیں اور اپنے اپنے نظریات کا ڈنکا بجا دیا۔ اس بحث میں معاصرانہ چشمک کے دروازے بھی کھلے اور علاقائی تعصب بھی نظر آیا۔ علاقائی بنیادوں پر اُردو زبان کے آغاز وارتقاء کا سلسلہ مولانا محمد حسین آزاد کی شہرہ آفاق تصنیف ''آبِ حیات'' سے شروع ہوا تھا۔ مولانا موصوف نے جب یہ کہا کہ اُردو زبان ''برج بھاشا'' سے نکلی ہے تو اس نظریے کی حمایت ومخالفت میں مختلف لسانی نظریات سامنے آئے جو علاقائی گروہ بندیوں کے تعصّبات کے آئینہ دار ہیں۔ ان گروہ بندیوں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اُردو زبان کے آغاز کی داستان طویل اور دلچسپ معلوم ہونے لگی اور قارئین کی اپنی طرف متوجہ کرنے میں بھی کامیاب ہوئی۔

علاقائی نظریات سے قطع نظر تاریخ کا قاری جب ہر تاریخی کتاب میں لسانی بنیادوں سے ملتا ہے تو اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے مؤرخین نے مختلف علاقوں کے حوالے سے جو نظریات پیش کئے ہیں انہیں کسی حد تک ماننا پڑے گا لیکن مجموعی تاریخ مرتب کرنے والے مؤرخین نے بھی قارئین کی بجائے ایک راستہ دکھانے کے بار بار علاقائی مؤرخین تک لے جاتے رہے جس کا نقصان یہ ہوا کہ اُردو زبان کی ابتداء کی بحث ایک دائرے میں گھومتی رہی آج جب مؤرخ قاری سنِ بلوغت کو پہنچا ہے تو وہ صحافتی ڈرامے کو بخوبی سمجھ چکا ہے اب ہمیں ابتدائی مباحث میں پڑنے کی بجائے اصل مآخذ تک پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ یعنی برصغیر میں جہاں جہاں بھی دو تہذیبیں، دو زبانیں، دو روایات اور عوام کے مختلف افکار وزبان کا تصادم ہوا اُردو زبان وجود میں آتی گئی۔ علاقائی ولسانی نظریات پیش کرنے والے مؤرخین اپنی جگہ لیکن اکثر اوقات ہم نے جس مؤرخ کو بھی دیکھا تو وہ زبان کی ابتداء کا سیدھا راستہ واضح کرنے سے قاصر رہا۔ ہم تاریخ ادب اُردو کے شہرۂ آفاق اور کامیاب مؤرخ کو بھی دیکھتے ہیں تو وہ بھی ان مسائل میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب کو لیجئے وہ کہتے ہیں اُردو زبان کا مولد ''پنجاب'' ہے۔ (۲۸) آگے چل کر لکھتے ہیں کہ یہ زبان اپنی ابتدائی شکل میں سندھ وملتان کے علاقے میں عربوں کے زیرِ اثر بننی شروع ہوئی۔ (۲۹) ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''اُردو کی جنم بھومی'' درحقیقت سرحد کا کوہستانی خطہ ہے۔ (۳۰) مندرجہ بالا تمام نظریات زبان اُردو کے آغاز وارتقاء کو پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اُردو'' کی حیثیت مسلّمہ ہے لیکن وہ بھی علاقائی نظریات کا حوالہ دیئے بغیر آگے نہ بڑھ سکے اس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ زبان کے علاقائی بنیادوں پر ابتداء کے تمام نظریات کسی نہ کسی حد تک درست ہیں اور ان کی مخالفت کرنے والے نقاد محض پسند و ناپسند کے جال میں الجھے ہوئے ہیں کیونکہ جمیل جالبی نے جو فیصلہ دیا ہے۔ وہ بھی اہمیت سے خالی نہیں، لکھتے ہیں:

''اس زبان کا ہر مولد ہر وہ علاقہ ہے جہاں مختلف الزبان لوگ آپس میں مل جل کر رہے ہیں۔ ملنے جلنے کا یہ عمل خواہ پنجاب وسندھ میں ہورہا ہو یا دہلی شمال ہندوستان، دکن اور گجرات میں، یہ زبان ہر زبان سے مل کر شیر وشکر ہو جاتی ہے''۔(۳۱)

زبان اُردو کس طرح پھیلی اور کہاں کہاں پھیلی۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے یعنی پورا نقشہ کھینچ دیا یہ دور تاریخ ادب اُردو کا سنہری دور ہے کیونکہ اُردو کی ارتقائی صورتِ حال سامنے آتی ہے۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹر جی کے مطابق اُردو کے باضابطہ زبان ہونے میں مغربی ہند کی بولیوں کا بڑا ہاتھ ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ مغربی ہندی کی بولیوں کے غیر محسوس ارتقاء کا نتیجہ تھی اور اسے ہندوستانی مسلمانوں کی پنجابی زبان سے تقویت ملی یہ دہلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھی یہ دہلی کے ترکی حکمرانوں کے دربار یا لشکر میں پیدا ہونے والی کوئی مصنوعی زبان نہیں تھی اس کا پہلا نام ہندی یا (ہندوی) تھا اس کا نام زبانِ اُردو یعنی لشکر کی زبان بہت بعد کی سترھویں صدی کے آخر کی پیداوار ہے۔(۳۲)

زبان کے آغاز وارتقاء کی مباحث میں ہمارے مؤرخین اس سلسلے میں اصل مآخذ تک پہنچنے میں اپنے اپنے طور پر کامیاب ضرور ہوئے ہیں بنیادی ماخذ کو جانے بغیر کوئی مؤرخ ایسا نہیں کر سکتا شاید یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں بعض جگہوں پر مؤرخین نے کمال احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ مخطوطے غیر مطبوعہ کتب دائیریاں اور دیگر مآخذ بھی تاریخی کتب کی زینت بنے ہوئے نمایاں دکھائی دے رہے ہیں۔

تاریخ ادب کی کتابیں، لغات، انتخابات، نصابی کتابیں ان کتابوں میں اور ان جیسی کتابوں میں قدیم و جدید شاعروں کا کلام اور نثر محفوظ ہیں چوں کہ یہ معلوم ہے کہ ایسی بیش تر کتابوں میں نقل در نقل سے کام لیا گیا ہے اور یہ بھی کہ عام طور پر ایسے مجموعوں میں بے احتیاطوں کی کارفرمائی پائی جاتی ہے اور ان کے مرتبین نے تحقیق اور تدوین کے اصولوں کی پابندی نہیں کی ہے اس لئے صحتِ انتساب اور صحتِ متن کی حد تک ان کو معتبر مآخذ کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی یوں بھی ایسی کتابوں کی حیثیت ثانوی مآخذ کی ہوا کرتی ہے۔(۳۳) اس سلسلے میں اصغر حسین خان نظر لدھیانوی اپنی کتاب ''مختصر تاریخ ادب اُردو'' میں تاریخ ادب اُردو کا پسِ منظر یوں بیان کرتے ہیں:

''اُردو پر تبصرے کے طور پر بعض کتابیں لکھی گئیں جن میں اُردو ادب کے تمام پہلو نمایاں نہ ہو سکے اس کی وجہ یہ تھی کہ مصنفین نے اُردو کے کسی ایک پہلو کو لے کر اس پر روشنی ڈال دی اور باقی پہلو نظر انداز کر دیئے مثلاً تذکرہ نگاروں نے صرف شعراء کے حالات اور ان کا نمونہ کلام پیش کر دیا اور بس۔ نثر لکھنے والوں کا تذکرہ تک نہ کیا۔ حالانکہ اُردو کے نثر نگاروں میں اچھے اچھے انشاء پرداز، مؤرخ، مفسر، افسانہ نگار، ناول نویس اور ڈرامہ نگار بھی موجود ہیں۔ نیچرل شاعری کے علمبردار بھی ہیں۔۔۔۔۔۔ادب اُردو پر تنقیدی اور تاریخی کتابوں میں رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اُردو کا ترجمہ

(اصل کتاب انگریزی میں ہے) شعرالہند اور گلِ رعنا وغیرہ موجود ہیں۔لیکن ان سب کتابوں میں بہت بڑی حد تک کمی ہے مثلاً رام بابو کی تاریخ ادب میں غزل گو، قصیدہ گو، مرثیہ گو، مثنوی گو، نعت گو شعراء کے حالات تو ہیں مگر نمونہ کلام کسی کا نہیں دیا گیا۔نیچرل اور سیاسی شاعری پر کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔ واسوخت، ریختی، رباعیات کا ذکر چند سطروں میں کر دیا گیا ہے اور نمونے کے طور پر ان اصناف سخن کا ایک بھی شعر نہیں دیا شعرالہند اور گلِ رعنا کا زور بھی صنفِ غزل ہی پر زیادہ صرف ہوا اور اُردو شاعری کی دیگر اصناف تشنہ رہ گئیں یہ حالات دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ اب اُردو کی ایک جامع لیکن مختصر تاریخ مرتب کی جائے۔(۳۴)

ڈاکٹر سلیم اختر تاریخ نویسی کے لئے تاریخ اور تنقید کو ضروری قرار دیتے وہ کہتے ہیں:

''تاریخ، تحقیق اور تنقید زخمی دلوں کے مرہم کا نام نہیں۔اس لئے اگر رائے کے اظہار سے چند نازک طبع ادیب ناخوش یا ناراض ہوتے ہیں تو عدم اظہار کے لئے یہ کوئی معقول جواز نہیں اسی طرح یہ جو نام نہاد مشرقی شرافت کا ایک معیار یہ ہے کہ بزرگوں کی خطا پکڑنا بذاتِ خود خطا ہے تو یہ بھی درست نہیں اگر حافظ محمودؔ شیرانی اور قاضی عبدالودودؔ نے آزادؔ اور شبلیؔ کی بزرگی کو پیشِ نظر رکھا ہوتا تو ان کی اہمیت کیا ہوتی؟ اگر ناقد، محقق یا مؤرخ کو اپنی رائے کی درستی کا یقین ہو تو پھر کسی کی پرواہ نہ کرے خواہ یہ رائے خود پسندی کے شیش محل کو چکنا چور ہی کیوں نہ کر دے۔دراصل رائے حال اور معاصرین کے مقابلہ میں مستقبل اور قارئین کے لئے ہوتی ہے اور اسی لئے قابلِ احترام! اس کی درستی یا نادرستی کا فوری فیصلہ ممکن نہیں ہوتا یہ وقت کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو کہ بڑا ظالم ہے اور تاریخ اس ظالم کا اہم ہتھیار''۔(۳۵)

ڈاکٹر سلیم اختر نے تاریخی نویسی کے لئے جو اصول متعین کیے ہیں وہی درحقیقت تاریخ نویسی کے سنہری دور میں نظر آتے ہیں یعنی ''پنجاب میں اُردو''، ''سندھ میں اُردو'' اور ''دکن میں اُردو''، تحقیق تنقید اور تاریخ کے لئے بنیادی مآخذ پر انحصار دکھائی دیتا ہے۔تاریخ درحقیقت اپنے سنہری دور میں اس وقت داخل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جب تخلیق اور تخلیق کاروں کی تحقیقی، تنقیدی اور تہذیبی پرکھ میں داخل ہوئی جب تاریخ محض ذاتی تاثرات اور پسند و ناپسند تک محدود رہے تو وہ نہ تو جامع ہو سکتی ہے اور نہ ہمیشہ کی زندگی پا سکتی ہے۔تاریخ نویسی میں ارتقاء اور دوامی شان تحقیق، تنقید اور سماجی شعور کے بیانیہ سے ہے اور یہی تاریخ نویسی کے سنہری دور کے آغاز کا باعث ہیں۔

۸۔ ادبی تاریخ نویسی کے مسائل

ادبی تاریخ نویسی میں جس چیز کو شدت سے محسوس کیا جا تا رہا ہے وہ مؤرخین کا اپنا نقطہ نظر ہے۔محض تاریخی واقعات

کوترتیب دے دینا ادبی تاریخ کے اصولوں پر عمل پیرا ہونا نہیں ہے بلکہ خاص اسلوب اور نقطہء نظر کا ہونا بھی ضروری ہے اس بات کومحسوس کرتے ہوئے پروفیسر رضی عابدی لکھتے ہیں:

''تاریخ کا کوئی نقطہء نظر ہونا بھی ضروری ہے۔ تاریخ محض واقعات کو اکٹھا کرنے کا نام نہیں بلکہ یہ واقعات کوکسی مرکزی خیال کے حوالہ سے ترتیب وتنظیم دینے کا علم ہے اُردو ادب کی ان تاریخوں سے ایسے کسی نقطہء نظر کا اظہار نہیں ہوتا مثلاً ایک تاریخ روایتی نقطہء نظر سے لکھی جاسکتی ہے اور دوسری انقلابی نقطہء نظر سے اور تیسری کسی نظریاتی حوالہ سے اُردو ادب کی موجودہ تاریخوں میں اوّل تو نقطہء نظر کو اہمیت ہی نہیں دی گئی اور جہاں اس انداز سے سوچا بھی گیا تو وہاں یہ سب رجحانات گڈ مڈ ہوتے نظر آتے ہیں۔'' (۳۶)

جو مؤرخین ادب کا تاریخی شعور رکھتے ہیں وہ ادبی تاریخ نویسی کے ساتھ صحیح انصاف کرتے ہیں۔ ادب کے تاریخی و تنقیدی شعور کے حامل افراد ایک تو اپنا نقطہء نظر رکھتے ہیں دوسرا یہ کہ وہ اس شعور کی وضاحت قارئین تک بھی پہنچانے میں کارفرما رہتے ہیں ہماری ادبی تاریخ میں یہ کام ہنوز مکمل ہے اسے مکمل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

ادبی تاریخ نویسی کے اصول میں اور ان اصولوں سے انحراف ادبی تاریخ نویسی کے مسائل بن جاتے ہیں۔ مآخذ سے واقعات کومعتبر بنانا تاریخ نویسی کے لئے ضروری ہے۔ مگر بنیادی مآخذ تک رسائی کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ اعلیٰ اور بنیادی کتب کی فراہمی بہت مشکل ہوگئی ہے ادب کا ذوق ناپید ہوتا جارہا ہے۔ اس لئے بنیادی اور قانونی مآخذ تک رسائی مشکل ہوگئی ہے۔ ہر لکھنے والے کا نیا اسلوب ہوتا ہے۔ مگر تاریخ نویسی کا اپنا ایک الگ اسلوب ہے۔ تاریخ نویسی کے لئے سادہ اسلوب ہونا چاہئے۔ تاکہ رنگینی اسلوب کی وجہ سے تاریخ فہمی کوئی مشکل نہ ہو۔ مگر افسوس کہ بہت سے محقق تاریخی اسلوب کی اہمیت سے ناواقف ہوتے ہیں ان کا اسلوب یا تو شاعرانہ ہوتا ہے یا علمی، مثلاً ڈاکٹر سلیم اختر کے اسلوب کو ہی دیکھ لیں۔ شاعرانہ اور عالمانہ ہے۔ درحقیقت یہ ضروری ہے کہ تاریخ لکھتے ہوئے اپنے شخصی اسلوب سے باہر ہوکر لکھا جائے کیونکہ تاریخ وضاحت چاہتی ہے۔ تاریخ کے لیے ایک مسئلہ شعور خصوصاً تنقیدی شعور کی کمی بھی ہے اگر تنقیدی شعور نہ ہو تو تاریخ میں بے شمار خلا رہ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مؤرخ کے تنقیدی شعور کو اس کی اہم خوبی کہا ہے جو مؤرخ تنقیدی شعور نہیں رکھتا۔ ڈاکٹر موصوف اسے سرے سے مؤرخ ہی نہیں مانتے۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ادبی مؤرخ کو محقق سے زیادہ نقاد ہونا چاہیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ادبی مؤرخ کی تنقید کمزور ہے تو وہ کبھی اچھی تاریخ نہ لکھ سکے گا ادبی تاریخ میں جو چیز بہت اہم ہے وہ کسی عہد، کسی ادیب، کسی نظریے یا رجحان کا تنقیدی محاکمہ ہے۔ یہ تنقید ہی ہے جو کسی بھی مصنف کے ادبی مقام کا تعین کرتی ہے۔ تنقید ہی کسی فن پارے کے محاسن، معائب اور تجزیئے کا فریضہ ادا کرتی ہے اگر

تاریخ ادب میں ان پہلوؤں پر توجہ نہ دی جائے یا اچھے تجزیئے پیش نہ کرسکیں تو پھر ادبی تاریخ کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا''۔(۳۷)

ادبی تاریخ نویسی کے لئے معلومات تک رسائی نہ ہونا بھی ایک مسئلہ ہے اور جانب داری بھی ایک مسئلہ ہے تاریخ لکھتے ہوئے وہ تخلیق کار تو تاریخ میں حصہ پا لیتے ہیں جو بڑے ادبی مراکز سے وابستہ ہوتے ہیں۔لیکن وہ تخلیق کار تاریخ کے اوراق میں ایک سطر کے بھی مستحق نہیں ٹھہرتے جو مضافات میں رہتے ہیں یا ادبی مراکز سے دور ہوتے ہیں اسی طرح تاریخ نویسی میں جانب داری بھی ایک مسئلہ بن کر سامنے آیا ہے۔مختلف زاویہ نظر رکھنے والے بہت سے اعلیٰ پائے کے تخلیق کار تاریخ میں بار نہیں پا سکتے جس کی وجہ سے اعلیٰ تاریخ سامنے نہیں آسکتی۔تاریخ درحقیقت ہمیشہ رہنے والی چیز ہے اور مستقبل میں رہنمائی کا ذریعہ بھی۔مگر افسوس کہ تاریخ نویسی میں بھی مختلف نکتہ ءنظر کے دبستان بن جاتے ہیں۔تاریخ نویسی تو مصنف کے فاصلے کی طرح ہونی چاہیے۔تاریخ نویسی میں جامعیت کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے کچھ تاریخ نویس محض شاعری کی تاریخ بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور نثر کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے جبکہ ادب میں نظم و نثر اور تحقیق و تنقید شامل ہے۔تخلیقی ادب اور تنقیدی ادب دونوں تاریخ کا موضوع ہیں البتہ تاریخ نویسی میں الگ الگ موضوعات کے تحت تاریخ لکھ دی جائے تو پھر کوئی ہرج نہیں ہے۔مگر تاریخ ادب اُردو کے عنوان کے تحت صرف ادب کے ایک حصے کو موضوع بنایا جائے تو غلط ہے۔دیکھا گیا ہے کہ تاریخ نویسی میں تاریخ نویس پہلے والوں کی نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔مگر ایسا نہیں کرنا چاہیے تاریخ نویسی میں وقت کے ساتھ اضافے بھی ہونے چاہیں گویا پہلے سے لکھی ہوئی چیزیں لکھ دینے سے تاریخ نویسی کا حق ادا نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے آج بھی تاریخ کی چند ایک کتب کو چھوڑ کر سب میں پرانا مواد ملتا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''تاریخ ادب ادارے لکھتے ہیں جن کے پاس سرمایہ ہوتا ہے جنہیں ہر قسم کی سہولت میسر ہوتی ہے جن کے پاس اپنا کتب خانہ ہوتا ہے دوسرے کتب خانوں سے وہ قلمی و مطبوعہ کتب مستعار لے سکتے ہیں مددگاروں کی ایک جماعت اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہے۔وہاں صدر ہوتے ہیں۔سیکریٹری ہوتے ہیں، مشاہیر علم و ادب کام کرتے ہیں اور کہیں برسوں میں جا کر یہ منصوبہ پورا ہوتا ہے۔لیکن مجھے اس قسم کی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔دن بھر گردشِ روزگار اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے مشقت کی چکی نہ کوئی مددگار ساتھی۔ایک ایک کتاب کے لئے مختلف کتب خانوں کے چکر کاٹنے پڑے۔آتشی شیشے کی مدد سے مخطوطات پڑھ پڑھ کر آنکھوں پر موٹا چشمہ چڑھ گیا۔بہرحال یہ کام، جیسا کچھ ہے، ایک فرد کا کام ہے جس نے اسے اپنی اُپج سے کیا ہے۔اس میں کسی کی فرمائش، مدد یا سرپرستی شامل نہیں ہے۔میرے فنون اور علم و ادب کے عشق نے ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بے نیاز کر کے، یہ جوئے شیر مجھ سے ہنسی خوشی کھدوائی ہے۔یہ کام کر کے میں نے خوشیاں حاصل کی ہیں اور یہ ہی میرا صلہ ہے۔یہ تاریخ ادب میری اپنی روح کا سفر ہے جسے میں نے برِعظیم کی تہذیبی

روح میں تلاش کیا ہے۔ سفر جاری ہے اور میری منزل ابھی دور ہے۔'' (۳۸)

ادبی تاریخ نویسی کی اب تک جتنی بھی کتب شائع ہوئی ہیں ان میں تمام مؤرخین شاعری کی حد تک متفق ہیں۔ کلاسیکی شاعری اور اس سے پہلے تمام نے بالترتیب جنوبی ہند، شمالی ہند لکھنوی دبستان اور غالبؔ و ذوق کے دور تک تقریباً متفقہ فیصلے دیئے ہیں جبکہ نثر میں تمام مؤرخین اپنے نظریات پیش کرتے ہیں۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو نظم و نثر کی تاریخ جو اب تک لکھی گئی اس میں کہیں نہ کہیں جھول نظر آتا ہے۔ مثلاً سینکڑوں شعراء جن کا تعلق سندھ، ملتان، بنگال اور ہندوستان کے باقی علاقوں سے تھا کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ دکن، دہلی اور لکھنؤ کے کتب خانوں سے تو مؤرخین کو مواد مل گیا اور انہوں نے اسے دستاویز کی حیثیت دے دی لیکن دور دراز علاقوں کے علاقائی شعراء تک کسی کا ہاتھ نہ پہنچ سکا جس سے ادب کی تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہوتی رہی۔ شاعری کے آغاز سے لے کر میرؔ و سوداؔ کے دور تک پورے ہندوستان میں صوفیاء نے بھی شاعری کے ارتقاء میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ ان کی تاریخ پر صرف مولوی عبدالحق کے علاوہ کسی بھی مؤرخ نے قلم نہیں اٹھایا۔ خواجہ غلام فرید، مخدوم جہانیاں، شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست اور دیگر پنجابی و سندھی شعراء نے اُردو زبان میں بھی شاعری کی ہے لیکن انہوں نے باقاعدہ موضوع کم کم لوگوں کو بنایا ہے۔ اس لئے شاعری کی تاریخ میں کچھ نہ کچھ تشنگی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس میدان کی طرف کسی مؤرخ کا آنا ہو اور وہ اسے سرسبز بھی کر دے لیکن ایسا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔

شاعری کی تاریخ نثر کے مقابلے میں کسی حد تک جان دار ہے لیکن ابھی اس میں کام ہونا باقی ہے۔ جہاں تک نثر کی تاریخ کا تعلق ہے تو اس میں مؤرخین نے فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی نثر پر مختلف نظریات و دلائل دیئے ہیں۔ نثر کی ابتداء کے حوالے سے تمام مؤرخین کا شدید اختلاف ہے مثلاً کسی نے محمد اشرف جہاں گیری سمنانی کو اولین نثر نگار کہا ہے تو کسی نے خواجہ بندہ نواز کو اولیت دی ہے اس کے علاوہ شیخ عین الدین گنج العلم، شیخ عبدالقادر جیلانی، شمس العشاق شاہ میراں جی، شاہ برہان الدین جانم، سب رس، میراں یعقوب، سید شاہ محمد قادر، یاور سید شاہ میر وغیرہ کو بھی اُردو نثر کے ابتدائی نثر نگاروں میں شمار کیا گیا ہے فضلی کی ''دہ مجلس'' اور عطا حسین خان تحسین کی ''نو طرزِ مرصع'' کو بھی ایک عرصہ تک اُردو کی پہلی تصنیف قرار دیا جاتا رہا۔ نثر کی ارتقائی تاریخ کوئی مؤرخ ٹھیک طریقے سے بیان نہیں کر سکا۔ انہی وجوہات کی بنا پر ہماری تاریخ گومگو رہی ہے رام بابو سکسینہ نے اس ضمن میں مولوی عبدالحق اور حکیم سید شمس اللہ قادری کی کوششوں کو بہت سراہا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''محققین زبان اور ریسرچ اسکالروں نے بحرِ تحقیق میں غوطہ زنی کر کے دکن کی قدیم نثر کے بہت سے نمونے دستیاب کئے ہیں۔ یہ کاروائی ہنوز جاری ہے اور امید کی جاتی ہے کہ بہت عرصہ نہیں گزرے گا کہ کافی مواد ایک مکمل اور معتبر تاریخ نثر اُردو میں تیاری کے لئے فراہم ہو جائے گا۔ ایسے محققین ہمارے نزدیک مولوی عبدالحق اور حکم سید شمس اللہ قادری ہیں جن کی کوششیں اس بارے میں بہت تحسین اور آفرین کے لائق ہیں جہاں تک کہ قدیم ترین نمونے اس وقت تک دریافت ہوئے

ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ نثر اُردو کی تاریخ آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔''(۳۹)

ہمارے بیشتر مؤرخین اور محققین ادب نے اُردو کی زمانی تقسیم میں حتمی سنین سے انحراف کیا ہے اس کے علاوہ انہوں نے روایت کی تشکیل کا ردِعمل بھی پیش نہیں کیا جس سے زمانی ترتیب اور روایت کا سفر ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے اس کے علاوہ قلم کاروں نے بیش تر اوقات تاریخ کو تحقیق، تنقید، اور سیرت وغیرہ میں ضم کر دیا جس سے ادبی تاریخ صحیح اصولوں پر متعین نہ ہوسکی اس نکتے کی نشان دہی رضی عابدی نے یوں کی ہے:

''اُردو میں یوں تو درجنوں تذکرے اور تاریخیں موجود ہیں لیکن ان سے تاریخ ادب کے تقاضے پورے نہیں ہوتے ان میں ادب کی تاریخ کے مقاصد اور ان کی حدود واضح نہیں ہوتیں۔ ایسا لگتا ہے یہ تاریخیں کسی طے شدہ منصوبہ کے بغیر لکھی گئی ہیں۔ ادب کی تاریخ نہ تو عام قسم کی تاریخ ہوتی ہے جیسے مملکتوں اور حکومتوں کی تاریخ نہ ہی یہ سوشل ہسٹری ہوتی ہے ادب کی تاریخ ادبی تحقیق سے بھی مختلف اور تنقید سے بھی مختلف ایک ایسا مطالعہ ہے جو نہ تو سیرت نگاری ہے اور نہ داستاں طرازی۔ اُردو ادب میں اب تک جو تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ ان پر زیادہ تر تذکروں کا انداز حاوی ہے جو ایک طرح سوانحی قصیدہ نگاری ہے اور جس میں کسی مصنف کے ادبی کارناموں اور ذاتی محاسن کی بات کی جاتی ہے''۔(۴۰)

ادبی تاریخ نویسی کے لئے لگن کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے جب ایک تاریخ نویس لگن اور جستجو سے دور ہوتا ہے تو وہ نہ تو حقائق تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے اور نہ جامعیت پیدا کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سے تخلیق کار، محقق اور نقاد اس تاریخ کا حصہ نہیں بن پاتے تاریخ نویسی کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ نویس تاریخ نویسی کے لئے جنوں رکھتا ہو تعصب کی عینک سے نہ دیکھتا ہو اور بے رحم حقیقت نگار ہو یہ ایک اہم مسئلہ ہے اگر یہ حل نہ ہو تو اعلیٰ تاریخ وجود میں نہیں آسکتی۔

۹۔ مؤرخینِ ادب کی خدمات

مؤرخین ادب کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش نہ کرنا بھی ناانصافی ہوگا۔ جب محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' سے اُردو زبان کی ابتداء و ارتقاء کی سرگزشت کو رقم کرنے کا باقاعدہ آغاز کیا تو ان کے بعد تاریخ نگاری کی طرف توجہ دینے کی طرح پڑی جو وقت کے ساتھ ساتھ بہت تیز ہوگئی۔ تاہم ان کی کتاب ''آبِ حیات'' مستقبل میں تصنیف ہونے والی کتب تاریخ کے لئے رہ نمائی کا باعث بنی اس لئے محمد حسین آزاد کا تاریخ نویسی میں اولیت کا درجہ بنتا ہے لسانی بحث پر نظر ڈالیں تو وہ لسانی مفکر کے طور پر سامنے آتے ہیں یہ درست ہے کہ ان کی تاریخ نویسی میں وہ شان اور مقام نہیں ہے جو تحقیق اور تنقید سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اُردو کی تاریخ میں رام بابو سکسینہ، محمد صادق اور گراہم بیلی کا نام اس لئے نمایاں ہے کہ انہوں نے اُردو

کی تاریخ کوانگریزی میں لکھا یہ بات الگ ہے کہ اُردو کی تاریخ اُردو میں لکھی جائے مگران کی کوشش سے انگریزی دان طبقہ بھی اُردو سے واقف ہوا۔

ڈاکٹر رالف رسل نے متذکرہ بالا تواریخ کی شدید مخالفت کی ہے اور تحقیقی حوالوں سے ان کے سارے بیانات کو رد کر دیا ہے۔ان کا سب سے پہلا اور بڑا اعتراض یہ ہے کہ جس زبان وادب کی تاریخ لکھنا مقصود ہوتو کیا ضروری نہیں کہ اسی زبان میں لکھی جائے،اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جس زبان کی تاریخ لکھی جائے گی اسے وہی زبان بولنے والے بخوبی سمجھیں گے بصورت دیگر ہر اُردو بولنے والا انگریزی نہ بول سکتا ہے اور نہ ہی اپنے ادب کی تاریخ کسی اور زبان میں پڑھے گا وہ متذکرہ بالا تینوں تواریخ اوران کے مصنفین کوشدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''انگریزی میں اُردو ادب کی تاریخ کیسے لکھنی چاہیے۔زبردستی مؤرخ بننے کے خواہش مند لوگوں سے جن کا تعلق اُردو بولنے والوں سے ہے میں یہ کہوں گا کہ انہیں اس بات کا اندازہ ہونا چاہیے کہ کیا وہ اس طرح کی تاریخ لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں میں ان سے صرف اتنا کہوں گا کہ اگر وہ اُردو ادب کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تو براہِ مہربانی اس کی تاریخ لکھنے کے حوالے سے خود کو مشکل میں نہ ڈالیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔اگر آپ پھر بھی اس نقطہ ءنظر سے لکھنا چاہتے ہیں تو کلیم الدین احمد کی طرح اُردو میں ان لوگوں کیلئے لکھیے جو اُردو پڑھ سکتے ہیں اس طرح آپ غالباً لوگوں کو اُردو ادب کے بارے میں ان کے غلط اندازوں پر نظر ثانی کے لئے قائل کر سکتے ہیں۔''(۴۱)

ڈاکٹر معین الدین عقیل نے جدید علوم اور تازہ تصورات کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے رام بابو سکسینہ کی تصنیف کو تاریخ ادب کی مکمل ابتدائی تصنیف کیا ہے۔انہوں نے رالف رسل کے نظریے کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ کو محض شاعری یا بعض دیگر تصانیف (مثلاً ''اُردوئے قدیم''، ''نمونہ منثورات''، ''داستانِ تاریخ اُردو'') کی طرح محض نثر تک مخصوص نہیں رکھا بلکہ نثر اور نظم کو متوازی طور پر ساتھ لے کر چلے ہیں کیونکہ بعد کے مؤرخین نے ایک میدان میں تفصیل اور دوسرے پر سرسری نگاہ ڈالی ہے اس لئے ادبی تاریخ نگاری کی جامعیت اور معیار کا نعرہ لگانے والے بھی اس پر عمل کرنے سے قاصر رہے ہیں۔(۴۲)

ڈاکٹر گیان چند نے اپنی تصنیف ''اُردو کی ادبی تاریخیں'' میں پیش تر تواریخ کا مفصل جائزہ پیش کیا ہے۔انہوں نے اہم اہم کتب کا تجزیہ کیا ہے لیکن تنقید سے کام لیتے ہوئے تاریخی کتب کو نا کافی اور تسلسل سے عاری قرار دیا ہے۔ان کی رائے کسی حد تک تو درست ہے کہ تواریخ ادبیات اُردو کو مؤرخین نے جامع منصوبہ بندی کے بغیر ہی مرتب کیا ہے وہ اجتماعیت کے قائل ہیں۔لیکن یہاں یہ تو ہر مؤرخ کا اپنا نقطہ ءنظر ہے جس سے وہ رضا مند نہیں ہیں۔انہوں نے ادبی تاریخ نویسی کے لیے اداروں کا نہ ہونا جیسے مسائل کی نشان دہی بھی کی ہے مؤرخین کی لگن اور محنت کی اصل روح بھی بیان کی ہے ایک اہم پہلو کی

نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اجتماعی تحقیق میں پہلی منزل یہ ہے کہ ادبی تاریخ کے لئے مناسب مدیر اور مناسب مجلسِ ادارت تلاش کی جائے۔ اب تک کی ''پنچایتی'' تاریخوں کو دیکھا جائے تو کسی بھی ادارے کی کارفرمائی نہیں آتی اور شاید کسی کو بھی مناسب مدیر نہیں مل سکا۔ دوسری قباحت یہ ہے کہ ماہر مضمون نگاروں کے سپرد موضوع تو کر دیئے جائیں لیکن اُردو میں لگن سے جم کر کام کرنے والے کم ہیں۔ یہاں نوابی صحبتوں، مشاعروں، مجلس آرائی، اور بیٹھک بازی کی روایات کی وجہ سے سنجیدہ کام کو تکمیل تک پہنچانا مشکل ہوجاتا ہے''۔(۴۳)

ڈاکٹر گیان چند کی رائے کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے مؤرخین اپنی کتاب سے سرسری گزر گئے ہیں۔ ذاتی محنت اور لگن کی پیاس ہمیں متعدد کتب میں نظر آتی ہے اجتماعیت کا طریقہ یہ ہے کہ بجائے تاریخ مرتب کرنے کے لئے بڑے بڑے مؤرخین کو مل کر یہ کارنامہ سرانجام دینا چاہیے اگر صرف مضامین پر ہی اکتفا کیا جاتا رہا تو تاریخ معدوم ہوجائے گی اور روایتی انداز ہمارے گلے پڑ جائے گا۔ تاریخ کی مختلف جلدیں متعین کر کے مؤرخین کے سپرد کر دی جائیں تو شاید یہ کام آسان ہوجائے۔ اُردو ادب کی تاریخ اب اتنی وسیع اور قدیم ہوچکی ہے کہ فردِ واحد کے ہاتھ میں بمشکل ہی آئے گی۔ ادارے اس طرف توجہ نہیں دے رہے۔ پاکستان کے مقتدرہ قومی زبان کی اولیات غالباً دفتری اور نظم و نسق کی زبان کی ہیں۔ ان حالات میں ساری امیدیں اس فرہاد جمیل جالبی کی تاریخ پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ کس طرح بقیہ جلدیں بھی اسی معیار کے ساتھ مکمل کر دیں ڈاکٹر موصوف جس ثابت قدمی سے چل رہے ہیں تو اس سے لگتا ہے کہ بیسویں صدی تک کی تاریخ مرتب کر کے ہی چھوڑیں گے۔(۴۴)

ادبی تاریخ نویسی کی بحث میں تاریخ کی تدریس کو بھی خارج از بحث نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک تواریخِ ادبیات اُردو کا تعلق ہے تو وہ کتب اور اساتذہ کے ذریعے قارئین اور طلباء تک پہنچتی رہی ہیں۔ اساتذہ نے زیادہ تر تاریخی کتب کا سہارا لیا اس لئے آج تک تاریخ کا نصاب محض واقعات، شاعروں اور ادیبوں کے حالات کی عکاسی تک محدود رہا کسی نے بھی اس کو تاریخ اور تہذیب کے رشتوں میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ حال آنکہ وقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادب کا تجزیہ بھی ضروری تھا جو صرف زبانی رہا اور ریکارڈ تک نہ پہنچ سکا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی شاید زبان کی تاریخ مل جاتی لیکن کسی نے اس کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ڈاکٹر محمد حسن اپنی کتاب ''تاریخ ادب کی تدریس'' میں لکھتے ہیں:

''یہ زبان جو مختلف زمانوں میں مختلف ناموں سے یاد کی جاتی رہی ہے ''کبھی اُردو، کبھی ہندی، کبھی مغربی ہندی، کبھی کھڑی بولی، کبھی ہندوی کبھی ہندوستانی'' کہی جاتی رہی ہے آخر کس طرح وجود میں آئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اکثر تاریخِ ادب کی کتابیں اُردو زبان کا آغاز مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے کرتی ہیں یہ بات ادھوری ہے مسلمان کا لفظ صرف مذہب کو ظاہر کرتا ہے زبان اور تہذیب

کو ظاہر نہیں کرتا۔ مسلمان تو انڈونیشیا میں بھی آباد ہیں مگر ان کی زبان نہ عربی ہے اور نہ فارسی اور اسی
طرح ترک بھی مسلمان ہیں اور ایرانی بھی مگر ایک کی زبان ترکی ہے تو دوسرے کی فارسی اور دونوں کی
تہذیبوں میں بھی فرق ہے۔ یہی صورت خود ہندوستان میں بھی ہے۔ کشمیر اور کیرالا کے مسلمانوں کی
تہذیب اور زبان دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں''۔(۴۵)

ادبی تاریخ نویسی اس وقت بہت بڑے المیے سے گزرتی ہے جب قلمی نسخوں کی عدم دستیابی یا ان سے عدم توجہی برتی گئی۔ ہندوستان کے سینکڑوں افراد کے پاس قلمی نسخوں کا بہت بڑا ذخیرہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں موجود تھا ان کی طرف مؤرخین نے خیر کیا توجہ کی۔ ہمارے دبستانوں نے بھی چشم پوشی کی۔ ہر کوئی ذاتی مفاد کے لیے لڑتا رہا جس سے ہماری تاریخ میں جھول آیا۔ آج بھی ملک کے نمایاں کتب خانوں اور خصوصاً ذاتی کتب خانوں میں کثیر تعداد میں غیر مطبوعہ مواد اور قلمی نسخے ملنے کی توقع کی جاسکتی ہے لیکن افسوس کہ ''لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے'' والا حساب ہے اس نکتے کو علی جواد زیدی نے یوں واضح کیا ہے۔

''ذاتی کتب خانوں کے علاوہ ملک کے مختلف کتب خانوں میں بھی ابھی کافی غیر مطبوعہ سرمایہ موجود
ہے جو تاریخی اعتبار سے اہم ہے اور جس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ کوئی معقول سوشل
تاریخ نہیں لکھی گئی ہے جس سے اُردو کے آغاز، ارتقاء، اور پھیلاؤ کے بارے میں اور خیالات و
رجحانات کی تبدیلیوں کے بارے میں معلومات ہو سکیں۔ کوئی ادبی مؤرخ ان سے نگاہیں پھیر نہیں
سکتا۔ خود اُردو ادب کے دامن میں سوشل تاریخ کا جو مواد موجود ہے اس پر بھی معمولی سی توجہ کی گئی
ہے''۔(۴۶)

غیر مطبوعہ مواد اور قلمی نسخوں کے علاوہ جو مواد ہمارے رسائل و جرائد میں بکھرا پڑا ہے ان کی تدوین کی طرف بھی کسی نے توجہ نہیں دی گزشتہ دو صدیوں کے رسائل و جرائد نے جہاں تاریخ ادب کی عکاسی کی وہاں خود بھی تاریخ کا حصہ بنے لیکن ان مضامین کی تدوین کا کام بھی ہنوز باقی ہے۔ اگر اس کی فوری تدوین نہ کی گئی تو جو مواد بچ گیا وہ بھی ضائع ہو جائے گا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب تک ادبی تواریخ میں غیر مطبوعہ مواد اور ادبِ عالیہ کے رسائل پر توجہ نہیں دی گئی۔ اس کام کی تکمیل بھی ادبی مؤرخین کا اہم فریضہ ہے۔ مؤرخین کی تاریخ نویسی میں نمایاں خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مؤرخ نے اپنی اپنی کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے البتہ تشنگی ہمیشہ قائم رہی ہے۔ تاریخ ادب اُردو میں ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے چنانچہ قلمی نسخوں کی تلاش کرنی چاہیے جو کتب خانوں اور اہل علم کے ذاتی کتب خانوں میں مل سکتے ہیں اس لئے مؤرخ ادب کی لگن اور صاحب اقتدار کی طرف توجہ کی ضرورت ہے ادبی رسائل اور جرائد کا بھی جائزہ لینا چاہیے اور تواریخ ادب کے لئے مواد تلاش کرنا چاہیئے۔ بہر حال مؤرخین ادب نے اب تک جتنا بھی کام کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے ان کی کاوشوں کی وجہ سے آج تواریخ ادب اُردو کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اس بحث کا مقصد یہ نہیں کہ اس ضمن میں کام بالکل نہیں ہوا بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو جائزہ

ادبی تاریخ اوراس کا مقام و مرتبہ ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہو سکا۔ یہ کام جب تک وسیع پیمانے اور جامع حکمتِ عملی سے نہیں ہوگا ادبی تاریخ ہمہ گیریت کی منزل کو نہیں چھو سکے گی۔

۱۰۔ مؤرخ کے اوصاف

مؤرخ کے اوصاف میں لگن، جستجو، فن تاریخ نویسی سے واقفیت اور غیر جانب داری اور سادہ اسلوب ہے۔ ایک محقق میں تاریخ لکھنے کی لگن ہی نہیں تو پھر مفہوم تکمیل پذیر نہیں ہوسکتا چنانچہ لگن نہیں ہے تو اس کوچے میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہئے۔ تبسم کاشمیری نے اپنی کتاب ''اُردو ادب کی تاریخ'' کو انیس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پیش لفظ میں ڈاکٹر صاحب نے مختلف ادبی تاریخوں اور تاریخ دانوں کے طریقہ کار پر گفتگو کی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادبی تاریخ کو کن تناظر میں جانچتے ہیں اور ان کی نظر میں ایک اچھے مؤرخ کی کون کون سی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری:

> ''ادبِ مؤرخ کا بنیادی کام ادبی ذخائر کی قدر و قیمت کا تعین کرنا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک ادبی محقق کا کام ماضی کے ذخائر کو دریافت کرنا ہے۔ حقائق، واقعات اور سوانحات کی صحت کو جانچنا ہے۔ ماضی کے تسامحات کو دور کرنا ہے اور مختلف افراد سے منسوب غلط روایات کی تردید کرنا اور تحقیقی کام میں درست حقائق کو سامنے لانا ہے۔ اس لحاظ سے ادبی مؤرخ کو محقق بھی ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کی تنقیدی بصیرت کا مالک بھی ہونا چاہئے''۔ (۴۷)

اچھے مؤرخ کے لئے جہاں ایک اچھا محقق اور تنقید نگار ہونا شرط ہے وہیں اس میں تخلیاتی حِس بھی موجود ہونی چاہئے۔ مؤرخ ادب کے اوصاف پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مؤرخِ ادب نہ صرف ایک عالم کے طور پر سامنے آتا ہے بلکہ نقاد، محقق اور ماہر لسانیات، سماجیات اور ماہر تاریخ نویس کے طور پر بھی وہ سامنے آتا ہے۔ مثلاً مؤرخ کے بارے میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کہتے ہیں:

> ''مؤرخ کا تعلق ان تاریخی حقائق سے ہوتا ہے جنہیں وہ بدل نہیں سکتا۔ اس کا تعلق فن کی طرح آفاقی صداقتوں سے نہیں ہوتا۔ وہ صرف امر واقعہ سے متعلق ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے کام کی سطح سائنسی ہے''۔ (۴۸)

سجاد باقر رضوی مؤرخ کے کام کو سائنس کہتے ہیں تو ٹھوس مفروضیت کی بات کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ مؤرخ حالات اور واقعات کا تجزیہ کرتا ہے اور ان کو جوں کا توں بیان کر دیتا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

> ''مؤرخ کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ ماضی کو زمانہ حال میں زندہ کر دے۔ نہ صرف زندہ کر دے بلکہ اسے ہمارے شعور کے ارتقاء کا حصہ بھی بنا دے۔ کوئی خیال یا کوئی فکر اچانک آسمان سے نہیں اترتا

بلکہ وہ ایک پیڑ کی طرح دھیرے دھیرے پروان چڑھتے ہیں اور اپنی صورت بناتے ہیں اور پھر کہیں جا کر معاشرے کی زمین کا حصّہ بنتے ہیں۔ تاریخ ماضی کے کسی ارتقاء کو زمانہ حال میں سامنے لانے کا نام ہے''۔(۴۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی مؤرخ کی سماجیات فہمی پر زور دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مؤرخ ماضی کے سماج کی تہذیب و تمدن کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ ادب کے ذریعے نہ صرف ادب کا ارتقاء سامنے آجاتا ہے بلکہ وہ سماجیات بھی ہمارے شعور کا حصہ بن جاتی ہیں۔ جو ادب میں بیان ہوتی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالقیوم مؤرخِ ادب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آج کے مؤرخ ادب کو یہ دیکھنا ہے کہ ایک فن کار اپنی تخلیقات کو کن حالات میں پیش کرتا ہے۔ اس زمانے میں تصنیف و تالیف کا کیا رجحان تھا۔ اپنے پیش رووٴں اور ہم عصروں سے اس نے کس حد تک اثر قبول کئے اور کہاں تک اپنی قوتِ نقد سے کام لے کر ادبی اجتہاد کے لئے راستہ ہموار کیا۔ وہ کس حد تک اپنے دور کی نمائندگی کرتا ہے اور کہاں تک اس سے مختلف ہے۔ کن اسباب کی بناء پر اس نے اختلاف کیا اور اس میں کہاں تک کامیاب رہا۔ آج ہم اس سے کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں''۔(۵۰)

ڈاکٹر عبدالقیوم کے مطابق ایک مؤرخ نقاد بھی ہوتا ہے جو تخلیقات میں پوشیدہ ادوار کا شعور بھی تلاش کرتا ہے اور اس پر اپنی رائے بھی دیتا ہے اور ہر تخلیق کار کی اجتہادی کاوشوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ گویا جو مؤرخ تنقیدی شعور نہیں رکھتا وہ اچھا مؤرخ نہیں بن سکتا۔ سعد مسعود غنی کہتے ہیں:

''مؤرخ ادب کے لئے ضروری ہے کہ اسے فلسفہ تاریخ سے مکمل آگاہی ہو اور وہ تاریخ نویسی کے مخصوص طریقوں سے آشنا ہو۔ وہ تاریخ ادب کے دیگر معاون علوم مثلاً فلسفہ، اقتصادیات، نفسیات اور سیاسیات کا مناسب علم رکھتا ہو۔ مؤرخِ ادب کو چاہئے کہ وہ ''معروضیت'' کے اصول پر ممکنہ حد تک کاربند رہتے ہوئے غیر جانبدار رہ کر حقائق کو تاریخ کا حصہ بنائے اور حقائق کی دریافت کے لئے قیاسات کی بجائے تحقیق اور جستجو سے کام لے''۔(۵۱)

سعد مسعود غنی درحقیقت مؤرخ کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ وہ محقق بھی ہو اور ماہر تاریخ بھی ہو کیونکہ تحقیق کے بغیر تاریخ محض اوقات شماری اور شخصیت نگاری بن کر رہ جائے گی۔ ایک محقق کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخ سے بھی آگاہ ہو۔ جب کہ ڈاکٹر سلیم اختر مؤرخ کے اوصاف کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

''کسی زبان کی جغرافیائی حدود سے مخصوص لسانی، روحانی، تہذیبی، تمدنی، سیاسی اور اقتصادی عوامل و محرکات اور محرکات کے عمل اور ردعمل سے تشکیل پانے والے ذہنی تناظر میں وقوع پذیر ہونے والی تخلیقات کی معیار بندی، لسانی مضمرات اور تخلیقی شخصیات کا مطالعہ اور تاریخ نگاری اور انہی کا مطالعہ،

تجزیہ وتحلیل اور تشریح ادبی مؤرخ کا بنیادی فریضہ''۔(۵۲)

ڈاکٹر سلیم اختر اور دیگر اہل علم کی آراء سے مؤرخ کی شخصیت ہمہ جہت علوم وفنون کی حامل معلوم ہوتی ہے۔مؤرخ ادب نقاد،محقق،فلسفہ دان،سماجیات اور تاریخ وادب کا گہرا مطالعہ رکھنے والا شخص ہی ہوسکتا ہے۔

۱۱۔ ادبی تاریخ نگاری (مشاہیرِ اُردو ادب کی نظر میں)

احتشام حسین ادبی تاریخ نگاری کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادب کی تاریخ گو زبان کی تاریخ نہیں ہوتی لیکن زبان کا تسلسل اور استعمال ادبی ارتقاء کی بنیادی کڑی بن جاتا ہے۔ادب کا ہر دور اور اس کی ہر صنف اپنی امتیازی حیثیت کے باوجود زبان کے ارتقاء کے متعلق ہے۔زبان کا ارتقاء بھی عام انسانی ارتقاء کا تابع ہے۔اس کی رفتار بھی کبھی بہت سست اور کبھی تیز ہوتی ہے۔سستی اور تیزی کے تاریخی اور سماجی اسباب ہوتے ہیں۔زبان کا اندرونی نظام صوتی تغیرات سے اور اوپری ڈھانچہ دوسری زبانوں کے تعلیمی اور تہذیبی تقاضوں، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں سے اثر لے کر زبان کی شکل بدلتا رہتا ہے جسے سرسری طور پر سبھی ادب اور زبان کا مطالعہ کرنے والے دیکھ لیتے ہیں۔اس سے جہاں ادب کو فائدہ پہنچتا ہے وہاں ادبی تاریخ نگاری کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے''۔(۵۳)

زبان کا مطالعہ اور تاریخ بیان کرنا اُن سماجی اور سیاسی واقعات کے تناظر میں بیان کرنا ہے جو ادب کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری تواریخ ادبیات اُردو کے حوالے سے کہتے ہیں:

''ہمارے ہاں ادبی نقادوں نے جو تاریخیں لکھی ہیں وہ تحقیق کے اعتبار سے کمزور ہیں اور جو تاریخیں ادبی محققین کے قلم کا نتیجہ ہیں وہ تنقیدی اعتبار سے کم زور ہیں۔ان پر تحقیق بہت غالب آ گئی ہے۔ایک اچھی، متوازن ادبی تاریخ تحقیق اور تنقید پر یکساں قدرت کا تقاضا کرتی ہے۔اگر نقاد کا کام تحقیقی اعتبار سے کمزور ہے تو وہ غلط نتائج تک پہنچے گا اور اگر محقق تنقید کے تقاضے پورے نہیں کرتا تو تاریخ کی تحسین وتفہیم غیر معیاری سمجھی جائے گی۔اس لئے ایک اچھی تاریخ لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ مصنف تحقیق اور تنقید پر قادر ہو اور ان دونوں کے امتزاج اور توازن سے تاریخ نویسی کا کام کرے ان کے درمیان کسی بھی قسم کا عدم توازن تاریخ کو برباد کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔درحقیقت تحقیق اور تنقید کا کوئی بھی پہلو کم زور نہیں ہونا چاہئے''۔(۵۴)

جبکہ نام ور محقق،مؤرخ اور ادیب ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

''اُردو ادب کی تاریخِ بزرگ اتنا بڑا کام ہے کہ ایک فرد اس ہفت خواں کو تنہا سر انجام نہیں دے سکتا۔ چند مخلص اہلِ جنوں ہی کر سکتے ہیں۔ ان کا صحیح انتخاب ہونا چاہئے۔ ہمارا ترقیِ اُردو بیورو چاروں جلدوں میں اُردو ادب کی تاریخ تیار کرا رہا ہے۔ برسوں سے وہ ایک دوسرے ادیب کو ایک ایک جلد کی ذمے داری سونپتا ہے۔ لیکن کوئی اس بیل کو منڈھے ہی نہیں چڑھاتا، میں نے اور سیدہ جعفر نے اپنے حصے کی جلد کئی سال پہلے ان کے حوالے کر دی تھی۔ بہترین صورت تو یہ ہوتی ہے کہ اُردو کا کوئی مقتدر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہوتا اور وہ اپنے یہاں چار پانچ کل وقتی ماہرین کو ادارے میں بٹھا کر تاریخ لکھواتا۔ ہندوستان میں ایسا کوئی انسٹی ٹیوٹ نہیں۔ پاکستان کے مقتدرہ قومی زبان کی اولیات غالباً دفتری اور نظم و نسق کی زبان کی ہیں۔ ان حالات میں ساری امیدیں اس فرہاد جمیل جالبی کی تاریخ پر لگی ہیں کہ وہ کس طرح بقیہ جلدیں بھی اسی معیار کے ساتھ مکمل کر دیں۔ اس کے بعد اکیسویں صدی میں کسی تازہ تاریخ کے بارے میں سوچا جائے گا۔ (۵۵)

مرزا سلیم بیگ ''آب حیات'' کو اُردو ادب کی ادبی تاریخ نگاری کا اولین نمونہ کہتے ہوئے ادبی تاریخ نویسی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد کی تصنیف ''آب حیات'' کو ہر لحاظ سے اوّلیت اور فوقیت حاصل ہے کہ شعری تنقید اور انشاء پردازی کے علاوہ باقاعدہ ادبی تاریخ نویسی کا آغاز بھی اِسی سے ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کچھ خصوصیات قدیم تذکرہ نویسی کی اور کچھ خصوصیات ادبی تاریخ کی ہیں۔ مثال کے طور پر تنقید کا تاثراتی انداز اور شعراء کے انتخاب کلام کا طریقہ وہی ہے جو ہمیں قدیم تذکروں میں ملتا ہے۔ لیکن اس لحاظ سے ادبی تاریخ کی جھلک بھی ملتی ہے کہ اسے (ادبی تاریخ کو) مختلف ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اور پھر ان کے سیاسی پسِ منظر اور ادبی رجحانات کی تفصیل اور حالات اور نظریات کی روشنی میں ہر دور کی شاعری کے فنی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جن کے پیشِ نظر ''آب حیات'' قدیم تذکرہ نویسی کی خصوصیات رکھتے ہوئے بھی ادبی تاریخ کے زمرے میں آجاتی ہے''۔ (۵۶)

آب حیات کی اہمیت ہے کیونکہ اس کو اولین نمونہ تاریخ نگاری کہا جا سکتا ہے۔ روایت کے تسلسل میں ''آب حیات'' پہلی کڑی ہے۔ نامور محقق ڈاکٹر معین الدین عقیل ادبی تاریخ نویسی صورت حال اور تقاضے میں لکھتے ہیں:

''تاریخ نویسی میں تازہ تقاضے ہیں جن کی اہمیت تاریخی اور معاشرتی شعور ہمیں سمجھا رہا ہے لیکن یہاں میں ایک اور نکتے کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ بیسویں صدی میں جنگ عظیم اوّل کے آس پاس کی صورتِ حال نے جس طرح قوموں کو ایک دوسرے کو سمجھنے اور اپنی تہذیبی و تاریخی روایات کو، اپنے

رویوں کو جانچنے پر کھنے پر آمادہ کیا اور پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد جغرافیائی اور قومی معاشروں نے تمام دیگر معاشروں سے روابط بڑھانے اور ایک دوسرے کے قریب آنے پر مجبور کیا اور پھر آج ایک عالمی معاشرے کا تصور ایک حقیقت کی صورت میں ہمیں سوچنے، سمجھنے، سنبھلنے اور مبارزت کو قبول کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہمارے ماضی کے ساتھ تصورات و نظریات ایک آزمائش سے دوچار ہیں اور اس فضا میں انسان اور انسانی معاشرے باہم ایک دوسرے کے قریب اس حد تک آ گئے ہیں کہ ایک دوسرے کی آہٹیں اور دھڑکنیں تک سنائی دینے لگی ہیں۔ ایسے میں تاریخ نویسی۔۔۔۔۔۔۔اور ادب کی تاریخ نویسی کے تقاضوں کو اس تناظر میں دیکھنا ضروری ہو گیا یعنی اس طرح کہ آج ہمارے معاشرے کے احساسات و جذبات کیا ہیں اور دیگر معاشروں میں احساسات و جذبات کی نوعیت کیا ہے؟'' (۵۷)

تاریخ ادبِ اُردو سے شعور، نظریات اور جذبات کی روایت بھی قائم ہوتی ہے۔ پروفیسر رضی عابدی کی ادبی پہچان ہی بہ حیثیت مؤرخ ہے۔ ادبی تاریخ نویسی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''سب سے اہم بات یہ ہے کہ ادب کی تاریخ دراصل اس ذہنی مزاج کی تاریخ ہوتی ہے جس کا اظہار کسی زبان کے ادب میں ہوتا ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک اس گروہ یا قوم کا فکری ارتقاء جس کا ادب زیرِ مطالعہ ہے اور دوسرے تکنیکی میدان میں اس کی جدّت طرازیاں اور کامیابیاں۔ ادب انسان کا زندگی کے متعلق جمالیاتی اور جذباتی ردِعمل ہے۔ اس لئے اس میں غلط بیانی اور فریب کاری کے امکانات بہت کم ہیں۔ مثلاً ایک مؤرخ مغلیہ عہد کی تاریخ کو ایسے انداز سے پیش کر سکتا ہے جس سے صرف اس دور کی خوبیاں ہی نمایاں ہوں جیسے ان کے بادشاہوں کی انصاف پسندی، ان کی فن نوازی، موسیقی، تعمیرات اور دیگر فنونِ لطیفہ میں ان کا اعلیٰ ذوق لیکن وہ کتنے ظالم تھے؟ ان کے ایماء پر کتنے قتل کئے گئے اور وہ کن کن سازشوں میں ملوث رہے، اس کا بالکل ذکر ہی نہ ہو۔ دوسری طرف ایسے مؤرخ بھی ہو سکتے ہیں جو مغلیہ دور کی صرف برائیاں ہی بیان کر دیں اور اس کی اچھی باتوں کو بالکل نظر انداز ہی کر دیں۔ لیکن ادب میں ایسا ممکن نہیں۔ میرؔ، سوداؔ، نظیرؔ، انیسؔ اور غالبؔ کے کلام سے ان کے زمانہ کے حالات کا واضح اور صحیح جذباتی نقشہ ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ ادب کی تاریخ کا کام اس جذباتی نقشہ کا تجزیہ کرنا اور اس کے سیاق و سباق کی چھان بین کرنا ہے''۔ (۵۸)

مندرجہ بالا صفحات پر چند اہم مؤرخین اور مشاہیر ادب کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں جن میں ادبی تاریخ کی اہمیت اور افادیت کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں ادبی تاریخ نویسی ہی اُردو ادب کو اس مقام تک لائی ہے۔ یہ اتنا اہم موضوع ہے کہ اس پر جتنی بھی خامہ فرسائی کی جائے کم ہے۔ اس میں تمام اصناف اور شخصیاتِ ادب کا تفصیلی مطالعہ ملتا ہے

جو قاری اور محقق کے لئے سود مند ثابت ہوتا ہے۔ ذیل میں ادبی تاریخ نویسی کی بحث کا خلاصہ پیش ہے۔

خلاصہ بحث

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ادبی تاریخ نویسی سچائیوں کی عکاس ہوتی ہے۔ عہد بہ عہد ادب کا نام ہے۔ مؤرخ ان تمام رعنائیوں اور رونقوں کو بیان کرتے ہوئے مآخذ اور معلومات کے خفیہ خزانے قاری پر وا کرتا ہے۔ اس لئے اسے عصری شعور کا مالک ہونا چاہئے۔ حقائق کو پرکھنے کا ہنر بھی آنا چاہئے جس کے لئے تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ تخلیقی افکار کا مالک ہونا بھی ضروری ہے۔ اگرچہ ماضی میں ان تمام باتوں کا کلی طور پر خیال نہیں رکھا گیا جس سے ہماری تاریخ کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ جب انسانی شعور ارتقائی منازل طے کرتا ہے تو وہ مادی تبدیلیوں سے متاثر ہو رہا ہوتا ہے۔ اس طرح تاریخ کے ادوار بھی کسی بڑی تبدیلی کے عکاس ہوتے ہیں۔ اس میں کسی دور کو نظر انداز کرنا ناانصافی ہے۔ بہرحال ادبی تاریخ لکھنے والے ہی حقائق کے بہت بڑے ذخیروں کو منظر عام پر لا سکتے ہیں اب تک جو ہماری ادبی تاریخ ہے ہم اس پر فخر اس لئے کر سکتے ہیں کہ یہ کسی نکتے پر اپنے آپ کو مکمل ضرور کرتی ہے۔ ادب کے ظاہر و باطن تک مؤرخین نے پہنچنے کی جو کوششیں کی ہیں انہیں کامیاب کاوش کہتے ہیں۔ ہمیں شرمانا نہیں چاہئے۔ البتہ یہ بات مدنظر رکھنی چاہئے کہ اس کام کو مزید بہتر کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ اس طرح ہم اپنی قومی اور اجتماعی تہذیب کو ادب کے شیشے میں زندہ دلی سے محفوظ کر کے صفحہ تاریخ پر دنیا کو دکھا سکتے ہیں۔ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ہم ادب کو قومی تہذیب میں ضم کر کے دنیا کی تاریخ میں درج کروا لیں گے۔

تاریخ ادب اور تخلیقی ادب بھی ہے تحقیق بھی ہے اور تنقید بھی۔ ایک مؤرخ تاریخ لکھتے ہوئے جب تجزیہ کرتا ہے تو وہ تنقید سے کام لیتا ہے اور جب واقعات کی سچائی تلاش کرتا ہے اور اس کے بنیادی مآخذ تک رسائی حاصل کرنے کی جستجو کرتا ہے تو وہ ایک محقق بن جاتا ہے۔ اسی طرح جب ایک مؤرخ تخلیقات میں موضوعات کی بازیافت کرتا ہے تو وہ تخلیق کاری کے مقام پر متمکن دکھائی دیتا ہے۔ گویا مؤرخ تاریخ نگاری میں کئی حثیات میں کام کر رہا ہوتا ہے۔ تاریخ نگاری کے لئے تحقیقی جستجو، تنقیدی پرواز اور تخلیقی صلاحیت ضروری ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فیروزالدینؒ، الحاج مولوی (مرتب)، فیروزاللغات اُردو جامع (نیا ایڈیشن)، فیروزسنز لمیٹڈ، لاہور، سن، ص ۳۳۶

۲۔ زوار حسین، تہذیب، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۰ء، ص ۷۰

۳۔ ناہید قمر، ڈاکٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیقی خدمات، مشمولہ ''دریافت''، مدیر، ڈاکٹر رشید امجد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو جز، اسلام آباد، بہار ۲۰۰۳ء، شمارہ ۲، ص ۵۴۱

۴۔ محمد مجیب، دنیا کی تاریخ، سٹی بک پوائنٹ کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۷

۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع تیسویں، ۲۰۱۳ء، ص ص ۱۶، ۱۷

۶۔ سبطِ حسن، ''تہذیب سے تمدن تک، مشمولہ ''کلچر'' از اشتیاق احمد بیت الحکمت لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۲

۷۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخِ ادب اُردو، المصر اب پبلشرز، ملتان، ستمبر ۲۰۰۵ء، ص ص ۶، ۷

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد دوم) مجلسِ ترقی ادب لاہور، طبع چہارم، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ص ۱۲، ۱۳

۹۔ گیان چند، ڈاکٹر، اُردو کی ادبی تاریخیں، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۱۵ء، ص ص ۲۱، ۲۲

۱۰۔ آسیہ نورین، ادبی تاریخ نویسی، مشمولہ ''زبان و ادب''، شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، مدیر ڈاکٹر شبیر احمد قادری، شمارہ ۱۰، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۲

۱۱۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اُردو، مرزا محمد عسکری مترجم، علمی کتاب خانہ اُردو بازار، لاہور، سن ن، ص ۱۱

۱۲۔ سعدیہ طاہر، اُردو ادب کی تاریخ ایک جائزہ، مشمولہ ''دریافت''، مدیر ڈاکٹر رشید امجد، نیشنل یونیوسٹی اسلام آباد، ستمبر ۲۰۰۴ء، ص ۳۱۷

۱۳۔ محمد سلیم ملک، ڈاکٹر، ''بازیافت''، شعبہ اُردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شمارہ ۱۰، جنوری ۲۰۰۷ء تا جون ۲۰۰۷ء ص ص، ۹، ۱۰

۱۴۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخ ادبِ اُردو، ص ص ۲۸، ۲۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۳

۱۶۔ ایضاً، ص ص ۴۷، ۴۸

۱۷۔ رام بابو، سکسینہ، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اُردو، ص ظ

۱۸۔ سہیل احمد اُردو ادب کی تاریخ، تدریس کے لئے تناظرات، مشمولہ خیابان، مدیر، ڈاکٹر بادشاہ منیر بخاری، جامعہ پشاور، بہار ۲۰۱۲ء، ص ۹۹

۱۹۔ سبینہ اویس، ڈاکٹر، تواریخ ادب اُردو۔ ایک جائزہ، مشمولہ ''پیغام آشنا''، مدیر، ڈاکٹر علی کمیل قزلباش، شمارہ نمبر ۶۶، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء، ص ۴۴

۲۰۔ شاکر کنڈان، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی کے اصول''، مرتبین ڈاکٹر سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر) پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، طبع دوم ۲۰۱۵ء، ص ۲۹۲

۲۱۔ Muhammad Sadiq, A history of Urdu literature, Oxford University press, London, 1995, Page 14.

۲۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع دوم، جنوری ۱۹۸۴ء، ص ز

۲۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو، جلد دوم، ص ص ۱۲، ۱۳

۲۴۔ ظفر الاحسن لاری، ادبی تاریخ کے اصول، مشمولہ ''اُردو کی ادبی تاریخیں'' (نظری مباحث) مرتبہ سلمان احمد (پرویز احمد) قصر الادب حیدر آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۳۰

۲۵۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، اُردو زبان اور اُردو رسم الخط لسانی تعبیر اور روحانی تفسیر، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ص ۲۲۳، ۲۲۴

۲۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ''اُردو کی ادبی تاریخ کا بنیادی مواد اور مولوی عبدالحق، مشمولہ ''ماہنامہ'' قومی زبان''، کراچی، اگست ۲۰۰۲ء، ص ۲۴

۲۷۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخ ادب اُردو، ص ۱۶

۲۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد اول) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۲۰۲

۲۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادبِ اُردو (جلد اوّل)''، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۶۷۳

۳۰۔ ایضاً، ص ۹۹

۳۱۔ جمیل جالبی ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد اول) مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع ہفتم ۲۰۰۸ء، ص ص ۵۸۶، ۵۸۷

۳۲۔ سنیتی کمار چڑجی، ہند آریائی اور ہندی، (مترجم) عتیق احمد صدیقی ۳۱، ترقی اُردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۷۷ء ص ۹۸

۳۳۔ رشید حسن خاں، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۸ء، ص ۱۸

۳۴۔ اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی، مختصر تاریخ ادب اُردو عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، طبع اول ۱۹۵۳ء ص ص ۱۴، ۱۵

۳۵۔ سلیم اختر ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، طبع تیسویں، ص ۲۳

۳۶۔ رضی عابدی، پروفیسر، اُردو ادب کی تاریخ کیسے لکھی جائے، مشمولہ ’’ادبی تاریخ نویسی‘‘ (ڈاکٹر سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر) پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، طبع دوم ۲۰۱۵ء ص ۱۶۲

۳۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تاریخ کی تشکیل نو کے مسائل، مشمولہ ’’ادبی تاریخ نویسی‘‘، ص ص ۶۲، ۶۳

۳۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ اُردو ادب (جلد اول) طبع دوم، جنوری ۱۹۸۴ء، ص ح

۳۹۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اُردو، ص ۳۵۶

۴۰۔ رضی عابدی، پروفیسر، اُردو ادب کی تاریخ کیسے لکھی جائے، مشمولہ ’’ماہنامہ ماہ نو‘‘، گولڈن جوبلی نمبر، اگست ۱۹۹۷ء، ص ۱۹۸

۴۱۔ رالف رسل، ’’اُردو ادب کی تاریخ کیسے نہیں لکھنی چاہیے‘‘، مشمولہ ’’ادبی تاریخ نویسی‘‘، ص ۱۴۵

۴۲۔ معین الدین، ڈاکٹر عقیل، ادبی تاریخ نویسی: صورتحال اور تقاضے، مشمولہ ’’بازیافت‘‘، مدیر ڈاکٹر محمد سلیم ملک، ص ۱۴

۴۳۔ گیان چند ڈاکٹر جین، اُردو کی ادبی تاریخ کا ارتقاء، مشمولہ ’’ادبی تاریخ نویسی‘‘، ص ۱۱۵

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۴۵۔ محمد حسن ڈاکٹر، تاریخ ادب کی تدریس، مشمولہ ’’ادبی تاریخ نویسی‘‘، ص ۱۵۱

۴۶۔ علی جواد زیدی، تاریخ ادب اُردو کی تدوین، مشمولہ ’’ادبی تاریخ نویسی‘‘، ص ۴۵

۴۷۔ حوالہ محمود الحسن/ شفیق انجم، ڈاکٹر، فنِ تاریخ نویسی اور اُردو ادب کی چند اہم تاریخیں، مشمولہ ’’دریافت‘‘، شمارہ ۱۳، ص ۶۴

۴۸۔ سجاد باقر رضوی، مغرب کے تنقیدی اصول، اظہار سنز لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۴۸

۴۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (معاصر ادب) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۶۶

۵۰۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، تنقیدی نقوش، مشتاق بک ڈپو، کراچی ۱۹۶۲ء ص ۱۳۱

۵۱۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخ ادب اُردو، ص ص ۲۴، ۲۵

۵۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۸۴

۵۳۔ احتشام حسین، ادبی تاریخ، مشمولہ ’’ادبی تاریخ نویسی‘‘، ص ۱۵

۵۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ کیسے لکھی گئی، مشمولہ ’’ادبی تاریخ نویسی‘‘، ص ۸۹

۵۵۔ گیان چند، ڈاکٹر جین، اُردو کی ادبی تاریخ کا ارتقاء، مشمولہ ’’ادبی تاریخ نویسی‘‘، ص ۱۱۶

۵۶۔ سلیم بیگ، مرزا، سکسینہ کی تاریخ ادب اُردو، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''، ص ص ۳۶۹،۳۷۰

۵۷۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، ادبی تاریخ نویسی: صورتحال ارتقاء مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''، ص ۱۳۱

۵۸۔ رضی عابدی، پروفیسر، اُردو ادب کی تاریخ کیسے لکھی جائے، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''، ص ص ۱۵۹،۱۶۰

باب دوم: عمومی تاریخ نگاری

زیرِ نظر باب مقالے کا اہم اور ضخیم باب ہے۔عمومی تاریخ نگاری سے مراد تاریخ کی وہ کتب ہیں جو اکثر و بیش تر عام طور پر مختلف اوقات میں منظرِ عام پر ہوتی رہیں۔عمومی تاریخ نگاری کا آغاز محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' سے شروع کیا تھا جو ارتقائی سفر طے کرتا ہوا رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اُردو تک پہنچا اس کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ نویسی تک آتے آتے بہت سے ادوار سے گذرا۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

عمومی تاریخ نگاری میں مؤرخین نے روایات کا دامن پکڑ کر تاریخ کو قلم بند کرنا شروع کیا جو ہماری ادبی تاریخ نگاری کا انمول خزانہ ہے۔تاریخ نگاری سے ہماری زبان و ادب کو کتنا فائدہ ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے یوں سمجھ لیجئے کے یہ کارنامہ ایک طرف تو تاریخ کے تقاضے پورا کرتا رہا اور دوسری طرف یہ خالص اُردو ادب ہے جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔اس میں سوانحی عناصر کو تنقیدی نقطۂ نظر سے پیش کر کے ہمارے مؤرخین نے جس ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا وہ لائق ستائش ہے۔عمومی تاریخ نگاری میں وہ سب کتب شامل ہیں جو اصناف لسانیات اور نظریات پر مشتمل ہیں عمومی تاریخ میں علاقائی نکتۂ نظر کو بھی پیش کیا گیا ہے۔عمومی تاریخ نگاری میں جہاں تاریخ ادب اُردو کی مجموعی صورتحال کو سامنے رکھا گیا ہے وہاں تسلسل کے ساتھ ارتقائی صورتحال بھی پیشِ نظر ہے عمومی تاریخ نگاری میں کتابوں کی ترتیب زمانی اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاؔد کی شہرہ آفاق تصنیف ''آبِ حیات'' سے لے کر گارسیں دتاسی کی ''تاریخِ ادبیاتِ اُردو'' تک ان منتخب کتب کو اس میں شامل کیا گیا ہے جن میں ادب کی مجموعی صورتحال کی تصویر دکھائی گئی ہے۔

ا۔ آبِ حیات (محمد حسین آزاد)

محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' سے پہلے کا محفوظ اُردو ادب تذکروں کی کتب میں ملتا ہے۔بعض نقاد ''آبِ حیات'' کو محض تذکرہ کہتے ہیں لیکن اب اسے تاریخ کی پہلی کڑی تسلیم کر لیا گیا ہے۔آبِ حیات تاریخ کی پہلی مستند تاریخ ہے جس کی اہمیت اب مسلمہ ہو چکی ہے۔محمد حسین آزاد نے پہلی مرتبہ تاریخ نویسی کا آغاز کیا۔مؤرخین ادب کی کثیر تعداد اسے اُردو کا آخری تذکرہ اور تاریخ کی پہلی کڑی کہتے ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر رقمطراز ہیں:

''آزاد کی اصل شہرت آبِ حیات (۱۸۸۸ء) کی وجہ سے ہے۔نہ صرف اسلوب کی رنگینی الفاظ

کے فنکارانہ استعمال اورعبارت کے شاعرانہ حسن کے وجہ سے ہی بلکہ اس لئے بھی کہ یہ پہلی کتاب ہے۔جس نے تذکروں کی فہرست سازتنقیدی روایات سے انحراف کیا۔'' (۱)

کتابِ مذکورہ کی اہمیت اورشہرت کا اندازہ اس کے متعدد ایڈیشن سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔آبِ حیات میں کلاسیکی شعراء کی شاعرانہ خدمات اوران کا ادبی مقام ومرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس میں اُردوشاعری کے کلاسیکی دورکو پانچ مختلف ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔آغاز میں اُردوزبان وادب کے ابتدائی دورکوچھوٹے چھوٹے ذیلی عنوانات دے کرتحریر کیا گیا ہے۔آغاز سے لے کرانیؔس ودبیؔر کے دورتک تمام تاریخ رنگین اسلوب کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''میرے دوستو! زندگی کے معنی کھانا، پینا، چلنا، پھرنا،سونا،اورمنہ بولے جانانہیں ہے۔زندگی کے معنے یہ ہیں کہ صفاتِ خاص کے ساتھ نام کوشہرتِ عام ہواور بقائے دوام ہو۔اب انصاف کروکیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں باہم پہنچائیں۔انہیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آئیں اوراس پرنام کی زندگی سے محروم رہیں۔ بزرگ بھی وہ بزرگ کہ جن کی کوششوں سے ہماری ملکی اورکتابی زبان کا لفظ لفظ اورحرف حرف گراں بارِاحسان ہو۔۔۔۔غرض خیالاتِ مذکورہ بالا نے مجھ پرواجب کیا کہ جوحالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یامختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انہیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہواس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں۔اورانہیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو۔'' (۲)

مصنف نے زبان کی تاریخ، شاعری کی تاریخ اور برج بھاشا پرفارسی کے دخل پانے کے بعدآئندہ کے اثرات کو تفصیلاً بیان کیا ہےاس کے بعدشاعری میں پانچ مختلف ادوارپیش کئے ہیں۔ پہلے دور میں ولی دکنی اوراسکے معاصرین باکمال کے حالاتِ زندگی، شاعری اورشب وروزکوشگفتہ اورلطیف انداز میں بیان کیا ہے ولی دکنی کے حالات اورشاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ نظم اُردوکی نسل کا آدم جب ملکِ عدم سے چلا تواس کے سر پراوّلیت کا تاج رکھا گیا جس میں وقت کے محاورے نے اپنے جوہرات خرچ کئے اور مضامین کی رائج الوقت دست کاری سے مینا کاری کی۔۔۔۔غرض جب ان کا دیوان دلی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پرلیا۔قدر دانی نےغور کی آنکھوں سے دیکھا،لذت نے زبان سے پڑھا،گیت موقوف ہوگے،قوال معرفت کی محفلوں میں انہیں کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ اربابِ نشاط یاروں کو سنانے لگے۔ جوطبیعت موزوں رکھتے تھے۔انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا۔'' (۳)

آزادؔ نے ولی کے دور کے الفاظ اوراصلاح زبان کے سلسلے میں متروک ہوجانے والے الفاظ کی تفصیل اورترتیب

سے فہرست بھی تحریر کی ہے۔ پہلے دور میں معاصرین ولی میں شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمونؔ، محمد شاکرؔ، ناجیؔ، محمد احسن احسنؔ اور مصطفیٰ خان یک رنگ کے حالات اور شاعری کی تفصیل بیان کی ہے۔ آبِ حیات کی ابواب بندی، لسانی تغیرات اور مختلف ادوار کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''آزاد کی اصل شہرت'' آبِ حیات'' ۱۸۸۱ء کی وجہ سے ہے۔۔۔۔۔آزاد تحقیق کے مردِ میدان نہ تھے اس لئے اس میں بے شمار غلطیاں ہی نہیں بلکہ تحقیقات کے پھیلتے ہوئے دائرہ نے بہت سی باتوں اور آراء کو تو متروک بھی بنا دیا ہے۔آبِ حیات میں پہلی مرتبہ شاعری کے ارتقاء کے ادوار مقرر کر کے ہر عہد کی شاعرانہ خصوصیات کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ان کے ساتھ ہی انہوں نے ہر دور کے متروک الفاظ کی فہرست مرتب کی اور دیگر لسانی تغیرات پر روشنی ڈالی۔۔۔۔۔یہ ان کے قلم کا اعجاز ہے کہ آج قدیم شاعروں کی زندگی کا ڈراما آبِ حیات میں دیکھا جا سکتا ہے۔'' (۴)

محمد حسین آزاد جدید رنگ کے بانی اور اُردو ادب کے مجدد سمجھے جاتے ہیں۔ وہ جدید ادب کے نامور نثر نگار اور ماہر لسانیات اور مستند شاعر تھے۔ انہوں نے آبِ حیات میں بھی شاعرانہ اسلوب کو اپناتے ہوئے قدیم و جدید شعراء کے حالاتِ زندگی اور شاعری کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔آبِ حیات کے پہلے دور میں انہوں نے ولی دکنی کے علاوہ ایہام گو شعراء خصوصاً آبروؔ، مضمونؔ، ناجیؔ، یک رنگ کے کلام وفن پر بحث کی ہے۔رنگینی اسلوب کی مثال دیکھیے جس میں پہلے دور کے بزرگوں کو رخصت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''پہلا دور برخاست ہوتا ہے ان مبارک صدر نشینوں کو شکریے کے ساتھ رخصت کرنا چاہیے کہ مبارک جانشینوں کے لئے جگہ خالی کر کے اٹھے۔ ایجاد کے بانی اور اصلاح کے مالک تھے۔ ملک کی زبان میں جو کچھ کیا اچھا کیا جو کام باقی ہے اچھے نکتہ پردازوں کے لئے چھوڑ ئے چلے گئے۔ ہر مکان جلسے کہ بعد درہم برہم معلوم ہوتا ہے مگر یہ اس طرح سجا کر چلے ہیں کہ جو ان کے بعد آئیں گے آرائش و زیبائش کے انداز سوچ سوچ کر پیدا کریں گے۔اب زیادہ گفتگو کا موقع نہیں کہ دور دوم کو زیب دینے والے آن پہنچے۔'' (۵)

دوسرا دور بھی قدیم شعراء اُردو کے حالات و خیالات کا احاطہ کرتا ہے۔اس دور میں شاہ حاتمؔ، سید انشاءؔ، شاہ تسلیمؔ سعادت یار خان رنگینؔ، محمد امان نثارؔ، میاں ہدایت سراج الدینؔ، علی خان آرزوؔ اور اشرف علی فغاںؔ کے کوائف اور کلام موضوع بحث لائے گئے ہیں فاضل مصنف کا بیان یوں ہے جیسے مشاعرے کی نظامت کرنے والا مختلف شعراء کا مفصل تعارف کراتے ہوئے انہیں اسٹیج پر بلاتا ہے۔اس دور میں خان آرزوؔ کی شہرت چونکہ میر تقی میرؔ کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن جن کمالات کے وہ مالک تھے انہیں بھی آزادؔ نے خوب بیان کیا۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خان آرزو کو زبانِ اُردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ ومنطق پر ہے جب تک کہ کل منطقی

ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اُردو خان آرزؔو کے عیال کہلاتے رہیں گے۔ ان کا دلچسپ حال تحریر تھا۔لیکن چونکہ فارسی تصنیفات کی مہموں نے انہیں کوئی دیوان اُردو میں نہ لکھنے دیا۔اس لیے یہاں ان کے باب میں اس قدر لکھنا کافی ہے کہ خان آرزؔو وہی شخص ہے جن کے دامن تربیت سے ایسے شائستہ فرزند تربیت پا کر اٹھے جو زبانِ اُردو کے اصلاح دینے والے کہلائے اور جس شاعری کی بنیاد جگت اور ذو معنی لفظوں پر تھی اسے کھینچ کر فارسی کی طرز اور ادائے مطالب پر آئے۔یعنی مرزا جانِ جاناں مظہرؔ، مرزا رفیعؔ، میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ وغیرہ۔'' (۶)

دوسرے دور میں وہ شعراء شامل ہیں جو ایہام گوئی کے ردِ عمل کے طور پر ادب کے افق پر نمودار ہوئے یہ وہ طبقہ ہے جو پہلی بار ایہام کے خلاف صف آراء ہو جس کی تائید میں اُردو غزل کے اس سنہری دور کا آغاز ہوا جس میں میرؔ و سوداؔ بھی شامل ہیں۔ رام بابو سکسینہ آزادؔ کی کامل نثر اور میلان طبیعت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان [آزاد] کی افتاد طبیعت عالمانہ تھی اور وہ علاوہ کامل نثار و شاعر ہونے کے ایک مشہور ماہر تعلیم اور جریدہ نگار اور ناقد بھی تھے۔انہوں نے ضروریات زمانہ کا لحاظ کر کے اپنے میلان طبیعت کو جو اس زمانہ کا عام رنگ تھا جدید رنگ سے بدلا اور ایثارِ نفس سے کام لے کر اسی میدان میں شہادتِ علمی کا درجہ حاصل کیا۔'' (۷)

آبِ حیات کا تیسرا دور حاصلِ تصنیف دور ہے اس دور میں ان اساتذہ کے حالات اور شاعری کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو اُردو شاعری کے عہد زریں کے نامور شعراء ہیں۔خاص طور پر مظہرؔ، تاباںؔ، سوداؔ، میرؔ، قائمؔ، ضاحکؔ، دردؔ، اثرؔ اور میر سوزؔ کے نام سے دنیا واقف ہے۔ جب بھی اُردو شاعری کے آغاز و ارتقاء کی بات کی جائے تو متذکرہ بالا اساتذہ فن کے بغیر بات نامکمل رہے گی۔

ان اساتذہ کا تعلق دبستانِ دہلی سے ہے جس کی تاریخی حیثیت و اہمیت اب مسلم ہو چکی ہے اُردو شاعری کے دو بڑے اسکول دہلی اور لکھنؤ پر مؤرخین ادب نے بہت کچھ لکھا اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ اس کی ابتداء آبِ حیات سے ہوئی جس کی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بے شک ''آبِ حیات'' تاریخ نگاری کے اس مقام پر نہیں ہے جہاں تحقیق اور تنقید کے اصولوں کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آبِ حیات بنیادی ماخذ ہے۔ اعلیٰ تحقیق کے لئے اصول اور قواعد متعین کرتی ہے۔خصوصاً دبستانِ دہلی پر مستند کتاب ہے۔

آبِ حیات کا چوتھا اور پانچواں دور دہلی اور لکھنؤ کے نامور شعراء کے حالات زندگی اور فن پر محیط ہے۔لکھنؤ کی تاریخی حیثیت کو سمیٹتے ہوئے آزادؔ نے انشاؔ و مصحفی کے علاوہ جراَتؔ، رنگینؔ، دیا شنکر نسیمؔ اور مرزا عظیم بیگؔ کے تذکرے تفصیل سے درج کئے ہیں۔لکھنوی تہذیب کا آئینہ اس باب میں واضح کیا گیا۔ پانچویں باب میں بھی لکھنؤ اور دہلی کے شعراء کا حال قلمبند کیا گیا ہے۔انیسؔ، دبیرؔ، آتشؔ و ناسخؔ غالبؔ و ذوقؔ، شاہ نصیر دہلویؔ، مومن خان مومنؔ، نواب مصطفیٰ خان

شفیتہ، حکیم آغا خان عیش سمیت دہلوی اور لکھنوی شعراء کے شب و روز اور ادبی محفلوں کو پیش کیا گیا ہے۔

محمد حسین آزادؔ نے آبِ حیات میں اپنے باکمال بزرگوں کے رویے، شاعری اور حالات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔آبِ حیات سے قبل کی تاریخی کتب اور تبصرے مکمل معلومات فراہم نہیں کرتے کہیں سالِ وفات درج نہیں تو سالِ پیدائش عنقا ہے۔کسی کے کلام کی خوبیاں چھپائی گئی ہیں تو کسی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے یہ دھوکہ آزادؔ نے بھی کھایا ہے لیکن ٹھوکریں کھا کر سنبھلنے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں۔اس لئے آبِ حیات کو اُردو کی ادبی تاریخ کا شہکار کہنا کافی حدتک درست ہے۔محمد حسین آزادؔ باکمال مصنف تھے۔انہوں نے پوری دیانت داری سے شعراء کے سوانحی کوائف مہیا کئے ہیں اور اجمالاً تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔

۲۔ شعرالہند (مولانا عبدالسّلام ندوی)

مولانا عبدالسّلام ندوی کی کتاب ''شعرالہند''، آبِ حیات اور گلِ رعنا کی طرز کی ادبی تاریخ پر مشتمل تاریخ ہے۔ ادبی تاریخ نگاری میں اس کتاب کی بھی خاص اہمیت ہے لیکن سچ یہ ہے کہ جو شہرت ''آبِ حیات'' کے حصے میں آئی اس کے مقابلے میں کتاب مذکورہ کو نہیں ملی۔

شعرالہند کی اشاعت کے وقت ادبی تاریخ کی کتب کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی اس کتاب کی اشاعت کے وقت انفرادیت کی وجہ سے اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔اصل میں مولانا عبدالسّلام ندوی خانوادۂ شبلی یعنی دارالمصنفین کے ادباء اور محققین سے تعلق رکھتے تھے۔مولانا شبلی نعمانی کی کتاب ''شعرالعجم'' جو فارسی شاعری پر تنقیدہ تبصرہ پیش کرتی ہے اپنی حیثیت منوا چکی تھی۔نام کی مناسبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا عبدالسّلام ندوی نے یہ کتاب اپنے استاد مولانا شبلی کی تقلید میں لکھی۔ شبلی نے فارسی شاعری کی تاریخ ''شعرالعجم'' کے نام سے لکھی،عبدالسّلام نے اُردو شاعری کی تاریخ ''شعرالہند'' کے نام سے تصنیف کی۔(۸) مولانا عبدالسّلام ندوی نے جن کتب سے استفادہ کیا ہے انکا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تذکروں کے علاوہ خود اُردو شاعری پر متعدد تنقیدی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں مقدمہء دیوان حالی، موازنہ انیسؔ و دبیرؔ اور کاشف الحقائق مولوی سید امداد امام اثر خصوصیت کے ساتھ ہمارے لئے کارآمد ثابت ہوئی ہیں۔اور ہم نے ان سے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔سب سے بڑی چیز اساتذہ کے دواوین ہیں جن سے تنقید وانتخاب کے علاوہ مختلف تاریخی فوائد بھی حاصل ہوسکتے ہیں اور خوش قسمتی ہے ان دواوین کا کافی ذخیرہ خود دارالمصنفین کے کتب خانہ میں موجود تھا۔جو قلمی اور مطبوعہ دواوین عام طور پر نہیں مل سکتے تھے ان کا کافی حصہ ہمارے کرم فرما مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے ہم کو

مستعار عنایت فرمایا تھا اور اس سلسلہ میں ہمارے مخدوم نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی صدر الصدور امور مذہبی ریاست حیدر آباد دکن نے بھی ہم کو کافی مدد دی ہے۔'' (۹)

کتاب مذکورہ چار مختلف ابواب پر مشتمل ہے جو بالترتیب متقدمین، متوسطین، متاخرین اور دور جدید کے عنوان سے ہے۔ متقدمین یعنی پہلے باب میں دکنی ادب اور دکنی شعراء کی شاعرانہ خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے دیباچے میں اعتراف کیا ہے کہ دکنی شاعری کی زیادہ تر معلومات صغیر بلگرامی کے تذکرہ ''جلوہ خضر'' سے ماخوذ ہیں اس کے علاوہ انہوں نے میر تقی میر اور میر حسن کے تذکروں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

شعرالہند کے تمام ابواب اپنے اپنے عہد کے ادب اور ادبی دونوں کو بیان کرتے ہیں۔ پہلا باب اُردو شاعری کا آغاز ہے قدما کا پہلا دور، دوسرا دور، میر و مرزا، تیسرا دور مصحفی اور انشاء کو بیان کرتا ہے جبکہ دوسرا باب شیخ ناسخ اور خواجہ آتش، اساتذہ دہلی، مومن و غالب پر روشنی ڈالتا ہے تیسرا داغ، امیر وغیرہ کو جبکہ چوتھا باب دور جدید کے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں مصنف کی رائے ملاحظہ ہو:

> ''کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ شاعری کے چار دور قرار دیئے ہیں اور بہ ترتیب پہلے دور میں قدماء کی شاعری کے تاریخی انقلابات و تغیرات کو نمایاں کیا ہے۔ اس کے بعد متوسطین کے دور کو لیا ہے۔ جس میں لکھنؤ کی شاعری کا آغاز ہوا ہے اور دلّی اور لکھنؤ کے دو الگ الگ اسکول قائم ہو گئے ہیں اس لئے اس دور کی اصلاحات و تغیرات کی تاریخ کے ساتھ دلّی اور لکھنؤ کی امتیازی خصوصیات اور اس دور کے مختلف اساتذہ مثلاً مومن ذوق، شاہ نصیر، غالب، ناسخ، آتش اور ان کے تلامذہ کی شاعری پر ایک مفصل بحث کی ہے پھر متاخرین کے دور کو لیا ہے اور اس دور میں لکھنؤ کی شاعری میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے۔ اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ سب سے آخر میں دور جدید کا ایک عنوان قائم کیا ہے جس میں شعراء نے حال کے کارناموں کو بہ تفصیل بیان کیا ہے اس کے بعد اُردو شاعری کے تمام انواع یعنی قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تنقید تاریخی اور ادبی حیثیت سے کی ہے اور اپنی مباحث پر کتاب کا خاتمہ ہو گیا ہے۔'' (۱۰)

۳۔ تاریخ ادب اُردو (ڈاکٹر رام بابو سکسینہ)

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی کتاب ''تاریخ ادب اُردو'' کا پہلا ایڈیشن انگریزی میں ۱۹۲۷ء میں اُردو بازار لاہور سے شائع ہوا تھا۔ (۱۱) اس وقت سے آج تک ان کی یہ کتاب ادب اُردو کی تاریخ کے طالب علموں کے لئے دلچسپی کا باعث رہی

ہے۔ جب یہ کتاب چھپی تو اپنی نوعیت کی واحد کتاب تھی۔ جس میں اُردو نظم و نثر کی تاریخ کا انگریزی ادب کی تاریخوں کے مطابق جائزہ لیا گیا تھا۔(۱۲) اس کتاب کے مترجم مرزا محمد عسکری اور مرتب تبسم کاشمیری ہیں۔ مرزا محمد عسکری نے کتاب کو انگریزی زبان میں لکھنے کا مقصد بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کو اُردو ادب کی تاریخ سے آگاہ کرنا تھا اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے مترجم کتاب کے آغاز میں رقم طراز ہیں:

''فاضل مصنف نے اصل کتاب کی ترتیب میں اس روش کا خیال رکھا ہے جو ادبِ انگریزی کے مشہور مؤرخین سینٹس بری اور گاس وغیرہ نے اپنی تصنیفات میں اختیار کی ہے۔ جس سے علاوہ جدّت ترتیب اور مخصوص اسلوبِ بیان کے یہ فائدہ بھی ضرور ہوا کہ کتاب ان اصحاب کے واسطے بہت مفید ہوگئی جنہوں نے بی اے یا ایم اے کی ڈگری یا آئی سی ایس کے واسطے ادب اُردو لیا ہو۔ جس قدر سوالات کہ امتحان مذکورہ میں پوچھے جاسکتے ہیں وہ سب اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی اور باآسانی حل ہوسکتے ہیں اور ترتیب مضامین میں خود سوالات بنانے میں بھی معین ہوگئی۔'' (۱۳)

رام بابو سکسینہ نے جس دور میں یہ کتاب لکھی اس وقت بہت سی ادبی تاریخیں سامنے آچکی تھیں۔ آبِ حیات کے علاوہ محمد یحییٰ تنہا کی ''سیر المصنفین''، مولوی عبدالحیٔ کی ''گلِ رعنا''، عبدالسّلام ندوی کی ''شعرالہند'' اور حکیم شمس اللہ قادری کی ''اُردوئے قدیم'' منظرِ عام ہوچکی تھیں۔ تمام مصنفین نے تاریخ نویسی میں اپنا اپنا حصہ ڈالا مگر رام بابو سکسینہ نے تاریخی شعور اور جامعیت کا خاص خیال رکھا جو اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مصنف نے اُردو زبان میں تواریخ کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ اسے انگریزی زبان میں لکھا جائے جو ایک منفرد اور اہم کاوش ہوگی یہی وجہ ہے کہ جب اس کو مرزا محمد عسکری نے اُردو میں منتقل کیا تو انہیں بعض مشکلات پیش آئیں جن کا ذکر کرتے ہوئے مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں:

''ترجمہ کی مشکلات کے علاوہ بعض دوسری مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ بعض باتیں ایسی تھیں کہ وہ اگرچہ اوّل اُردو ہی میں تھیں مگر قدیمی تذکرہ نگاروں نے اس کو فارسی میں بیان کیا ہے پھر انہیں کو اُردو میں بیان کیا اور پھر اُردو سے انگریزی میں بیان کی گئیں اس لئے ان میں کچھ نہ کچھ بیان ہوگیا۔ اس میں مصنف ایک حد تک معذور تھے مگر ان کو اُردو میں دوبارہ پھر اسی حیثیت سے لانا مشکل تر تھا جس کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی ہے اور جہاں انہیں مضامین ماخوذ کا اعادہ کرنا پڑا ہے تو ان کے الفاظ کو نیا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔'' (۱۴)

اُنیس ابواب پر مشتمل اس کتاب میں ہر باب کے ذیلی عنوانات کا اہتمام کیا گیا ہے جو وضاحت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں ان عنوانات سے قاری اور تاریخ ادب کے اسکالروں کے لئے سہولت پیدا ہوگئی ہے خصوصاً دبستانِ دہلی اور قدیم دور کے لئے مختص کئے گئے صفحات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں مصنف بطور مؤرخ اس کتاب میں کامیاب نظر آتے ہیں جس کی ایک اہم وجہ کہانی عنصر بھی ہے۔ انہوں نے کہانی کے انداز میں اُردو ادب کی تاریخ لکھی ہے جسے بہت سراہا گیا ہے مثال کہ طور پر

میرؔ و سوداؔ کی شاعری اوران کے دور کی اہمیت اورافادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ دور اُردو شاعری کی ترقی کا سب سے بڑا دور ہے اسی میں شاعری کو معراج ترقی حاصل ہوئی۔ اسی میں میر حسنؔ، دردؔ، سوداؔ اور میرؔ ایسے صاحب کمال پیدا ہوئے جن کے نام اس وقت تک روشن ہیں بلکہ جب تک زبانِ اُردو دنیا میں رہے گی وہ کبھی نہیں مٹ سکتے ۔۔۔۔۔۔ یہ کامل استاد اپنے اپنے فن میں بے نظیر و بے مثال گزرے ہیں اور اپنا کلام آئندہ نسلوں کے واسطے ایک بے مثل کسوٹی چھوڑ گئے ہیں۔'' (۱۵)

اسی طرح انشاء و مصحفی کی شاعری اوراس دور کی اہمیت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نظم اُردو کو دربار کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ دو ماہ قبل کے شعراء کو اپنے سر پرستوں سے انعام و اکرام اور وظیفے اور تنخوائیں پاتے تھے مگر اپنی آزادی اور خودداری کو ہمیشہ قائم رکھتے رہے۔'' (۱۶)

مصنف کا یہی اسلوب آتشؔ و ناسخؔ، انیسؔ و دبیرؔ، غالبؔ و ذوقؔ اور دیگر معاصرین کی شاعری اور حالات زندگی کو بھی پیش کرتا ہے۔ اس دور میں شعراء کے درمیان جو مقابلے کی فضا تھی۔ اس کی تصویر کشی اور جزئیات نگاری کا مرقع خوبصورت انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ تبسم کاشمیریؔ کتاب کے مصنف کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''کتاب کے زیر نظر ایڈیشن کو اسی نقطہ نظر کے مطابق جدید تحقیق کی روشنی میں از سرِ نو مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے کتاب کے اصل متن کے ساتھ حواشی دیئے جا رہے ہیں ان حواشی میں نہ صرف سنین و واقعات کی تصیح اصل حقائق کے ساتھ پیش کی گئی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اکثر ادیبوں کے حالات میں نئے مواد کا اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ مکمل طور پر سامنے آسکیں۔ یہ کتاب بنیادی طور پر طالب علموں کے لئے لکھی گئی تھی۔ مرتب نے بھی حواشی ترتیب دیتے وقت اس ضرورت کو سامنے رکھا ہے۔'' (۱۷)

تاریخ کی باقی کتب کی طرح اس کتاب پر بھی اعتراضات ہوئے جو اس عہد کی روایات اور رواج کے متعلق ٹھیک تھے۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو ادبی تاریخ کی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس پر اعتراضات نہ ہوئے ہوں مثلاً پنجاب میں اُردو، دکن میں اُردو، سندھ میں اُردو اوراس کے علاقائی تناظر میں دیکھنے کی کوشش اور لسانی نظریات کسی نہ کسی ردِعمل کے طور پر سامنے آئے۔ رام بابو سکسینہ کی کتاب پر معمولی اغلاط کی نشاندہی اکثر و بیشتر ہوتی رہیں۔

کتاب مذکورہ پر اعتراضات اپنی جگہ لیکن یہ کہنا کہ یہ کتاب تاریخی اصولوں پر پورا نہیں اترتی سراسر غلط ہے۔ آج بھی ادب کا طالب علم اسی کتاب سے استفادہ کر رہا ہے جس طرح آبِ حیات (محمد حسین آزاد)۔ اُردوئے قدیم (حکیم شمس اللہ قادری) اور دیگر چند تواریخ کی اہمیت آج بھی مسلم ہے اسی طرح اس کتاب کی اہمیت بھی اپنی جگہ اہم ہے۔ بعد میں آنے

والی کتب خصوصاً ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخِ ادب اُردو''، ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''اُردو ادب کی تاریخ''، ڈاکٹر انور سدید کی ''اُردو ادب کی مختصر تاریخ'' وغیرہ کی تالیف کے سلسلے میں یقیناً آبِ حیات اور کتابِ مذکورہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔''

۴۔ نمونۂ منثورات (احسن مارہروی)

احسن مارہروی کی کتاب ''نمونہ منثورات'' پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے شائع ہوئی (۱۸) بعد میں اسے جون ۱۹۸۶ء میں طبع نو کے طور پر مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے بھی شائع کیا اُردو زبان کو لسانی اور تاریخی پسِ منظر میں دیکھنے کے لئے یہ کتاب سودمند ہے اس کتاب کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس میں ''نثری نمونے'' بھی دے دیے گئے ہیں جس کی وجہ سے ہر عہد میں ''اُردو اسلوب'' کی نشان دہی ہو جاتی ہے اور اُردو کی ارتقائی صورت حال بھی معروضی صورت میں نظر آتی ہے۔ مصنف نے ''مقدمے'' میں مختلف عنوانات کے تحت اُردو کی تعریف اور تاریخ کو بھی بیان کر دیا ہے۔ مثلاً ۱۔تمہید ۲۔اُردو کی ابتدا نظم سے ہوئی یا نثر سے ۳۔آغازِ زبان ۴۔لفظِ اُردو کی تحقیق اور زبانِ اُردو کی خصوصیت ۵۔اُردو الفاظ کی بنیادیں ۶۔نئی زبان کس طرح بنتی ہے ۷۔زبان کی افزائش ۸۔اُردو بھاشا میں داخل ہوتی ہے ۹۔اُردو کا پہلا مروّج ۱۰۔اُردو نظم کے پہلے نمونے ۱۱۔شمالی ہند میں اُردو زبان کیوں دیر میں مروّج ہوئی ۱۲۔اُردو زبان کا عام اثر ۱۳۔اُردو کی باقاعدہ تدوین ۱۴۔اُردو کے متعدد نام ۱۵۔دیوان اُردو کی ترتیب ۱۶۔نثر اُردو کی تصنیف کا آغاز ۱۷۔ابتدائی اُردو کی کتابوں کے نام ۱۸۔موجودہ اُردو کی ابتدا ۱۹۔عدالتی اور کتابی آسان وسلیس ۲۰۔آسان اور قابلِ تقلید اُردو کے مصلح ۲۱۔نتیجہ کلام ۲۲۔اس کتاب کی حقیقت وغیرہ ان عنوانات کے تحت مصنف نے مختصر مگر جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً ''آغازِ زبان'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> ''ہر زبان کی ابتداء معمولی الفاظ، آسان کاموں اور سہل باتوں سے ہوا کرتی ہے۔ ہندوستان کے قدیمی عہد میں جب کہ سنسکرت زندہ زبان مانی جاتی تھی اور مخصوص اہلِ علم مہاتماؤں کے استعمال میں رہا کرتی تھیں۔ اس وقت صوبجاتِ ہند میں بھاشا کی مختلف شاخیں متعدد ناموں سے مروّج ومشہور تھیں اور ہر وقت بات چیت اور بازار ہاٹ کا کام کاج اسی عام زبان سے پورا کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ مغل بادشاہوں کے زمانے میں جن کی مادری زبان فارسی یا ترکی تھی اور دفتر، خط وکتابت نیز تصنیف وتالیف میں عموماً فارسی ہی کا دور دورا تھا، بازار اور دوسری باتوں کے لئے بھاشا سے ملی جلی ایک ایسی نئی زبان بولی جانے لگی جس میں عربی، فارسی، ترکی اور بعض پُرتگالی وغیرہ الفاظ بھی شامل رہتے تھے یہی وہ آمیختہ زبان تھی جس کو ابتداً شعراء ریختہ اور عام اُدبا اُردو کہا کرتے تھے۔'' (۱۹)

مختصر انداز میں مصنف نے زبان کے آغاز پر روشنی ڈالی ہے وہ صرف ان ہی کا خاصہ ہے۔ اسی طرح ''اُردو کا پہلا مروّج'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''فتح'' غوری کے ۶۰۔۷۰ برس بعد غیاث الدین بلبن کا زمانہ شروع ہوتا ہے اس دربار میں جس قدر علمی ترقیاں اور قدر دانیاں ہوئیں۔ ان کی تفصیل کے لئے تاریخ پڑھنی چاہیے۔ اسی دربار کی سب سے بڑی اور مکمل یادگار حضرت امیر خسرو کی ذات ہے جن کی مسلمہ وقابلیت نے اپنی طبیعت کی خاص رسائی اور لگاؤ سے اُردو کے بکھرے ہوئے موتیوں کی لڑیاں بنانی شروع کیں۔ وہ بیج جو امیر خسرو سے (۸۰) برس پہلے بویا گیا تھا۔ اُبچ اُپچا کر جھاڑ۔ جھنکاڑ کی طرح بے قرینہ پھیلا ہوا تھا ان کی دست کاریوں کے سلیقے نے تمام کوڑا کرکٹ صاف کیا اور اس جھاڑ جھنکاڑ کو ایک خوشنما پودے کی صورت میں زبان کے باغ کی زینت بنایا۔'' (۲۰)

موجودہ ''اُردو کی ابتدا'' کے عنوان سے مصنف لکھتے ہیں:

''مغلیہ خاندان کا لبِ بام آفتاب شاہ عالم اور ٹمٹماتا ہوا چراغِ سحری سراج الدین ابوظفر کا زمانہ ایسا گزرا ہے جس میں خال خال نثر اُردو کی کتابیں تالیف ہونے لگیں تھیں۔ اگر چہ وہ کتابیں نہ شاہی دربار سے منسوب تھیں نہ ان کے حکم ومنشا سے لکھی گئی تھیں (جس کا سبب ان کی برائے نام بادشاہت کی بے اثری تھی) بااین ہمہ چوں کہ قلعہ معلاّئے دہلی میں ان کی محدود حکومت باقی تھی اور عموماً ہندوستان میں ان کا نام و ذکر بادشاہوں کی طرح بخلوصِ نیت زبانوں پر جاری تھا۔ اس لئے ایسی کتابوں کو جو حکومت برطانیہ کے باضابطہ احکام ونظام کے علاوہ شائع ہوئی ہیں، انہیں یادگار سلاطینِ مغلیہ سے منسوب کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ ایسی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں، مگر جس قدر بھی ہو قابل افسوس ہے کہ اکثر حصہ غیر مطبوعہ و نامعلوم ہے اور پرانے خاندانوں میں کہیں کہیں تلاش سے یہ سرمایہ مل جاتا ہے جیسے کہ فضلی کی ''کربل کتھا'' مرزا رفیع سودا کا ترجمہ ''شعلہء عشق'' وغیرہ۔ لیکن یہ سرمایہ بھی گنجِ بادآورد کی طرح افسانہ ہی افسانہ ہے۔ یہی زمانہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومتِ ہند مضبوط اور مستقل ہوئی اور دوسرے ملکی انتظامات کے ساتھ یہاں کی زبان کے لئے بھی ابتدائی اور عارضی توجہ شروع کی گئی۔ انہیں توجہات کا نتیجہ ہے کہ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۵ء میں پریم ساگر للّو جی نے اور چار درویش کا اُردو ترجمہ عطا حسین تحسین نے، اور حکّامِ وقت کے ایما سے میر امن دہلوی، رجب علی سرور اور شیر علی افسوس وغیرہ ہم نے باغ و بہار، آرائشِ محفل اور اخلاقِ محسنی (اُردو) وغیرہ کتابیں ترجمہ و تالیف کیں۔'' (۲۱)

اس کتاب کے بارے میں وہ ''اس کتاب کی حقیقت'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''اس وقت تک جتنی تالیفات اُردو زبان کے متعلق شائع ہو چکی ہیں ان میں کوئی کتاب ایسی نظر نہیں آئی جس میں ایسی تبدیلیوں کا مفصّل و مشّرح بیان کیا گیا ہو پرانی کتابوں میں صرف دریائے لطافت ایک ایسی تصنیف ہے جس میں انشاء اللہ خان نے بعض اسالیب بیان کے نمونے دکھائے ہیں مگر وہ محدود اور مختصر تمثیلات اس خیال کی تکمیل نہیں کر سکتیں جس کی ضرورتیں تاریخی حیثیت سے فی زمانہ محسوس کی جاتی ہیں۔ راقم حروف نے سالہا سال کی محنت و کاوش اور تجسّس و تلاش کے بعد سرمایہ جمع کیا ہے۔'' (۲۲)

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف زبان اور زبان اُردو کے آغاز، ارتقاء اور تاریخ سے خوب واقف ہیں گویا کتاب کے مطالعے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ احسن مارہروی صاحب مطالعہ شخص تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اُردو ادب کے نمونے بھی درج کر دئے ہیں مثلاً ''سب رس'' کا نمونہ نثر ملاحظہ ہو۔

''تمام مصحف کا معنی الحمدللہ میں ہے مستقیم۔ ہور تمام الحمدللہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم۔ ہور تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے یک نقطے میں رکھا ہے کریم۔ سمجھ! دیکھ!!
خاطر لا۔ امثال حدیث بھی یوں ہے کہ:
العلم نقطہء وکثرھا جھال۔'' (۲۳)

نمونہ منثورات اُردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم کتاب ہے جس کے مطالعے سے نہ صرف تاریخ سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ ارتقائی صورتِ حال بھی سامنے آتی ہے۔

۵۔ مختصر ادبِ اُردو (ڈاکٹر اعجاز حسین ایم۔اے۔ڈی لٹ)

ڈاکٹر اعجاز حسین ایم۔اے۔ ڈی لٹ کی کتاب ''مختصر ادبِ اُردو'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں ہندوستان سے شائع ہوا۔ (۲۴) اس ایڈیشن میں عہد اقبال تک کے نثر نگاروں اور شاعروں کا جائزہ لیا گیا تھا پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں اُردو اکیڈمی کراچی کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ (۲۵) اس ایڈیشن میں ۱۹۵۵ء تک ہندوستان اور پاکستان میں تخلیق پانے والے ادب کا جائزہ لیا گیا ۱۹۶۸ء میں اُردو اکیڈمی نے ہی اس کا دوسرا پاکستانی ایڈیشن شائع کیا۔ (۲۶) اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ کتاب مذکورہ بعد مزید ترمیم و اضافہ کے آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی سے بھی شائع ہوئی۔ (۲۷) اس کتاب کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں حصہ نظم اور حصہ نثر الگ الگ پیش کئے گئے ہیں۔ مصنف موصوف الہٰ آباد یونیورسٹی میں طویل عرصہ تک پروفیسر اور صدر شعبہء کے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ کتاب کی اشاعت اور اس کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

''اُردو پڑھتے پڑھاتے وقت اکثر یہ کمی محسوس ہوئی کہ اس زبان میں تاریخ ادب پر کوئی ایسی کتاب نہیں جو اس کی ابتدائے آفرینش سے آج تک کا حال بتا سکے۔ کوئی کتاب امیرؔ و داغؔ کے واقعات تک پہنچتے پہنچتے خاموش ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی چند قدم آگے بڑھتی بھی ہے تو موجودہ دور کے نثر نگاروں کا ذکر کیا ہے شعراء کی اچھی خاصی تعداد پر انفرادی حیثیت سے کوئی تبصرہ وتنقید نہیں پیش کرتی اور شاید ایسی تو اس وقت تک کوئی کتاب ہی نہیں جو تاریخی لحاظ سے نثر نگاری کے سلسلہ میں موجودہ دور کے طرز تحریر وغیرہ پر روشنی ڈال سکے۔'' (۲۸)

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہے مصنف نے تاریخ ادب اُردو کی ایک ایسی کتاب کی کمی کو شدت سے محسوس کیا جو نظم ونثر کے تمام تاریخی حوالے پیش کرے یعنی جو عمومی تاریخ نگاری کے حوالے سے لکھی گئی ہو۔ اپنی خیالات کے پیش نظر مصنف نے کتاب مذکورہ تالیف کی جس میں عام قاری سے لیکر فاضل محققین تک کے ذوق اور جذبات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ کتاب کو نظم اور نثر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

حصہ اوّل اُردو شاعری کے حوالے سے ہے جس کے دس ابواب ہیں جن میں جنوبی ہند، شمالی ہند، اِصلاحِ زبان کے شعراء میر وسودا کا دور، انشاء جرات کا دور، نظیر اکبرآبادی، آتش وناسخ، امیر مینائی وداغ دہلوی، انیس ودبیر عہد، سرسید کی شاعری اور آخر میں علامہ اقبال سمیت عزیز لکھنوی چکبست، حسرت موہانی، صفی لکھنوی، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، مجاز لکھنوی، فیض اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے علمی وادبی قد وقامت کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

حصہ دوم نثری تاریخ کا عکاس ہے جس میں نثر کی تاریخ، فورٹ ولیم کالج سے باہر، علی گڑھ تحریک کی نثر، ناول نگاری، محمد علی جوہر، سید سلیمان ندوی اور عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ کی نثر، روحانی نقاد خصوصاً نیاز فتح پور، آلِ احمد سرور، وقار عظیم وغیرہ، افسانہ نگاری اور فرحت اللہ بیگ سے لیکر شوکت تھانوی کی مزاحیہ نثر پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

اُردو ادب کی تاریخ اتنی سرسری نہیں کہ یہ سیکڑوں صفحات میں سما جائے اس کو مرتب کرنے کے لئے ہزاروں صفحات درکار ہیں اس لئے مصنف نے بھی شاعری اور نثر دونوں میں چند مخصوص شعراء وادباء کو موضوع بنایا ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی ہرگز نہیں کہ کسی اہم شخصیت کو کتاب کا حصہ نہ بنایا گیا ہو۔ اس بات کا اظہار خود مصنف نے یوں کیا ہے:

''زبان سے ادب کی طرف رجوع ہوتے وقت ہمیں دکن کی جو ادبی خدمات نظر آتی ہیں انکا اعتراف نہ کرنا ادبی ناانصافی ہوگی لیکن اس مختصر کتاب میں دکن کے سارے شاعروں اور ادیبوں کا مفصل ذکر بھی قریب قریب غیر ممکن تھا اس لئے ہم نے چند مخصوص شعراء کو لے کر ان کی ادبی خدمات کا مختصر ذکر کیا اس کے بعد اب یہ زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی تبصرہ کے طور پر ان اصناف شاعری کا ذکر کر دیں جن کی دکن میں ترقی ہوئی۔ اُردو میں شروع سے اب تک جن اصناف کا عموماً رواج رہا ہے۔ ان میں غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ زیادہ نمایاں ہیں۔ غزل ایسی چیز ہے جس پر قریب قریب ہر

شاعر نے طبع آزمائی کی۔ قصیدہ کم لوگوں نے کیا۔ مثنویاں کافی تعداد میں لکھی گئیں ۔ مرثیوں کی رفتہ رفتہ کافی ضخامت ہوگی۔'' (۲۹)

مصنف نے ہر دور کے ناموراور کم اہم شعراء کوان کے مقام و مرتبہ کے مطابق موضوع بنایا ہے۔ جنوبی ہند، شمالی ہنداور متاخرین کو ترتیب اور سلیقے سے پیش کیا ہے۔ وہ لائق آفرین ہے خصوصاً شعراء و نثر نگاروں کا تعارف جس انداز سے کیا گیا ہے وہ نہایت ہی اہم ہے۔ نظیرا کبرآبادی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''نظیر ایک قناعت پسند طبیعت لے کر آئے تھے۔ درباروں سے وابستگی نہ تھی۔ ان کا حلقہ احباب وسیع تھااوراس حلقہ میں امیر وغریب، عالم وجاہل، پیشہ وراور غیر پیشہ ور، ہندو مسلمان کسی کی قید نہ تھی۔ اس وسیع النظری اور وسیع المشربی کا اثر ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ نواب سعادت علی خان نے لکھنؤ بلایا تھا نہ گئے اور تقریباً عمر آگرہ ہی میں لالہ بلاس رام کے یہاں معلّمی کر کے شاعری کرتے رہے۔ کلام کا زیادہ حصہ بھی لالہ بلاس رام ہی کے یہاں سے ملا ورنہ نظیر کو خود اس کے جمع کرنے کا خیال نہ تھا۔ ضعیفی میں فالج کے اثر سے انتقال کیا۔'' (۳۰)

حالات و واقعات اور ہندوستانی سیاست کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر مصنف کا قلم بھی جوش میں آجاتا ہے۔ ادبی انقلاب کی بات کو وہ بھی پر تاثیر انداز میں بیان کرتے ہیں۔ جنگ آزادی کے بعد ادبی اور سیاسی انقلاب کو لکھنے کا انداز دیکھیے:

''غدر کے ہنگامے کے بعد نہ صرف ہندوستان کی سیاسی ومعاشرتی زندگی پر اثر پڑا بلکہ علمی وادبی دنیا میں بھی انقلاب عظیم ہوا۔ انگریزی زبان سے روشناس ہوتے ہی اس کے گوناگوں اصناف شاعری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا ڈراما، مناظر اور مختلف عنوان کی کارآمد نظموں کی ابتداء ہوئی۔'' (۳۱)

فاضل مصنف نے تاریخ کو تنقید اور تحقیق کے ساتھ یوں پیش کیا ہے کہ ان کی بات حوالہ جاتی بن جاتی ہے۔ مصنف اپنی بات تحقیق اور تنقید کی روشنی میں کرتے ہیں۔ مثلاً فسانہ آزاد کا ذکر کرتے ہوئے اس کے جملہ اوصاف کو بیان کرنے کے بعد یہ رائے قائم کرنا کہ فسانہ آزاد کے بعد داستان میں غیر فطری عناصر خود بخود کم ہوتے گئے اور حقیقتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ناول نگاری کا آغاز ہوگیا۔ یہ بہت بڑی بات ہے کیوں کہ مصنف نے شرؔر اور سرشار کا اعتراف کرتے ہوئے ناول کے آغاز کا محرک اور سبب انہیں قرار دیا۔ شرؔر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شرؔر نے اسلامی تاریخ کی طرف زیادہ توجہ کی اور ناول نگار کے فن کو اُردو میں ترقی دینے کی کامیاب کوشش کی۔ کیرکٹر و پلاٹ کو اوروں سے زیادہ اچھا نباہا۔ انہوں نے اس فن میں متانت اور سنجیدگی قائم کر کے ابتذال اور ہرزہ گوئی سے ناول نگاری کو بچالیا۔ اسلامی تاریخ عربی اور فارسی میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو بھولی جاتی تھی شرر نے از سرِنو اپنے ناولوں کی وجہ سے پھر دنیا کے سامنے زندہ

کر کے پیش کیا جس کی وجہ سے اسلاف کے کارنامے نظروں کے سامنے آ گئے دلوں میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے جوش عقیدت کے ساتھ خاص خاص اسلامی مقام اور اشخاص کو نہایت بلند کر کے دکھایا جسکی وجہ سے ان کا نام اُردو کے ناول نگاروں میں زیادہ بلند نظر آتا ہے۔'' (۳۲)

اسی طرح سرشارؔ کے متعلق کہتے ہیں:

''بیاں شگفتگی، زبان میں پاکیزگی طرز ادا میں سلاست، آمد میں جوش محاورہ میں صفائی، روزمرہ میں لطافت لکھنؤ کی مٹی ہوئی حالت تہذیب، طرز معاشرت، زبان، سلیقہ، علوہمتی، شرافت سوسائٹی کی پوری کیفیت کا نقشہ ان کی تحریر میں اس طرح پایا جاتا ہے جیسے آئینے کے اندر تصویر عیوب کا بھی اپنے ظریفانہ طریقہ پر بیان کرتے ہیں کہ سچی تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے ---------
بول چال میں وہ اپنے ناول کے گوشہ گوشہ کو روشن کر دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جو جس طریقے کا کیرکٹر ہوتا ہے ویسے ہی الفاظ اس کے اظہار خیالات کے لیے لاتے ہیں۔'' (۳۳)

ڈاکٹر اعجاز حسین کا یہ کارنامہ ادبی خزانے کو سمجھنے کے لئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے وہ ایک عرصہ تک الہٰ آباد یونیورسٹی کے شعبہء اُردو سے منسلک رہے۔ ان کی کتاب تواریخ ادب اُردو میں ایک اہم اضافہ اور تسلسل ہے۔ ڈاکٹر موصوف کا اسلوب سادہ اور تحقیقی اور تنقیدی بھی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کتاب تواریخ کی اہم کتب میں شامل ہے۔

۶۔ داستانِ تاریخ اُردو (حامد حسن قادری)

حامد حسن قادری کی تصنیف ''داستانِ تاریخ اُردو'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں اور دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں آیا بعد کی تمام اشاعتیں نظر شدہ ایڈیشن پر مبنی ہیں اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں یہ کتاب بک کارنر جہلم پاکستان سے بھی شائع ہوئی۔ (۳۴) کتاب کی بار بار اشاعت ہی اس کی شہرت کا بین ثبوت ہے۔ مصنف ''داستان تاریخ اُردو'' اُردو کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:

''بہر حال میں نے ''داستانِ تاریخ اُردو'' میں اس کمی کو پورا کرنا چاہا ہے، تاریخ وارتقائے اُردو کے ساتھ ہر دور کے تمام مشاہیر ادب اور بعض غیر مشہور لیکن ممتاز مصنفوں کے حالات اور ان کی تحریروں کے نمونے درج کئے ہیں اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے۔'' (۳۵)

کتاب کا اہم موضوع ''اُردو نثر کی مفصل تاریخ'' ہے تاہم پہلا باب سیاست، زبان، تصوف اور تبلیغ اسلام سے متعلق ہے۔ مصنف نے اُردو نثر کے چھ مختلف ادوار بیان کئے ہیں جو ابتداء سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک کا احاطہ

کرتے ہیں۔ پہلا باب ان ادوار سے متعلق ہے اس میں اُردو کے ابتدائی نمونے محمد غوری کے حملوں اور اُردو پر اولیاء اللہ کے فیضان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اولیاء اللہ کا حوالہ مختصر مگر جامع الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت خواجہ معین الدین اجمیری، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت بابا فرید شکر گنجؒ، حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ پانی پتی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت امیر خسروؒ، حضرت مخدوم علاؤ الدینؒ علی احمد صابر کلیریؒ، حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ کی اُردو زبان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اُردو کی پہلی نثری تصنیف تقریباً ہر مصنف کا موضوع رہی ہے حامد حسن قادری نے بھی اس بحث کو چھیڑا ہے انہوں نے حضرت خواجہ سید شرف الدین جہانگیر سمنانی کے رسالے کو اُردو میں سب سے پہلی نثری تصنیف قرار دیا ہے۔ پہلے باب کے موضوعات زیادہ ہیں۔ یعنی نثری ارتقاء کے علاوہ دکن، گجرات، شمالی ہند شاعری کا قدیم دور وغیرہ پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ پہلے ایڈیشن میں اس باب کو کم صفحات پر رقم کیا گیا تھا لیکن نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن میں مصنف نے اسے تفصیلاً بیان کیا ہے۔ کتاب کی شہرت کا خود مصنف کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس لئے تاریخ کے تقاضے پورے کرتے رہے لیکن جب کتاب کی مانگ بڑھی تو منصوبہ بندی کے تحت کتاب کی نئی شیرازہ بندی کرنا پڑی۔ لکھتے ہیں:

> ''داستانِ تاریخِ اُردو پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ چھپتے ہی میں نے بہت سے ادیبوں، نقادوں، پروفیسروں اور ایڈیٹروں کو کتاب بھجوائی۔ سب سے پہلے ۳۱ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے دہلی سے ریڈیو پر اس کے متعلق تقریر کی۔ پھر دہلی، لکھنؤ، حیدر آباد دکن سے دوسرے نقادوں نے بھی ریڈیو پر تبصرہ کیا۔ بعض نے مجھے خطوط میں رائیں لکھیں، بعض نے رسائل میں ریویو شائع کرائے۔ چند مہینوں میں کتاب کی اتنی شہرت اور اتنی قدر ہوئی کہ مجھے اس کا تصور بھی نہ تھا۔'' (۳۶)

کتاب زمانی ترتیب سے لکھی گئی ہے۔ کتاب کا موضوع اُردو نثر ہے۔ نثری تاریخ میں کہیں کہیں واقعات کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ پہلا دور دکن میں اُردو، دوسرا دور شمالی ہند میں اُردو تیسرا دور فورٹ ولیم کالج کی نثر، چوتھا دور مرزا غالب کے خطوط، پانچواں دور علی گڑھ تحریک کی نثر جبکہ چھٹا دور علی گڑھ تحریک کے سرکردہ رہنماؤں کی نثری تصانیف کا عکاس ہے۔ دکنی ادب کی اُردو نثر کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> ''شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر نے ۱۶۸۶ء میں بیجا پور اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ پر حملہ کیا اور تمام دکن میں مغلیہ سلطنت قائم کردی اس زمانے میں بھی دکن میں اُردو کی ترقی اور تصانیف نظم، نثر کا سلسلہ جاری رہا لیکن ہر عہد میں نثر کی تصنیف نظم کے مقابلے میں بہت کم ہوئی۔'' (۳۷)

دکنی نثر کے دور میں مصنف نے عادل شاہی، بہمنی، قطب شاہی مغلیہ دکنی دور کے مختلف نثر نگاروں کا تعارف کرایا ہے۔ سید اشرف جہانگیری، افضل جھنجھانوی، خواجہ بندہ نواز، شاہ میراں جی، سید برہان الدین جانم، مولانا عبداللہ، ملا وجہی اور

سید شاہ میر کے نثری کارناموں کو بیان کیا گیا ہے جبکہ شمالی ہند کے فضل علی فضلی، شاہ رفیع الدین، عطا حسین تحسین وغیرہ کی نثری خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اس کے بعد شمالی ہند کے عہد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس دور میں مستشرقین کی آمد بھی ہوئی تھی۔ جنہوں نے اُردو ونثر میں بہت کام کیا تھا۔ مصنف لکھتے ہیں:

''اہل یورپ میں اُردو زبان پر سب سے بڑا احسان ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کا ہے انہوں نے ۱۷۸۷ء سے اُردو کی خدمت شروع کی اور بیس برس تک اُردو زبان میں اور اُردو کے متعلق انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسہ جاری رکھا۔'' (۳۸)

فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں اُردو نثر کا تیسرا دور فورٹ ولیم کالج کی نثر کو کہا ہے۔ آغاز میں کالج کے قیام اور اُردو کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین خصوصاً میر امن دہلوی، سید حیدر بخش حیدری، جان گل کرائسٹ، شیر علی افسوس، مرزا علی لطف، بہادر علی حسینی، مظہر علی ولا، مرزا کاظم علی جوان، مولوی امانت علی شہدا، شیخ حفیظ الدین، نہال چند لاہوری، للّو لال جی اور مرزا جان عیش کی نثری خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنفین کے سوانح شخصیت اور کتابوں پر الگ الگ بحث کی گئی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے نثری دور میں جو نثر نگار اس کالج سے وابستہ نہیں تھے۔ ان پر مصنفین بیرون کالج کے عنوان سے بحث کی گئی ہے۔

مصنف نے آخر میں ساری وضاحت بھی کر دی ہے۔ اُردو نثر کی ترقی میں مرزا غالب کے خطوط کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ جس دور میں مرزا غالب اپنے دوستوں کے خطوط لکھ رہے تھے اس وقت چند دیگر نثر نگار مثلاً فقیر محمد گویا، مولوی قطب الدین دہلوی، مفتی سعد اللہ رام پوری اور دیگر کئی نثر نگار اپنی نثری تصانیف لکھنے میں مصروف تھے۔ مصنف نے مکاتیب غالب کے ساتھ ساتھ اس دور کے دیگر نثر نگاروں کا بھی جائزہ لیا ہے۔

مکاتیبِ غالب کے ساتھ ہی علی گڑھ تحریک کا آغاز ہوا۔ اس دور میں سر سید احمد خان کی ادبی خدمات کے علاوہ ان شخصیات کا تعارف بھی دیا گیا ہے جو کتاب مذکورہ کی تالیف سے قبل غیر معروف تھیں۔ مصنف نے پہلی بار ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب میں اُردو نثر نگاروں کی ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مصنفین کی کتب کا نام تبصرے اور عہد بہ عہد ترقی کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تحقیق اور تنقید کے لئے بھی ایک اہم کتاب ہے جس میں آغاز اُردو سے تحریک علی گڑھ اور اس کے بعد کچھ اہم مصنفین کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

۷۔ تاریخ زبان اُردو (ڈاکٹر مسعود حسین خان)

ڈاکٹر مسعود حسین خان کی کتاب ''تاریخ زبان اُردو'' ایک منفرد کتاب ہے۔ پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں طبع ہوا۔ مصنف موصوف جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں صدر شعبہء اُردو کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس کتاب میں اُردو کے عہد بہ عہد ارتقاء کی تاریخ اور اس کی ابتداء کے متعلق لسانیاتی نظریوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ''جوں جوں اُردو زبان کا ڈول اور کینڈا متعین ہوگیا اس کی ابتداء اور ارتقاء کے متعلق سوالات بھی ذہن میں پیدا ہونے لگے۔ علم اللسان سے ناواقف لوگوں کے نزدیک یہ ایک کھچڑی زبان تھی جو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے میل سے پیدا ہوئی تھی۔ جسے کبھی شاھجہانی لشکر سے منسوب کیا جاتا تھا اور کبھی اکبر کے سنہرے عہد سے اُردو کی ابتداء کا یہ نظریہ بہت زیادہ تشفی بخش نہ تھا۔ ارتقاء کا وہ تصور جس پر آج فکر انسانی کی بنیادیں قائم ہیں لسانیاتی دنیا میں بھی کارفرما ہے چنانچہ زبان جاننے والوں نے فوراً پہچان لیا کہ کھچڑی زبان کی تہہ میں کونسی بولی ہے اس کا سہرا اُردو میں آزاد کے سر ہے جنہوں نے پہلی بار اُردو زبان کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی۔'' (۳۹)

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہے مصنف نے تاریخ زبان اُردو کی ایک ایسی کتاب کی کمی کو شدت سے محسوس کیا ہے کیونکہ مصنف کے نزدیک زبان، سماج کا نسبتاً دیرپا ادارہ ہوتی ہے اور کوئی انقلاب چاہے وہ جمہوری ہو یا اشتراکی محض اس کی اوپری پرت پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ مصنف نے کتاب میں ہندوستان کی آریائی زبانوں کی مختصر تاریخ کے علاوہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں، اُردو کے اُرتقاء کا تحقیقی مواد، تنقید (لسانیاتی نظریوں کی) اور تشکیل (اُردو کی ابتداء کے بارے میں نئے نظریے کا خاکہ) بھی پیش کیا ہے۔ مصنف کی کتاب مذکورہ میں عام قاری سے لے کر فاضل محققین تک ذوق اور جذبات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ کتاب میں ہند آریائی زبان کے لسانی تسلسل کی نشاندہی ۱۰۰۰ء تک کی گئی ہے۔ اُردو کے ارتقاء کا تحقیقی مواد میں اگلے چھ سو سال (۱۱۰۰ء تا ۱۷۰۰ء) کے لسانی ارتقاء کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اس عرصہ میں زبان نے جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں اس کا کھلا ہوا ثبوت اُردو کا قدیم و جدید ادب ہے۔ ہندوستان کی زبانوں میں جو اہمیت آج اُردو کو حاصل ہے وہ محض اتفاقی نہیں بلکہ یہ سینکڑوں سال کی تمدنی اور سیاسی تحریکات کا لازمی نتیجہ ہے۔'' (۴۰)

مصنف موصوف مختلف زبانوں میں اُردو کو اہمیت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سینکڑوں سال کی تمدنی اور سیاسی تحریکات کا نتیجہ ہیں کتاب مذکورہ اپنی نوعیت کی منفرد اور اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کیں ہیں۔ جو قارئین کے لئے معلومات کا بہترین ذریعہ ہیں۔

۸۔ اُردو ادب (ڈاکٹر سید عبداللہ)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب ''اُردو ادب ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۶ء تک کے تقریباً سو سالہ ادب کی تاریخ ہے اس کی طبع اول ستمبر ۱۹۶۷ء مکتبہ خیاباں ادب چمبر لین روڈ لاہور سے شائع ہوئی۔(۴۱) ڈاکٹر وحید قریشی ''اُردو ادب'' کے حوالے سے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''سنہ ستاون اُردو ادب کی تاریخ میں ایک انقلاب آفرین موڑ شمار کیا جاتا تھا اگر چہ مغربی اثرات اور نئے طرز احساس کی پرچھائیاں اس سے کچھ پہلے اُردو ادب پر نظر آنے لگی تھیں لیکن اس سیاسی پیکار کے بعد ان کے نقوش کچھ زیادہ گہرے ہونے لگے۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے نئے حالات کے ساتھ مفاہمت کا درس دیا۔۔۔۔۔انہوں نے زندگی کے علاوہ ادب میں بھی ایک ٹھراؤ کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ قدیم ادب اسی قدیم زندگی کا ترجمان تھا جب زندگی میں ٹھراؤ پیدا ہو جائے تو ادب جو زندگی کا عکاس ہے اس کے موضوعات اور فنکاروں کے فنی ذرائع دونوں میں تصنع کا عمل ظاہر ہوتا ہے۔'' (۴۲)

کتاب مذکورہ کے تین ابواب ہیں جو اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں فہرست ابواب یوں ہے:

پہلا باب: ۱۸۵۷ء سے جنگ عظیم اوّل تک کا ہے جس میں سرسید و رفقائے سرسید، شعراء، دبستان سرسید کا نثری سرمایہ، رفقاء کی عمومی بحث، حلقہ سرسید سے باہر کا ادب، شاعری، نثر، ناول، ڈراما کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

دوسرا باب: جنگِ عظیم (اوّل) کے بعد ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۶ء تک ہے جس میں مذہب، علم الکلام اور سیاست، تاریخ، اُردو زبان کی تاریخ اور ادبی تنقید شاعری، ڈرامہ، طنز و ظرافت اور ناول اور افسانہ شامل ہیں۔ مصنف اُردو زبان کی تاریخ اور ادبی تنقید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اس دور کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں اُردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء کے متعلق خاصی تحقیق ہوئی۔ جنگ عظیم سے پہلے تاریخ ادب کے موضوع پر ہمارا کل سرمایہ ''آبِ حیات'' (آزاد) یا چند متفرق رسالوں تک محدود تھا ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان چند کتابیں اور بھی شائع ہوئیں غالباً شعر العجم کے تخیل سے متاثر ہو کر دار المصنفین نے سب سے پہلے گل رعنا اور شعر الہند شائع کی اوّل الذکر مولانا عبدالحی کی اور دوسری مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیف ہے۔'' (۴۳)

تیسرا باب: اُردو ادب ۱۹۳۶ء سے اب تک ہے جس میں اصناف شعر، نظم اور آزاد نظم، گیت، غزل، افسانہ ناول، ڈراما، تنقید، تاریخ سوانح، دینی ادب اور افکار کے متعلق ہے۔

دوسری زبانوں کی طرح اُردو کا پہلا ادبی سرمایہ شاعری کی صورت میں سامنے آیا شاعری کے باقاعدہ آغاز کے تقریباً دوسال بعد اُردو نثر کے قابلِ ذکر کتب ورسائل منصۂ شہود پر آئے۔ تیسرے باب کے تعارف میں لکھتے ہے:

اس باب کے تین حصے کئے جاسکتے ہیں۔۔۔۔۔لیکن چونکہ اس کے بڑے بڑے مصنف ایک دور سے گزر کر دوسرے دور میں کام کرتے دکھائی دیتے ہیں تحریکیں اور رجحانات بھی گڈ مڈ ایک دور سے نکل کر دوسرے دور میں جا پہنچتے ہیں اس لئے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۶ء تک کے زمانے کو ایک ہی دور قرار دے دیا گیا ہے اور بحث غالب رجحانات، تحریکات اور اصناف کے اعتبار سے کی جارہی ہے۔'' (۴۴)

مصنف موصوف نے کتاب میں صرف ادبی تحریکوں کا تنقیدی اور تجزیاتی جائزہ لیا گیا ہے اور ادیبوں اور شاعروں کے سوانح لکھنے سے گریز کیا ہے البتہ جہاں جہاں ممکن ہوا ہے شاعروں اور ادیبوں کی تاریخ پیدائش اور وفات درج کی گئی ہیں۔ مصنف موصوف نے کتاب مذکورہ میں تاریخ نگاری کا معلمانہ انداز اختیار کیا ہے جو کہ قاری کے مطالعے میں مفید ہے۔

۹۔ آج کا اُردو ادب (ڈاکٹر ابواللیث صدّیقی)

ڈاکٹر ابواللیث صدّیقی کی کتاب'' آج کا اُردو ادب'' پہلی بار ۱۹۷۰ء میں فیروز سنز لمیٹڈ لاہور کے توسط سے شائع ہوئی۔ (۴۵) اس کتاب میں اصنافِ ادب کے حوالے سے تاریخ ادبِ اُردو کا اجمالاً جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے آٹھ ابواب ہیں جو مندرجہ ذیل عنوان کے تحت شائع ہوئے:

۱۔	سیاسی اور سماجی پس منظر	۲۔	جدید اُردو شاعری
۳۔	جدید اُردو ناول	۴۔	اُردو افسانہ
۵۔	جدید اُردو ڈرامہ	۶۔	اُردو میں جدید تنقید
۷۔	جدید اُردو ادب میں طنز ومزاح	۸۔	مضامین ومقالات

ڈاکٹر ابواللیث صدّیقی نے اس کتاب کا دیباچہ یا مقدمہ تحریر نہیں کیا۔ براہِ راست پہلا باب شروع ہو جاتا ہے۔ پہلا باب بہت ہی سیر حاصل ہے جس میں ان حالات وواقعات کو بیان کیا ہے جو اُردو ادب کی تخلیق کا باعث ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''غرض جدید اُردو ادب کا سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی پس منظر خاصا وسیع ہے۔ مذہب، سیاست، تعلیم، رسوم ورواج سب نے ملکر اسے موضوعات اور اسالیب کی وسعت بخشی ہے۔'' (۴۶)

۱۸۵۷ء اور اس کے بعد وہ واقعات جن کا تعلق سماجیات، اور معاشرت سے ہے تفصیلاً بیان کئے گئے ہیں۔ اُردو

ادب نئے حالات میں جدّت کی طرف آیا اور سماجی کرب، تہذیبی تبدیلی نے اُردو ادب کو جدید اصناف اور نئے موضوعات سے آشنا کیا اس کتاب میں اُردو ادب کے اس دور کے موضوعات کو اجاگر کیا گیا جو برصغیر پاک و ہند میں تبدیلی کا دور ہے۔ کتاب کا دوسرا باب ''جدید اُردو شاعری'' ہے جس میں مصنف نے ''انجمنِ پنجاب'' سے جدید شاعری کے آغاز کی بات کی ہے۔ اس باب میں مصنف نے تفصیلاً جدید اُردو شاعری پر تبصرہ و تجزیہ کیا ہے۔ مصنف اس سلسلے میں کہتے ہیں:

''آج کی اُردو غزل ایک طرف میر و غالبؔ، حسرتؔ، اصغرؔ و فانیؔ اور جگرؔ کی ہمنوا ہے تو دوسری طرف اس میں عہد جدید کے تقاضوں کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے۔ اس پوری شاعری میں بلاشبہ ایک عدم اطمینان اور بے چینی کی رو ملتی ہے جو کبھی کبھی گھٹن میں بدل جاتی ہے یہ کیفیت معاشرہ کے حالات سے بے اطمینانی نے پیدا کی ہے، اس معاشرہ کی اصلاح کی راہ اسی بے اطمینانی سے پیدا ہوگی اور اس امید کی جھلک آج کی اُردو شاعری میں ملتی ہے۔'' (۴۷)

یہ باب بہت طویل ہے اس میں انجمن پنجاب ۱۸۶۸ء سے لے کر ن،م، راشد میراں جی تک اہم شعرا کا جائزہ لیا گیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس باب کے مطالعے کے بعد ۱۸۶۸ء سے عصرِ حاضر تک جدید شاعری کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

کتاب کا تیسرا، چوتھا اور پانچواں باب افسانوی ادب کا احاطہ کرتا ہے۔ پہلے ناول پھر افسانہ اور آخر میں ڈرامہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان ابواب کے مطالعے سے بھی نثر کی جدید اصنافِ ادب کا علم ہوتا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

''نذیر احمد سے اب تک اُردو ناول نے جو ترقی کی ہے اور اس میں جو فنی نکھار پیدا ہوا ہے اس کی تلاش یا مطالبہ نذیر احمد کے یہاں زیادتی ہے۔ ان کے سامنے اُردو میں کوئی ایسا نثری قصہ نہ تھا جو ان کی رہبری کرتا یا جس کی اصلاح سے ہی انہیں اپنا راستہ تلاش کرنے میں آسانی ہوتی۔'' (۴۸)

جب کہ اُردو افسانہ کی بابت تحریر کرتے ہیں:

''اُردو میں افسانے کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا اور پریم چند اُن فنکاروں میں ہیں جنہوں نے ناول کے ساتھ افسانے کے فن پر بھی توجہ کی۔ پریم چند کے ابتدائی دور کے افسانوں میں دو موضوعات خاص طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب، اس کی روایات اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا ابلاغ ان کا پہلا موضوع ہے۔ ان افسانوں میں بقول سید وقار عظیم ماضی کی عظمت اور اس کی روحانی صفات کی محبت ملتی ہے۔'' (۴۹)

اُردو افسانے میں پریم چند کو اولیت حاصل ہے مصنف نے پریم چند سے لے کر عبداللہ حسین تک کا جائزہ لیا ہے۔ اس باب کے مطالعے سے بھی افسانوی ادب کی جدید صورت حال سامنے آتی ہے۔ جدید ڈرامے کے سلسلے میں مصنف لکھتے ہیں:

''اسٹیج کا ڈرامہ ان موانع کے باعث جو فلم سازی کی صنعت نے اس کے راستے میں حائل کر دئے

ہیں۔پچھلے بیس برس کے دوران ترقی معکوس کرتے کرتے اب قریب قریب ناپید ہو چلا ہے۔ جہاں تک فن تمثیل کا تعلق ہے، اسٹیج ایک بھولی ہوئی کہانی اور اسٹیج کے ایکٹر محض طاق نسیاں کی آرائش ہیں۔ شاید اس روئداد کو پڑھ کر فن کے کسی صاحب درد اور پر جوش سر پرست کے دل میں ازسرِ نو امنگ پیدا ہو جائے اور وہ اسٹیج کے تختوں کو نہاں خانہ عدم سے نکال کر کھڑا کر دے اور اسٹیج کو پھر وہی چھوٹی سی دنیا بنادے جس کی وقعت اور اہمیت سے متاثر ہو کر شیکسپیئر نے اس کائنات کو جسے ہم دنیا کہتے ہیں اسٹیج کے نام سے تعبیر کیا تھا۔'' (۵۰)

بابِ ششم اُردو میں جدید تنقید، ہفتم جدید اُردو ادب میں (طنز و مزاح) اور آخری مضامین و مقالات پر مشتمل ہے جو اپنی اہمیت وافادیت لئے ہوئے ہیں۔ان کا مطالعہ تنقید، مزاح اور تحقیق و مضمون نگاری کو واضح کر دیتا ہے۔مصنفف کہتے ہیں:

''اُردو میں تنقیدی ادب آج ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور عام طور پر ادبی رسالوں، مجلوں، مقالوں اور مضامین کی صورت میں جدید و قدیم شعراء و مصنفین، ادبی اصناف، شاعری اور دیگر اصناف ادب کی تکنیک اور ہئیت، ادبی اقدار، شاعری اور شعراء کے مسائل، روایت اور تجزیئے کے تعلق، ادب میں آفاقیت کے تصور، ادب اور ابلاغ کا مسئلہ اور اسی قسم کے موضوعات پر تنقیدی تحریریں شائع ہو رہی ہیں۔'' (۵۱)

جب کہ مزاحیہ ادب پہ تحریر کرتے ہیں:

''اُردو میں طنز و مزاح کے دور جدید کا آغاز اودھ پنچ سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اُردو شاعری میں ہجویات، شہر آشوبوں اور بعض دوسری نظموں میں طنز و مزاح، ظرافت اور ہجو سے لے کر گالی گلوچ اور پھکڑ بازی تک کے نمونے ملتے ہیں۔'' (۵۲)

کتاب کا آخری باب مضامین اور مقالات پر مشتمل ہے اس باب میں تہذیب الاخلاق، مضامین حالی، شبلی کے مضامین وغیرہ شامل ہیں اس سلسلے میں مصنف لکھتے ہیں:

''اُردو میں ہر قسم کے مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ تاریخی، تحقیقی، علمی تنقیدی، تشریحی، سیاسی، سماجی، سائنسی، غرض شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر توجہ نہ ہو، ان مضامین سے اُردو کی وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اُردو کے مضمون نگاروں کی صلاحیت کا بھی آج بھی اُردو میں ان مضامین کی صورت میں اتنے افکار و خیالات قلمبند ہو رہے ہیں۔ جس کی مثال بھارت اور پاکستان کی کسی دوسری زبان میں ہی کیا دنیا کی بعض اور بڑی اور اہم زبانوں میں بھی مشکل سے ملے گی اُردو کے حق میں اسے ایک نیک فال سمجھنا چاہیئے۔'' (۵۳)

یہ کتاب انفرادیت کی حامل ہے کیونکہ مصنف موصوف نے اصناف ادب کے حوالے سے تاریخ ادب اُردو کا اجمالاً

جائزہ لیا ہے۔ جو کہ اہمیت کا حامل ہے۔

۱۰۔ اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (ڈاکٹر سلیم اختر)

تواریخ ادبیات اُردو میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جو ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے مقابلے میں شائع ہوئی، یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی اور اب تک اس کے انیس ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔(۵۴) اس حوالے سے خود مصنف کا بیان ملاحظہ کیجئے:

> ''جب اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ پہلی مرتبہ ۱۹۷۱ء میں طبع ہوئی تو یہ توقع نہ تھی کہ یہ مقبول اور متنازعہ ثابت ہوگی۔ اب تک اس کے انیس ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ فروخت اور تحسینی آراء جہاں میرے لیے باعثِ اعزاز ہیں وہاں اس امر کی مظہر بھی کہ ادب کے اساتذہ طلبہ اور عام قارئین کے لئے ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو انہیں ''کیپسول'' میں اُردو زبان اور ادب کے بارے میں ضروری معلومات، اساسی کوائف اور موزوں آراء فراہم کر دے۔'' (۵۵)

کتاب جب پہلی بار شائع ہوئی تو ضخامت اور ابواب بندی کے لحاظ سے موجودہ ایڈیشن سے بہت مختلف تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ مصنف کے ہاتھوں ترمیم و اضافے کے مراحل سے گزرتی رہی جس کے نتیجے میں اب یہ مختصر ترین نہیں بلکہ ضخیم سے ضخیم ترین کتاب ہے مصنف لکھتے ہیں:

> ''موجودہ ضخامت کی بنا پر اب یہ ''مختصر ترین'' نہیں رہی مگر کیا کیا جائے ''اسی مختصر ترین'' کی خاطر تو میں نے طعنے اور میہنے سنے اور گالیاں کھائیں۔ یوں کہ اب یہ مختصر ترین ہی میری پہچان ہے لہٰذا طویل ہونے کے باوجود بھی یہ تاریخ ''مختصر ترین'' ہی رہے گی۔'' (۵۶)

کتاب کا پہلا باب طاؤس و تخت اور تخلیق کے عنوان سے ہے جس کے مختلف ذیلی عنوانات میں اس باب میں اُردو اور عالمی ادب کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ خصوصاً داستان اور پرانے ادبی دور کے موضوع بنا کر تاریخ ادب کے آغاز کے لیے راستہ بنایا گیا ہے۔ مصنف نے بڑی کامیابی کے ساتھ یہ فریضہ سرانجام دیا ہے۔

اُردو ہے جس کا نام'' دوسرے باب کا نام ہے جس میں مختلف ذیلی عنوانات دیئے گئے ہیں۔ ضرورت کے مطابق حوالہ جات کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً نثر کی پہلی تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ویسے محققین میں اس امر پر بھی اختلاف رائے ملتا ہے کہ سب سے پہلی نثری تصنیف کس کی ہے۔ محمد حسین آزاد (آبِ حیات) اور بعد ازاں ان کی پیروی میں محمد یحیٰ تنہا (سیر المصنفین) اور عبدالحی (گل رعنا) نے فضلی کی ''دہ مجلس'' یا ''کربل کتھا'' کو اُردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا۔ فضلی محمد

شاہ کے عہد (۱۱۴۵ء) میں تھا ان کے بعد مولوی عبدالحق اوران کے ہم نوائی پروفیسر احسن مارہروی (منثورات) نے خواجہ بندہ نواز (وفات ۸۲۵ھ کی ''معراج العاشقین'' کو پہلی نثری تالیف ثابت کیا۔'' (۵۷)

متذکرہ بالا باب میں پہلی نثری تصنیف کے علاوہ اُردو ہندی رسم الخط، ریختہ، امیر خسرو، اُردوئے معلّیٰ، اُردو کے علاقائی نام اور مزید ابتدائی معلومات دی گئی ہیں اُردو زبان کے آغاز وارتقاء کے حوالے سے تفصیلی معلومات باقاعدہ حوالہ جات کے ساتھ اگلے باب میں درج کی گئی ہیں۔

علاقائی تناظر میں اُردو کی پرورش مختلف علاقوں خصوصاً پنجاب، سندھ، دکن، بنگال وغیرہ سے ظاہر کی گئی ہے۔اس کے علاوہ ''اصلاح زبان'' کے سلسلے باقاعدہ الگ باب میں معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں جبکہ ادب کی ابتدائی اصناف مثلاً ڈرامہ، مثنوی، قطعہ، شہرِ آشوب، رباعی، دوہا، گیت اور قصیدہ وغیرہ کے آغاز وارتقاء پر بحث کی گئی ہے۔مصنف لکھتے ہیں:

''اگرچہ ثقافتی لین دین کے باعث ایک ملک یا زبان کی اصناف دوسرے ملک اور زبان میں جگہ پا سکتی ہیں لیکن کسی صنف کی مقبولیت کا انحصار اس بات پر ہوگا کے وہ اس ملک اور زبان کے قارئین کے جذباتی اور جمالیاتی تقاضوں کی کس حد تک تسکین کرتی ہے۔ جب تک یہ تقاضے پورے نہ ہوں صنف کبھی بھی عوام پسند نہ بن سکے گی۔تخلیق کاروں کی انفرادی پسند و نہ پسند بحیثیت مجموعی عوام کی پسند و نہ پسند کے معیاروں کی تشکیل کرتی ہے۔'' (۵۸)

مصنف موصوف کے نزدیک کوئی بھی صنف اس وقت مقبول ہوسکتی ہے جب وہ اس ملک اور زبان کے قارئین کے جذباتی اور جمالیاتی تقاضوں کی کسی حد تک تسکین کرئے گی۔ اصناف کے حوالے سے مصنف مزید لکھتے ہیں:

''آج جن اصنافِ ادب کو تخلیقی مقاصد کے لئے بروئے کار لایا جا رہا ہے ان میں سے بیشتر خارجی اثرات کی مرہونِ منت ہیں۔مثلاً شاعری کی جملہ اصناف جیسے غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعہ، شہرِ آشوب۔'' (۵۹)

زبان اور اسکی ابتدائی اصناف پر بحث کرنے کے بعد فاضل مصنف نے مختلف ابواب میں بالترتیب جنوبی ہند شمالی اور لکھنؤ کا دبستانِ شاعری کے سلسلے میں اُردو غزل کے آغاز وارتقاء پر خصوصی توجہ دی ہے۔وہ بیک وقت اُردو کے ان تین مراکز کی لسانی وادبی خدمات کی تفصیل مہیا کرتے ہیں مثال کے طور پر لکھنؤ کو علم وادب کا مرکز قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگرچہ لکھنؤ کے نوابان کی عیاشی کے افسانوں نے تمام نوابوں اور لکھنؤ کا تناظر مسخ کر کے رکھ دیا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کے لحاظ سے حکمرانوں نے صحیح معنوں میں لکھنؤ کو مرکز علم وادب بنانے کی قابلِ قدر کوششیں کیں چنانچہ مدرسوں، خانقاہوں، امام باڑوں اور قطب خانوں کی تعمیر و تزئین کے ساتھ ساتھ جدید ایجادات سے بھی استفادہ کیا گیا۔'' (۶۰)

دبستانِ دہلی کو بھی جامع انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے شاعرانہ شب و روز کو فاضل مصنف نے اس طرح بیان کیا ہے:

''جہاں تک اس عہدِ انحطاط میں ادبی صورتحال کا تعلق ہے تو لکھنؤ کی ادبی محفل اجڑی تو شاعری بھی دود چراغ محفل کی مانند پریشان بکھر گئی اور یوں ایک مرتبہ پھر دہلی کی اجڑی محفلِ سخن آباد ہوئی لیکن اس گرمیٔ محفل کا باعث لکھنوی شعراء نہ تھے۔ بلکہ خود دہلی میں صاحبِ طرز اسلوبِ گر شعراء کی موجودگی تھی۔'' (۶۱)

دہلی اور لکھنؤ کی شاعری اور تہذیب پر مصنف کا اسلوب منفرد ہے ویسے دکن، دہلی اور لکھنؤ کی تاریخی و ادبی حیثیت کو اس کتاب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے تاریخی ترتیب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگلے ابواب میں نثر کی ابتدا و ارتقاء پر بات کی ہے۔ بنگال میں نثر کا ظہور انشاء اللہ خان انشاء کی نثر، اُردو کی پہلی داستان، فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات ترقی اُردو نثر میں فورٹ ولیم کالج کا حصہ اور نثر کی دیگر صورتوں کو پیش کیا گیا ہے۔

جنگِ آزادی کے بعد اُردو ادب ایک نئے زاویے پر گامزن ہوا۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء نے قدیم اصناف کی جگہ نئی اصناف کو متعارف کرایا۔ یہ داستان، غزل، مرثیہ، مثنوی اور قصیدہ کی جگہ نظم، ناول، مضمون، سوانحی عمری اور تاریخ نگاری نے لے لی۔ اس میں سرسید احمد خان کے علاوہ حالی، شبلی، نذیر احمد آزاد، اسماعیل میرٹھی، اکبرالٰہ آبادی جیسے کئی تخلیق کاروں نے اس سلسلے میں اہم خدمات سرانجام دیں۔ اُردو ڈراما اور اُردو مرثیہ اور انشائے لطیف کی تاریخی حیثیت بیان کرنے کے لئے بھی الگ الگ باب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ان ابواب میں اندرسبھا، انارکلی اور واجد علی شاہ کے ڈراموں کا تفصیلاً تجزیہ کیا گیا ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کو مرثیہ نگاری کی ادبی خدمات سرانجام دینے پر ان کے فن کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ناول نگاری میں عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار اور مرزا ہادی رسوا کی ناول نگاری کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ (معریٰ) اور آزاد نظم کی مباحث بھی موجود ہیں۔

کتاب ۲۹ مختلف ابواب پر مشتمل ہے جس میں ترقی پسند تحریک، پاکستانی ادبی تحریک، اسلامی ادب کی تحریک، حلقہ اربابِ ذوق اور جدیدیت کی نئی تحریکوں کی ادبی خدمات کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ پاکستانی ادب کے بعض شعراء کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے اور بعض ناتجربے کاروں کا ذکرِ خاص کر کے مصنف نے اپنے اوپر ہونے والے اعتراضات کو خود ہوا دے رکھی ہے۔ کتاب کے مختلف ایڈیشن چھپتے رہے ہیں۔ مصنف ہر ایڈیشن میں ترمیم و اضافہ کرتا رہا ہے جس سے ادبی حلقوں کو اعتراضات کا موقع ملتا رہتا ہے۔ اشاعتِ اول سے لیکر تا حال اس کتاب کے اکتیس سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں لیکن ہر اشاعت میں کچھ نہ کچھ صفحات کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ادبی تاریخ میں شاید یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ کسی کتاب کی پہلی اشاعت میں دو تین سو صفحات ہوں اور اگلی اشاعتیں پندرہ سو صفحات سے بھی تجاوز کر جائیں۔ ترمیم و اضافہ کی حد تک کتاب پر اعتراض کرنا

درست ہے جبکہ تاریخی حقائق کو مصنف جس طرح درجہ بہ درجہ بہتری کی طرف لے جا رہا ہے۔اس بات کا اعتراف کرنا بھی ادبی حلقوں کا فرض ہے۔کتاب کی روز بروز مانگ نے اس کی شہرت میں جو اضافہ کیا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

۱۱۔ اُردو زبان کی قدیم تاریخ (عین الحق فرید کوٹی)

اُردو ادب کی عمومی تاریخ نگاری میں عین الحق فرید کوٹی بھی ایک معتبر حوالہ ہے۔انہوں نے اس میدان میں اُردو زبان کی قدیم تاریخ متعارف کروائی جو ادبی تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے اس کی پہلی اشاعت جون ۱۹۷۲ء میں ارسلان پبلیکیشنز لاہور (مغربی پاکستان) سے ہوئی۔کتاب کی اشاعت کے حوالے سے نبی بخش بلوچ کہتے ہیں:

> ''اس کتاب کا موضوع جتنا وسیع ہے اتنا ہی پیچیدہ ہے۔اور ان کے اکثر پہلو ہنوز تشنہ تحقیق ہیں۔لیکن تحقیق کا یہی تقاضا ہے کہ مختلف مسائل کو علمی شواہد خواہ قیاسی دلائل سے زیرِ بحث لایا جائے تاکہ مزید بحث و نظر کے لئے راہیں کھل سکیں۔ فاضل مصنف کی یہ کوشش اسی مسلک کی علمبردار ہے۔۔۔۔۔۔مصنف نے جو کچھ لکھا ہے کھلے ذہن سے لکھا ہے، اور وہ علمی تحقیق کی روشنی میں ابتدائی خیالات کو بدل دینے کے قائل ہیں۔'' (۶۲)

کتاب کے دس ابواب ہیں جو اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔فہرست ابواب یوں ہے۔

باب اوّل: لسانیات کی تاریخ

باب دوم: زبان کے میکانکی پہلو

باب سوم: ایک نظریے کا ارتقاء

باب چہارم: اُردو زبان کا پسِ منظر

باب پنجم: ہڑپہ سے پہلے

باب ششم: وادیٔ سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات

باب ہفتم: پنجابی اور دراوڑی زبانوں میں اضافی اور مفعولی علامتوں کا اشتراک

باب ہشتم: سنسکرت اور پراکرتیں

باب نہم: وادیٔ سندھ اور ترکی و تاتاری زبانیں

باب دہم: وادیٔ سندھ کی زبان پر یونانی اثرات

مصنف نے اس کتاب میں نہایت ہی پیچیدہ لسانی مسائل کا قابل داد تجزیہ کیا ہے یہ ایک خالص علمی کتاب ہے جس سے مصنف کے وسیع مطالعے، موضوع سے محبت اور مسائل کی توضیح و تنقیح میں مشققت کا پتہ چلتا ہے۔ مصنف زبان کے پس منظر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کسی بھی زبان کی ابتداء کا مسئلہ اتنا آسان نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زبان نے انسان کے ساتھ ہی جنم لیا اور پھلتی پھولتی، ادلتی بدلتی ہم تک پہنچی ہے۔ یعنی دنیا کی زبانوں کا بنیادی عنصر اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود حضرت انسان کا وجود، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زبان انسان سے پہلے بھی صفحۂ ہستی پر موجود تھی کیونکہ جدید تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جہاں تک باہمی اظہار اور ابلاغ کا تعلق ہے وہ جہد للبقاء کے تقاضے کی بدولت یک خلیہ امیبا سے لے کر ارتقاء حیات کی آخری کڑی تک کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔'' (۶۳)

حافظ محمود شیرانی مصنف ''پنجاب میں اُردو'' کے یہ الفاظ آج بھی اتنے ہی صحیح ہیں جتنے کے آج سے تیس سال قبل قلمبند کرتے وقت تھے:

''اُردو زبان کے آغاز کا مسئلہ اگر چہ دلچسپ ہے لیکن اس پر ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں قلم اٹھانا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے اور صحیح اطلاعات کی بہم رسائی کے لیئے شاید ابھی ایک عرصہ درکار ہوگا۔ مصنف اُردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔'' (۶۴)

حافظ محمود شیرانی اُردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ آغاز اُردو کے بارے میں ماہر لسانیات ڈاکٹر آر۔ جی۔ لیتھم نے کہا ہے:

''درخت کی عمر کا اندازہ اس کے تنے کے غیر مرکزی دائروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن زبان ایک ایسی شے ہے کہ نہ تو اس میں درختوں کی طرح غیر مرکزی دائرے ہیں نہ گھوڑوں کی طرح دانت اور نہ کسی روزنامچہ میں اس کی تاریخ پیدائش درج ہے کہ جس سے اس کی عمر کا صحیح تعین کیا جا سکے۔ اس کا سراغ لگانے کا فقط ایک ہی زریعہ ہے اور وہ ہے تحقیق ۔۔۔۔۔ اور تحقیق ۔۔۔۔۔۔!! اور زیادہ تحقیق ۔۔۔۔۔!!! (۶۵)

اُردو زبان کی قدیم تاریخ انفرادیت کی حامل ہے۔ عین الحق فرید کوٹی نے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کیں جو تاریخ نگاری میں اہم پیش رفت ہے۔ عین الحق فرید کوٹی نے درحقیقت یہ کتاب لسانی تحقیق کے نکتۂ نظر سے لکھی ہے اس کتاب سے اُردو کی لسانی ارتقائی صورتِ حال سامنے آتی ہے۔

۱۲۔ اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام (ڈاکٹر مولوی عبدالحق)

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کتاب ''اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'' ایک منفرد کتاب ہے۔ اس کی اشاعت چہارم ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔(۶۶) انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب ایک طرف ہندوستان کے صوفیائے کرام کی تاریخ پیش کرتی ہے اور دوسری طرف زبان کی ابتدائی شکل کے نمونے بھی اس میں ملتے ہیں مولوی عبدالحق نے اپنی اس کتاب میں تیس صوفیائے کرام کے ہندی کلام کو ان کے سوانحی حالات کے ساتھ پیش کیا ہے جس کو آج اُردو شاعری کے اولین نمونے میں شمار کر سکتے ہیں۔ جہاں تک موضوع کی مناسبت کا تعلق ہے تو اُردو کی نشوونما میں شاہ میر اُردو اور قدماء کی کوششوں کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام کا حصہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

فاضل مصنف نے جن صوفیائے کرام کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی ترتیب یوں ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، حضرت فریدالدین شکر گنجؒ، حضرت شیخ حمیدالدین ناگوریؒ، حضرت بوعلی قلندرؒ، امیر خسروؒ، شیخ لطیف الدین دریانوشؒ، شیخ سراج الدین عثمانؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، حضرت شاہ برہان الدین غریبؒ، حضرت گیسودراز بندہ نوازؒ، شیخ احمد کھٹو، حضرت قطب عالم و حضرت شاہ عالم، حضرت سید محمد جونپوری، شیخ بہاالدین باجن، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری، شیخ علی متقی، شیخ رزق اللہ، شیخ وجیہہ الدین احمد علوی، شیخ بہاالدین برناوی، سید شاہ ہاشم حسن العلوی، شمس المشاق شاہ میراں جی، شاہ برہان الدین جانم، شاہ امین الدین اعلیٰ، سید میراں حسینی شاہ، قاضی محمود دریائی بیرپوریؒ، شاہ علی محمد جیوگام دھنیؒ، میاں خوب محمد چشتی، بابا شاہ حسینی کے بارے میں مولوی عبدالحق تذکرہ کرتے وقت بیش تر کا حوالہ اُردو ادب کی تاریخی کتب اور تذکروں سے دیا ہے۔ مولوی موصوف مصنف کی بظاہر اس مختصر کتاب کی اہمیت کا اندازہ اہل معرفت و ادب ہی لگا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اپنی شہرۂ آفاق تاریخ میں صوفیائے کرام کی اُردو خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''صوفیائے کرام برعظیم کے مختلف علاقوں میں رشد و اہمیت کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ بابا فرید گنج شکر ملتان کے رہنے والے ہیں۔ شیخ حمیدالدین ناگوری وسطی ہند کے بوعلی قلندر، پنجاب و ہریانہ کے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہار و بنگال کے امیر خسرو دہلی کے اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی اودھ کے جو پنجاب میں تھا۔'' (۶۷)

اُردو زبان کی تاریخ کے حوالے سے ادبی تاریخ کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے۔ جس میں صوفیائے کرام کا تذکرہ نہ کیا گیا ہو۔ مولوی عبدالحق کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بجائے صوفیائے کرام کا سرسری تعارف دینے کے تمام قابل ذکر صوفیاء کے

حالات اور کلام پر مبنی پوری کتاب ہی تالیف کردی جوان کا انفرادی کارنامہ ہے یہ کتاب تصوف کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لئے مشکل راہ ثابت ہوئی ہے۔مولوی عبدالحق نے صوفیائے کرام کی تعلیمات کا حوالہ دیتے ہوئے صوفی کی حیثیت اور اہمیت کو بھی بیان کیا ہے ایسی معلومات دینے سے کتاب کو پڑھنے کا شوق اور بھی بڑھ جاتا ہے مثال کے طور پر ایک جگہ لکھتے ہیں:

''صوفی موصوف سے مشتق ہو یا صفا سے وہ مذہبی اور اخلاقی عالم میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔وہ ملک وملت سے بے نیاز ہے اور ہر قوم اور ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔وہ ایک قسم کا باغی ہے جو رسم و ظاہر داری کو جو دلوں کو مردہ کر دیتی ہے روا نہیں رکھتا۔اور اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے۔ مولوی اور صوفی میں یہ فرق ہے کہ وہ ظاہر کو دیکھتا ہے اور یہ باطن کو، وہ لفظ کو دیکھتا ہے اور یہ معنی کو، وہ رسمیات اور تقلید کا پابند ہے اور یہ ان سے بے زار، اس کی نظر برائی پر پڑتی ہے اور یہ برے سے برے میں بھی بھلائی کا پہلو ڈھونڈ نکالتا ہے، وہ لعن طعن سے کام لیتا ہے اور مہر محبت سے، وہ سختی اور تشدد کرتا ہے اور یہ نرمی و ملائمت ، وہ بہت کم معاف کرتا ہے اور اس کا شیوا درگذر کرنا ہے، وہ خودی اور خودنمائی سے بڑا بنتا ہے اور یہ فروتنی اور خاکساری سے دلوں میں گھر کرتا ہے وہ دوسروں کے عیوب کا متجسس رہتا ہے اور یہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے، وہ اپنے ظلم سے مرعوب کرنا چاہتا ہے اور یہ اپنے عمل سے دوسروں کو لبھاتا ہے۔'' (۶۸)

کتاب مذکورہ کی اہمیت یوں بھی بہت زیادہ ہے کہ اس میں متذکرہ بالا تمام صوفیائے کرام کے سنین پیدائش و وفات اور مختصر حالاتِ زندگی بھی قلمبند کئے گئے ہیں اس حوالے سے شاہ میراں جی کے حوالے بارے میں لکھتے ہیں:

''اگر حضرت گیسو دراز کے رسالہ معراج العاشقین سے قطع نظر کی جائے اور اسے منسوب خیال کیا جائے تو پہلے صوفی بزرگ جن کا کلام مستقل طور پر ملتا ہے وہ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق بیجا پوری ہیں۔جن کا سنہ وصال لفظ شمس العشاق سے ۹۰۲ھ / ۱۴۹۶ء سے نکلتا ہے۔آپ مکہّ میں پیدا ہوئے اور کچھ دنوں بعد ہندوستان آئے اور حضرت شاہ کمال الدین مجرّ د بیابانی سے دست بیعت ہوئے۔'' (۶۹)

مولوی عبدالحق نے اس کتاب میں ہر صوفی اور بزرگ ہستی کی پیدائش اور وفات کے علاوہ ان کی مختصر سوانح اور کتب کی تفصیل بھی دی ہے۔شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا تعارف یوں بیان کرتے ہیں:

''شیخ عبدالقدوس گنگوہی (ولادت ۸۶۰ھ بمطابق ۱۴۵۵ء وفات ۹۴۵ھ بمطابق ۱۵۳۸ء) شیخ محمد بن شیخ احمد عبدالحق چشتی صابری کے مرید اور صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں۔وہ ہندی کے شاعر تھے اور ''الکھ داس'' تخلص کرتے تھے۔ان کی ایک تصنیف ''رشد نامہ'' ہے جس

میں تصوف اور وحدت وجود کے نکات بیان کئے ہیں اس میں جگہ جگہ ہندی دوہرے اپنی تصنیف میں لکھے ہیں۔'' (۷۰)

صوفیائے کرام نے اپنی تعلیمات اور رشد و ہدایات کا ذریعہ مقامی زبانوں کو بنایا جو اس وقت ہندی کے نام سے موسوم کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مقامی بولیوں کا اثر بھی قبول کیا۔ صوفیائے کرام کے احوال و آثار بہت سی کتب میں ملتے ہیں جن میں تحفۃ الکرم اور سیر الاولیاء اہمیت کی حامل ہیں لیکن صوفیائے کرام نے اُردو کی ابتدائی نشوونماء میں جو کردار ادا کیا اس کی نشان دہی مولوی عبدالحق نے اس مختصر کتاب میں کی ہے۔ اس لئے صرف ستاسی صفحات پر مشتمل اس کتاب کی اہمیت ہزاروں صفحات کی تواریخ ادبیات اُردو سے کہیں زیادہ ہے۔ مولوی عبدالحق کی اس کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں رقم طراز ہیں:

> ''صوفیاء کو محض جنوبی ہند سے ہی مخصوص نہیں کیا جاسکتا بلکہ ہندوستان میں وہ تبلیغ کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کی مقبولیت اور ادب کی ترقی کا باعث بھی بنے چنانچہ مولوی عبدالحق کی تالیف ''اُردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام'' کے مطالعہ سے اس امر کا اندازہ لگانا دشوار نہیں رہتا۔'' (۷۱)

مولوی عبدالحق نے زیادہ تر اُردو زبان کی خدمت کی۔ اُردو زبان کے لئے اپنا گھر بار قربان کردیا ساری عمر اُردو کے لئے وقف کردی۔ جنوبی ہند کا ادبی سرمایہ منظر عام پر لا کر اُردو زبان کی تاریخ میں مزید اضافہ کیا تاہم ان کی یہ کتاب بھی اپنی نوعیت کی منفرد اور اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ اس کتاب سے نہ صرف صوفیاء کی کاوشوں پر نظر پڑتی ہے بلکہ اُردو ادب کی پیش رفت بھی سامنے آتی ہے۔

۱۳۔ مختصر ادب اُردو (پروفیسر محمود بریلوی)

اُردو ادب کی عمومی تاریخ نگاری میں پروفیسر محمود بریلوی کا نام بھی ایک معتبر حوالہ ہے انہوں نے اس میدان میں ''مختصر ادب اُردو'' (با تصویر) متعارف کروائی جسے تواریخ ادبیات میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اسے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔ مصنف کے بقول انہوں نے اس کتاب کی تدوین کا کام قیام پاکستان سے پہلے شروع کیا تھا اور یہ کام برسوں کی مسافت طے کرتا ہوا تکمیل پذیر ہوا۔ مصنف نے جن حالات میں اور جس تگ و دو میں یہ کتاب لکھی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس مختصر تاریخ ادب اُردو کی تدوین کا کام راقم الحروف نے قیام پاکستان کے آغاز سے بہت قبل بمبئی میں شروع کردیا تھا۔ جس کے دوران میں نے اُردو ادب کے بیسیوں تذکروں سے مدد لی۔ اس کتاب کے آخر میں تذکروں کی جو فہرست درج ہے ان میں سے اکثر راقم الحروف کے زیر مطالعہ

رہے جن سے نوٹ مرتب کئے گئے ۔ پھر رامپور، علی گڑھ، دہلی، آگرہ، بمبئی، لکھنؤ اور الہٰ آباد وغیرہ کی معروف لائبریریوں میں بھی اپنی مقصد برآری کے لیے چھان بین کی گئی ۔ یہ کام برسوں تک جاری رہا۔ جس کے درمیان میں راقم الحروف نے بے شمار اُردو رسائل سے مطلوبہ اقتباسات حاصل کئے اور درجنوں اُردو شعراء اور ادیبوں سے مراسلت کی ۔ اس کتاب کے ہر باب کے آخر میں فٹ نوٹ کی صورت میں متعلقہ کتب ورسائل کے حوالے موجود ہیں ۔'' (۷۲)

اس کتاب کے دو حصے ہیں جو نظم ونثر کے حوالے سے پہلے حصے میں نظم شامل ہے جس میں ۲۷ مختلف ابواب ہیں جبکہ گیارہ ابواب حصہ نثر پر مشتمل ہیں ۔ حصہ نظم میں متقدمین، متوسطین اور متاخرین سمیت جدید اُردو شاعری پر مشتمل آٹھ مختلف ادوار بیان کئے گئے ہیں ۔ اس کے مختلف اصناف سخن اور اُردو شاعری کے مراکز پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے لکھنؤ اور دہلی پر خاصا مواد جمع کیا ہے ۔ دونوں کی خصوصیات اور انفرادی حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے ۔ دبستان لکھنؤ کی مسلمہ حقیقت کو یوں پیش کرتے ہیں:

''اب دہلی سے لکھنؤ کو مرکز اُردو کے مستقبل تبادلہ کا وقت آ چکا تھا۔ قریباً ہر دہلوی شاعر لکھنؤ اسکول بالخصوص ناسخ کے اسلوبِ شعری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ حتیٰ کہ ایک وقت تو ایسا آیا کہ ہر دہلوی شاعر نے اس اسلوب میں طبع آزمائی کی ۔'' (۷۳)

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب اُردو شاعری نے کروٹ بدلی تو سب کچھ تبدیل ہو گیا۔ کلاسکیت کی جگہ جدیدیت نے لے لی سینکڑوں شعراء وادباء منظرِ عام پر آئے جن کا انتخاب کرنا بھی ہر مؤرخ کے لئے ایک مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے ۔ پروفیسر محمود بریلوی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''عہد جدید میں بے شمار اچھے اُردو شعراء برِصغیر جنوبی ایشیا میں موجود رہے ہیں مگر ان سب کا ان اوراق میں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے ۔ لہٰذا ہم نے حسبِ ذیل شعراء کو تفصیلی ذکر کر کے منتخب کیا ہے ۔ دیگر شعراء کا محض حوالہ دینا ممکن ہو سکے گا ۔ اس باب کے آخر میں ہم ترقی پسند شعراء کا ذکر کریں گے ۔ یعنی فیض، ن ۔ م ۔ راشد، مجاز، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، جذبی، میراجی، مجنوں گورکھ پوری اور جاں نثار وغیرہ ۔'' (۷۴)

مصنف نے شاعری اور نثر دونوں کے آغاز وارتقاء کے حوالے سے جو معلومات دی ہیں وہ منفرد ہیں ۔ لیکن انہوں نے اُردو زبان کے آغاز وارتقاء کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے ۔ انشاءاللہ خان انشاء کی ''دریائے لطافت'' اور میرامن کی ''باغ و بہار'' ۱۸۰۱ء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ میرامن نے شہنشاہِ اکبر کے دور کو اُردو کا آغاز کہا جبکہ دریائے لطافت میں شاہ جہاں کے عہد کو قرار دیا گیا ہے ۔ اسی طرح جدید نثر کو سرسید احمد خان کی تحریک سے منسوب کیا ہے ۔ جس کا آغاز غالب کی خطوط نویسی سے بتایا گیا ہے ۔ لکھتے ہیں:

''اُردو نثر کا یہ دور مرزا غالبؔ کی خطوط نویسی اوران مصنفین کی ادبی تخلیقات سے شروع ہوا۔جن کا تعلق اُردو کے سرسید اسکول سے تھا اس دور کی بنیاد مرزا غالب کے خطوط سے پڑی جو اُردوئے معلّٰی کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔'' (۷۵)

مصنف نے اس کتاب میں کلاسیکی اور جدید شعراء کی تصاویر بھی لگائی ہیں جس سے کتاب کی اہمیت دو بالا ہو جاتی ہے۔شعراء کرام میں سے قطب شاہ سے لے کر اختر شیرانی تک ۴۸ شخصیات کی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔کلاسیکی اور جدید شعراء وادبا کی تصاویر اور کتاب میں ان کے شہرہِ آفاق اور آفاقی اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے۔جو کتاب کی اہمیت اور افادیت کی عکاس ہیں۔

مصنف نے شعروادب کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سیاست کو بھی ضرورت کے تحت بیان کیا ہے۔مسلمان سلاطین کے کارنامے اور مغل سلطنت کے دوران ہونیوالے ہنگامے بھی پیش کئے ہیں۔حاکم بنگال سراج الدولہ اور فرمانروائے میسور (دکن) کے حب الوطنی اور انگریز دشمنی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اٹھارویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف حصے میں جبکہ سلطنت مغلیہ معرض زوال میں تھی برصغیر پاک و ہند میں ایسی دو نامور وغیرہ معمولی حکمران مسلمان شخصیتیں موجود تھیں۔جو بہتر ماحول اور موافق حالات میں یقیناً احیائے اسلام کا پرچم بلند کرتیں۔یعنی نواب سراج الدولہ شہید (شہادت ۱۷۵۷ء حاکم بنگال و بہار اور سلطان ٹیپو شہید (شہادت ۱۷۹۹ء) فرماں روائے میسور (دکن) یہ دونوں مسلمان فرماں روا اُردو زبان سے واقف تھے بلکہ سلطان ٹیپو کو تو اُردو زبان کا شاعر بھی بتایا گیا ہے۔انگریز مؤرخوں نے اپنے تعصب کی بناء پر ان دونوں کو بُرے نام سے یاد کیا ہے کیونکہ دونوں انگریز غاصبوں کے مخالف تھے۔'' (۷۶)

اُردو زبان وادب کی تاریخ پر جتنی بھی کتب لکھی گئی ہیں سب کی بہت اہمیت ہے پروفیسر محمود بریلوی نے بھی اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کیں جو تاریخ نگاری میں اہم پیش رفت ہے۔پروفیسر محمود بریلوی نے تاریخ ادب اُردو کے ساتھ ساتھ سیاسیات، سماجیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

۱۴۔ موجِ کوثر (شیخ محمد اکرام)

شیخ محمد اکرام نے تین مستند اور معتبر کتب تالیف کیں جو ان کی پہچان ہیں۔اس سلسلے کی پہلی کتاب آبِ کوثر، دوسری رودِ کوثر جب کہ تیسری موجِ کوثر ہے۔ان تینوں کتب میں ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ مرتب کی گئی ہے پہلی کتاب مسلمانوں کی ہندوستان آمد سے عہدِ مغلیہ تک ہے جب کے دوسری کتاب میں عہدِ مغلیہ کی مذہبی اور علمی تاریخ مرتب کی

گئی ہے۔ یہ دونوں کتب مذہبی نوعیت کی ہیں اس لئے ہمارے موضوع سے مطابقت نہیں رکھتی:

''موج کوثر'' ان کی تیسری اہم کتاب ہے جسمیں عہدِ مغلیہ کے بعد سے لے کر تقسیمِ ہند تک مسلمانوں کی علمی و مذہبی تاریخ پر مباحث ہیں۔ اس کتاب میں جن شخصیات کی خدمات کو مرتب کیا گیا ہے وہ مذہب کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی بڑا نام رکھتی ہیں اس لئے یہ کتاب اس بات کا اعتراف خود مصنف نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''کتاب [موجِ کوثر]'' سلسلہ کوثر کی تیسری اور آخری کڑی ہے اور اس میں انیسویں صدی کے آغاز سے قیامِ پاکستان تک کی اہم مذہبی ،فکری اور قومی تحریکوں اور رہنماؤں کا ذکر ہے۔ سیاسی لحاظ سے ڈیڑھ سو سال (۱۸۰۰ء۔ ۱۹۴۷ء) کا یہ زمانی محکومیت کا دور تھا ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حالت ہر لحاظ سے انتہائی پستی کو پہنچ گئی تھی لیکن قوم میں ابھی جان باقی تھی۔ اللہ کا ایک بندہ اٹھا اور اپنی ہمت، معاملہ فہمی اور چالیس سال کی مسلسل جدوجہد سے حالات کا نقشہ بدل دیا۔۔۔۔۔۔۔ یہ نتیجہ خیز کوشش سیاسیات تک محدود نہ تھیں علمی ، ادبی بلکہ مذہبی اور دینی معاملات میں بھی قوم نے نئی سر بلندیاں حاصل کیں۔ اُردو نثر کا اصل آغاز اس زمانے میں ہوا۔ اُردو شاعری میں ایک خوشگوار، صحت مند انقلاب آیا۔'' (۷۷)

موجِ کوثر کو چھ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ ہر باب کے ذیل عنوانات ہیں پہلا باب سید احمد بریلوی اور ان کے رفقائے کار کے عنوان سے ہے باقی ابواب بالترتیب ''علی گڑھ'' ''جدید علم الکلام'' ''ردِعمل'' ''اقبال'' اور ''مولانا عبیداللہ سندھی دیو بندی'' کے عنوان سے ہیں۔

فاضل مصنف نے ہر باب میں جس تفصیل روشنی ڈالی ہے۔ وہ لائقِ ستائش ہے۔ پہلے باب میں سید احمد بریلوی کے علاوہ مولانا عبدالحیی ، مولانا اسماعیل شہید، مولوی نصیر الدین دہلوی، مولوی ولایت علی عظیم آبادی اور مولوی عنایت علی عظیم آبادی کے علاوہ مختلف دینی مسالک پر بھی سیرِ حاصل گفتگو کی ہے۔ مصنف کی تحریر مذہبی رنگ لئے ہوئے ہے۔ تاہم ادیب ہونے کے ناطے ادبی سلوب کی جھلک یہاں بھی مل جاتی ہے۔ اس باب میں متذکرہ بالا اکابر علماء کی دین اسلام کے حوالے سے خدمات کو سراہا گیا۔ سید احمد بریلوی نے جب سکھوں کے ظلم وستم کو دیکھتے ہوئے ان کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا تو بہت سے مسلمان مجاہدین نے ان کا ساتھ دیا۔ مصنف ان کے اس اعلان کا تفصیلاً ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سکھ قوم عرصے سے لاہور اور دوسری جگہوں پر قابض ہے اور ان کے ظلم کی کوئی حد نہیں رہی انہوں نے ہزاروں مسلمانوں کو بلاقصور شہید کیا ہے اور ہزاروں کو ذلیل کیا ہے۔ مسجدوں میں نماز کے لئے اذان دینے کی اجازت نہیں اور ذبیحہ گاؤ کی قطعی ممانعت ہے۔ جب ان کا ذلت آمیز ظلم ستم ناقابلِ برداشت ہوگیا تو حضرت سید احمد ایدہ اللہ بنصرہ نے خالصتاً حفاظتِ دین کیلئے کئی مسلمانوں کو کابل اور پشاور کی طرف لے جا کر مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگایا اور ان کو جرأت دلا کر آمادۂ عمل کیا۔

الحمداللہ ان کی دعوت پر کئی ہزار مسلمان راہِ خدا میں لڑنے کو تیار ہوگئے اور سکھ کفار کے خلاف ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو جہاد شروع ہوگیا۔'' (۷۸)

پہلا باب ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے جو ادبی کم اور مذہبی زیادہ ہے۔ جب کہ دوسرا باب جس میں سرسید احمد خان کی ادبی، مذہبی اور سیاسی خدمات کو یکجا کر کے مفصل تحریر کیا گیا ہے سرسید احمد خان کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے مصائب اگر تمام تر اقتصادی ہوتے تب بھی انکا حل آسان نہ تھا لیکن اس زمانے میں انہیں جو نئے مسائل پیش آرہے تھے وہ زندگی کہ ہر شعبے سے متعلق تھے۔ اب تک ان کی ادبی زبان فارسی رہی تھی لیکن اس زبان کا مستقبل تاریک تھا اور اُردو میں غزل گوشعراء کے دواوین کے سوا کوئی قابلِ ذکر لٹریچر نہ تھا۔ نثر میں گنتی کی چند کتابیں تھیں اور ابھی اس میں علمی مسائل پیش کرنے کی صلاحیت نہ آئی تھی۔۔۔۔۔ علی گڑھ تحریک نے یہ سب کچھ کیا۔ سرسید احمد خان کی تعلیمی اصلاح کا زمانہ اُردو ادب کا بھی شاندار عہد ہے۔ اُردو ادب کے ''عناصر خمسہ'' میں سے چار حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمدؔ اور سرسید احمد خان اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔'' (۷۹)

مولانہ ابوالکلام آزادؔ نے سرسید احمد خان کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' کو جن الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا اسے آج بھی ادبی ذوق رکھنے والے اکثر دہراتے ہیں۔ ابوالکلام آزادؔ کے الفاظ دیکھئے:

''عوام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات ''تہذیب الاخلاق'' نے چھوڑے ہیں ہندوستان برِصغیر (پاک و ہند) کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے۔۔۔۔۔ اس رسالے کے اجراء سے موجودہ اُردو ادب کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے اُردو نے اس رسالے کی بدولت اتنا فروغ پایا کے دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زمانے میں ہونے لگا اس دور کا کوئی مسلمان ادیب ایسا نہ تھا جو ''تہذیب الاخلاق'' کے حلقہء ادب سے متاثر نہ ہوا ہو دورِ جدید کے بلند معیار مصنفین نے اسی خوانِ نعمت سے لقمے چنے اور اسی حلقہ کے اثر نفوذ سے نقد و بصر کی نئی قدریں اور فکر و نظر کے نئے زاویے متعین ہوئے۔'' (۸۰)

اگلے باب میں مصنف نے جدید علم الکلام کے عنوان سے سرسید احمد خان اور دیگر مذہبی جماعتوں کے مذہبی فلسفے کو زیرِ بحث لایا ہے جس کے ردِعمل میں اکبرالٰہ آبادی، شبلی نعمانی اور ابوالکلام آزاد نے بہت کچھ لکھا بلکہ اتنا لکھا کہ علم الکلام کے فلسفے کو ماند کر کے رکھ دیا۔ مصنف نے ''ردِعمل'' کے عنوان سے الگ باب کا اہتمام کر کے بحث کو مزید آسان کر دیا ہے انہوں نے اکبرالٰہ آبادی کے فن اور فکر کی تفصیل اور علامہ شبلی نعمانی کی صحیح شخصیت کی تصویر بھی پیش کر دی ہے ردِعمل کا باب بھی ادبی تاریخ کے حوالے سے بہت اہم ہے۔

موجِ کوثر بنیادی طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی تصویر کو پیش کرتی ہے لیکن اس میں سرسید احمد خان، اکبرالہ آبادی، مولانا شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کے تصورات وافکار کو جس تفصیل سے پیش کیا گیا ہے اس سے کتاب کے ادبی ہونے کی واضح مثال سامنے آتی ہے۔

۱۵۔ اُردو ادب کی مختصر تاریخ (ڈاکٹر انور سدید)

ڈاکٹر انور سدید بیک وقت نقاد، مؤرخ، شاعر اور ادیب ہیں ان کی ادبی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''اُردو ادب کی مختصر تاریخ'' پہلی دفعہ ۱۹۹۱ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے شائع کی۔ اس کے بعد اسے اے۔ایچ پبلشرز، لاہور نے بھی شائع کیا۔ اس کتاب کی پہلی طباعت پر ڈاکٹر جمیل جالبی مصنف کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''کتاب کے مصنف ڈاکٹر انور سدید اُردو کے مشہور نقاد اور مصنّف ہیں۔ انہوں نے موضوع سے متعلق ضروری مواد سے استفادہ کیا ہے اور اس کی چھان بین کر کے درسی ضروریات کے لئے اس سے نتائج اخذ کئے ہیں۔ کتاب کو تیرہ ابواب میں تقسیم کر کے اُردو زبان کی ابتداء نشوونماء، برصغیر پاک و ہند کے شمالی اور جنوبی حصوں میں اُردو ادب کے آغاز اور فروغ نظم و نثر کی پیدائش اور ارتقاء مختلف اصنافِ ادب تحقیق اور تنقید غرضیکہ ہر اہم موضوع پر مجمل لیکن واضح پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے اور حتی الامکان طلبا کے ذہنی معیار اور نصابی ضروریات کو مدِنظر رکھا ہے۔'' (۸۱)

کتاب کے تیرہ ابواب کچھ اس طرح ہیں:

پہلا باب: اُردو زبان کی ابتداء۔ پس منظر اور قدیم روایت

دوسرا باب: اُردو زبان و ادب کی ابتدائی نشوونما میں صوفیا اور بھگتوں کا حصہ

تیسرا باب: شمالی ہندوستان میں اُردو ادب کا ابتدائی فروغ

چوتھا باب: جنوبی ہند میں اُردو ادب کا ابتدائی فروغ

پانچواں باب: شمالی ہند میں اُردو ادب کی صبح صادق

چھٹا باب: اُردو ادب کا نیا مرکز۔ لکھنؤ

ساتواں باب: نظیر اکبر آبادی

آٹھواں باب: اُردو نثر کے فروغ کے دو ادارے

نواں باب: غالبؔ کا عہد

دسواں باب:　　سر سیدؔ احمد خان کا عہد

گیارھواں باب:　　اقبالؔ کا عہد

بارھواں باب:　　اُردو ادب کی جدید تحریکیں

تیرھواں باب:　　آزادی کے بعد ادب کا جدید دور

تیرہ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں مصنف نے تقریباً ایک ہزار سال کی تاریخ ادب کے وسیع سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ کتاب کی خاص بات اہم صنف اور شخصیت کا تفصیلی بیان ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب طلباء، اساتذہ، محققین، اسکالرز، ادباء اور شعراء سب کے لیے یکساں مفید ہے۔ کتاب کی تالیف اور اشاعت کے حوالے سے مصنف کو کن مراحل سے گذرنا پڑا اور کن کن شخصیات نے کتاب کی اشاعت کے لئے مصنف کو حوصلہ دیا۔ مصنف دیباچے بہ عنوان ''روبرو'' میں لکھتے ہیں:

> ''ابتدائے اُردو سے عہدِ حاضر تک کی تاریخِ ادب اُردو کو مختصراً ایک جلد میں پیش کرنے کا بنیادی خیال ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے ذہن میں پیدا ہوا تھا میں ان کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میرے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر کو عملی صورت دینے کے لئے یہ کتاب لکھنے کی دعوت مجھے دی اور اس کام میں سب سے زیادہ معاونت بھی انہوں نے ہی فراہم کی۔ وہ اس کتاب کے محرکِ قوت ہیں۔ ان کی محبت نے مسلسل یاد ہانیوں کی صورت بھی اختیار کی، جس سے شوق و عمل کو مہمیز لگتی رہی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے متعدد مراحل پر میری حوصلہ افزائی کی اور نہایت قیمتی مشورے دے دیئے۔ ان کی کرم فرمائی کا شکریہ ممکن نہیں یہ تو انعامِ خاص ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، صابر لودھی صاحب، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر انور محمود خالد اور محترمہ فرخندہ لودھی نے اس کام میں ہمیشہ کی طرح گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ مشفق خواجہ صاحب نے کراچی سے اور افتخار عارف نے لندن سے کتابیں فراہم کیں۔ سجادؔ نقوی اور رانا جماعت علی خان نے نایاب کتابوں کا ذخیرہ نہ صرف فراہم کیا۔ بلکہ تا اختتام کتاب استعمال کرنے کی اجازت بھی دی۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد اس کتاب کا بارِ اشاعت اٹھا رہا ہے۔'' (۸۲)

کتاب کے مندرجات پر نظر روشنی ڈالی جائے تو یہ ایک جامع اور اُردو ادب کی ایک مستند کتاب ہے۔ مصنف کا تنقیدی شعور بھی اس کتاب میں نظر آتا ہے۔ مصنف تجزیاتی شعور کے حامل تھے۔ اس لئے یہ کتاب تحقیق اور تنقید کا شاہکار ہے۔ مصنف کہتے ہیں:

> ''میں ادب کے دورِ حاضر کا نہ صرف ناظر ہوں بلکہ اس عہد کے ادبی ناٹک میں شریک بھی ہوں گویا میں تماشا بھی ہوں اور تماشائی بھی۔ میرا مشاہدہ دور کا نہیں نزدیک کا ہے۔ میں اپنی جذباتی کیفیات

کا آشنا بھی ہوں میرا ارداہ تھا اس تاریخ کو ۱۹۴۷ء تک لا کر ختم کر دوں لیکن پھر خیال پیدا ہوا کہ جن لوگوں نے گذشتہ چالیس برسوں کے دوران ادب کی تخلیق میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ کیا انہیں یوں نظر انداز کر دینا مناسب ہے۔ میرے احباب نے اس کی تائید نہیں کی میں نے زمانہء حال کی تحریکات، تجربات اور اثرات کو اس کتاب میں شامل کرنا ضروری سمجھا۔ میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ معاصر ادب پر لکھنا خاصا مشکل کام ہے۔ اور اس دور کے بہت سے ادبا اور شعراء اپنی دانست میں عہد ساز کارنامے سرانجام دے کر تاریخ میں اپنا مقام خود محفوظ کر چکے ہیں اور ان پر رائے زنی کرنا آسان نہیں میں نے اس ذمہ داری کو قبول کیا اور اسے مقدور بھر محنت سے سرانجام دینے کی کوشش کی ہے اور اب یہ کام آپ کے سامنے ہے۔ میری پیش کردہ آراء میرے مطالعے کا نتیجہ ہیں میں ان آرا کی ترتیب میں کتابوں کے لئے خیر سگالی کے تحت لکھے جانے والے دیباچوں، تقریباتی تنقیدوں اور اخبارات کی آرا سے حتی الوسع متاثر نہیں ہوا۔ تاہم اس کتاب کی آرا سے آپ کو اختلاف کا پورا حق حاصل ہے اور میں آپ کے نقطہ نظر کو جاننے اور اپنی غلطی کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ کی طرح منتظر رہوں گا۔'' (۸۳)

ڈاکٹر انور سدید نے اپنے سادہ اسلوب کے ذریعے تاریخِ ادب اُردو کو بیان کیا ہے۔ مواد کی فراہمی اور ترتیب میں تحقیق اور تنقید کو مدِ نظر رکھا ہے۔

۱۶۔ تاریخِ ادبیاتِ اُردو (حصہ اوّل) (ڈاکٹر ابوسعید نورالدین)

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین نے اُردو نظم ونثر کی تاریخ دو جلدوں میں ''تاریخِ ادبیاتِ اُردو'' کے عنوان سے تحریر کی ہے۔ حصہ اول میں اُردو نثر کے آغاز وارتقاء پر مفصل گفتگو ہے جبکہ دوسری جلد شاعری کے حوالے سے ہے پہلی جلد میں تیرہویں صدی عیسویں سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک تقریباً ساڑھے سات سو سال کی تاریخ نثر اُردو کا بہترین مرقع پیش کیا ہے اس کتاب کو مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور نے پہلی مرتبہ ۱۹۹۷ء میں شائع کیا۔

پہلی جلد پانچ ابواب پر مشتمل ہے'' اُردو نثر کا آغاز اور اس کی ابتدائی نشوونما'' کے عنوان سے پہلا باب کا اہتمام کیا گیا ہے جس میں بہمنی دور عادل شاہی دور اور قطب شاہی دور کی اُردو نثر کو عہد بہ عہد پیش کیا ہے۔ شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز گیسودراز اور سید عبداللہ حسینی کی نثری خدمات کو بہمنی دور کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ عادل شاہی دور کے نثر نگاروں میں شاہ میراں جی، شاہ برہان الدین جانم اور محمد شریف وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قطب شاہی دور کے سرکردہ نثر نگاروں میں ملا وجہی، سید میراں حسینی، شاہ اور میراں یعقوب کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ملا وجہی کی سب رس کا تذکرہ کرتے

ہوئے لکھتے ہیں:

''قدیم نثر اُردو میں یہ کتاب [سب رس] ایک خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔اس کا قصہ عجیب و غریب ہے طرزِ بیان بھی بڑا انوکھا اختیار کیا گیا ہے اس میں حسن و عشق کی کشمکش اور عشق و دل کے معرکے کو قصے کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔'' (۸۴)

ادبی مؤرخ جب بھی کسی زبان و ادب کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو اسے حقائق سے روگردانی کرنے کا حق نہیں پہنچتا اس لئے زمانی ترتیب کا خیال رکھنا مؤرخ کے اوصاف میں شامل ہے تاریخی واقعات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مصنف نے بھی جنوبی ہندوستان کی نثر کو تفصیلاً پیش کیا ہے۔اس کے بعد شمالی ہند کی نثری داستان کو بیان کیا ہے۔مصنف نے پہلے باب میں جنوبی ہند جب کہ دوسرے باب میں شمالی ہند کی اُردو نثر کے ارتقاء کو بیان کیا ہے۔شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری، خواجہ سید اشرف جہانگیری سمنانی، فضل علی فضلی، مرزا رفیع سوداؔ، میر محمد حسین، عطا حسین تحسین، آغا امانت لکھنوی اور مرزا غالبؔ کی نثری خدمات کو موضوع بنایا ہے۔شمالی ہند کی نثر کا ابتدائی تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس زمانے میں جنوبی ہند میں شاہانِ بیجاپور و گولکنڈہ کی سرپرستی اور صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کی تبلیغی سرگرمیوں کی بدولت اُردو ادب کی ابتدائی نشوونماء ہو رہی تھی اسی زمانے میں شمالی ہند میں بھی کہیں کہیں جستہ جستہ کام ہو رہا تھا۔اگر چہ وہ کام جنوبی ہند کے مقابلے میں بہت کم تھا اور اس کا ذکر محض تاریخی اعتبار سے کیا جا سکتا ہے۔جنوبی ہند میں اس زمانے میں جو کام ہو رہا تھا ذرائع آمد و رفت نہ ہونے کے سبب اس کے نمونے شمالی ہند میں منتقل نہ ہو سکتے تھے اس کے باوجود شمالی ہند میں تھوڑا بہت کام ہوا۔'' (۸۵)

فورٹ ولیم کالج کی نثر کا آغاز تیسرے دور سے تعلق رکھتا ہے۔لیکن ایک بات طے ہے کہ اسی کالج کے پلیٹ فارم سے ہی اُردو نثر کا باقاعدہ آغاز ہوا۔اس سے پہلے نثر کی کوئی منتظم کوشش نظر نہیں آئی تھی اور یوں ادبی نثر مختلف اوقات میں مختلف نثر نگاروں کے ہاتھوں پھلتی پھولتی رہی۔ جب اسے فورٹ ولیم کالج کی صورت میں ایک ادارہ میسر آیا تو یہ چند برسوں میں ارتقاء کی بلندیوں کو چھونے لگی جس کا اندازہ اہلِ علم و ادب ہی لگا سکتے ہیں کالج کے ہندوستانی مصنفین نے مستشرقین کی بھرپور مدد کی جس سے انہیں حوصلہ پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں کتب منظرِ عام پر آئی۔مصنف نے تیسرے باب میں فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات کا مفصل جائزہ پیش کیا ہے۔فورٹ ولیم کالج کی جملہ خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

''انگریز جب تک اچھی طرح جم گئے اور انہیں کسی قدر اطمینان اور آزادی کے ساتھ تجارت کرنے کا موقع مل گیا تو ان لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ یہاں کی مقامی زبان سے جب تک واقفیت حاصل نہ کی جائے روزمرہ معاملات اور لوگوں سے باہمی روابط پیدا کرنے میں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا

ہے چناچہ اسی ضرورت کے پیشِ نظر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔۔۔۔۔۔ بالفرض اگر یہ کالج نہ قائم ہوتا اور جان گل گرائسٹ جیسے جاں نثار عالم کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو شاید اُردو نثر کا تابناک باب بہت بعد میں شروع ہوتا۔'' (۸۶)

مصنف نے چوتھے باب کو ''اُردو نثر میں اصلاحی اقدام'' کا نام دیا ہے۔اس دور میں ادب ایک نئی کروٹ لے رہا تھا اس لئے مصنف نے اسے اصلاحی اقدام کا نام دیا ہے اس باب میں سرسید احمد خان ان کے حالات و واقعات اور نثر کی اعلیٰ خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ باب ایک سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔اور کتاب کا طویل ترین باب ہے۔مصنف نے علی گڑھ تحریک کے تمام سرکردہ رہنماؤں کی ادبی خدمات کا مفصل تجزیہ پیش کیا ہے۔

کتاب کا آخری باب داستان، ناول، ڈراما، افسانہ کے عنوان سے ہے یہ بات اہمیت کے لحاظ سے منفرد اور اہم ہے اس باب میں داستان، ناول، افسانہ اور ڈراما کا تاریخی ارتقاء پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر عندلیب شادانی لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ ''یہ کوتاہیوں اور خامیوں سے یکسر پاک ہے'' انسانی فطرت کو جھٹلانا ہوگا لیکن اگر اس کی خوبیوں کو مدِ نظر رکھا جائے تو اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ڈاکٹر نورالدین نے ''تمتع زہر گوشہ یافتم'' کا اصول مدِ نظر رکھا ہے اور جہاں جہاں کوئی چیز مفید مطلب نظر آئی اسے وہاں سے اخذ کر لیا۔کوشش یہ کی ہے کہ اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے ''تاریخِ ادبیاتِ اُردو'' کے متعلق جملہ قدیم و جدید اطلاعات کو یکجا کر دیا جائے یہ کتاب بیک وقت تالیف بھی ہے اور تصنیف بھی تالیف بایں معنیٰ کہ جہاں تک تحقیق کا تعلق ہے انہوں نے دوسرے قابلِ اعتماد محققین کی تحقیق پر اعتماد کیا ہے اور ان کی تحقیق کے نتائج کو پورے طور پر سمیٹ لیا ہے اور تصنیف بدیں لحاظ کے مضامین کی ترتیب، تنظیم اور تنقید ان کی اپنی ہے۔'' (۸۷)

کتابِ مذکورہ میں مصنف نے تنقید کا ناخوشگوار فرض پوری دیانت اور نہایت سلیقہ مندی سے ادا کیا ہے۔ان کے مطالعے کا انداز ہمدردانہ ہے ان کی تنقید میں نرمی توازن اور اعتدال نمایاں ہے ان کا اسلوبِ تحریر نہایت سادہ، فصیح اور بامحاورہ ہے۔ان کی کتاب عمومی تاریخ نگاری میں اہم کتاب ہے۔

۱۷۔ تاریخِ ادبیاتِ اُردو (حصہ دوم) (ڈاکٹر ابوسعید نورالدین)

''تاریخِ ادبیاتِ اُردو'' (حصہ دوم) ڈاکٹر ابوسعید نورالدین کی تصنیف کردہ اُردو شاعری کی طویل داستان ہے اسی کتاب کا حصہ اوّل اُردو نثر پر مبنی ہے جس کا جائزہ پچھلے صفحات میں لیا جا چکا ہے۔اس کتاب کو بھی مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی

لاہور نے شائع کیا پہلی اور دوسری جلد مربوط کرنے کی غرض سے مصنف نے دوسری جلد کا آغاز چھٹے باب سے کیا ہے اس لئے اس کا پہلا باب چھٹے باب کے عنوان سے ہے جو اُردو نظم (شاعری) کے آغاز و ابتداء سے متعلق ہے اس باب میں بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت امیر خسروؒ، اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کو شاعری کے اولین شعراء کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ اسی باب میں بہمنی دور، عادل شاہی دور اور قطب شاہی دور کے تمام شعراء کو بھی بطورِ خاص موضوع بنایا ہے۔ مصنف نے انہیں معمارانِ شاعر کہا ہے۔ اس حوالہ سے مصنف لکھتے ہیں:

> ''اُردو نظم کا آغاز شمالی ہند سے ہوا اور اُردو کے پہلے شاعر خواجہ معین الدین چشتیؒ ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی کا انتقال ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۵ء میں ہوا تھا اس کے معنی یہ ہوئے کے ساتویں صدی ہجری/ تیرہویں صدی عیسویں کے نصف اوّل میں اُردو نظم کی ابتداء ہوئی۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بعد شمالی ہند میں دو تین اور صوفی شاعر پیدا ہوئے جن میں امیر خسروؒ سب سے زیادہ مشہور ہیں لیکن شمالی ہند میں اُردو نظم کا یہ آغاز صرف آغاز ہی تھا۔ ترقی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کی نشو نما سرزمینِ دکن میں ہوئی وہاں نویں صدی ہجری/ پندرہویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں سلاطین بہمنی کے زیرِ سرپرستی اس کی نشونما کا آغاز ہو چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے شاعر خواجہ بندہ نواز گیسو درازؔ ہیں۔ ان سے وہاں اُردو نظم کا آغاز ہوا اس کے بعد عادل شاہی دور، قطب شاہی دور اور مغلیہ دور میں بتدریج اس کی خوب نشونما ہوئی۔'' (۸۸)

بابِ ہفتم یعنی اس جلد کا دوسرا باب ''اُردو نظم دہلی میں'' اُردو شاعری کو پیش کرتا ہے اس دور میں قدیم و جدید اور اُردو شاعری کے سنہری دور کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مصنف نے سرزمینِ دہلی پر ہونے والی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے پیش کیا ہے۔ آغاز سے لے کر کبیر داس اور تسلیم کے دور تک کی شاعری کا احاطہ بھی اس باب میں کیا گیا ہے۔

بابِ ہشتم ''اُردو نظم لکھنوٴ میں'' کے عنوان سے ہے۔ اس دور کے اہم غزل گو شعراء خصوصاً جرأتؔ، انشاءؔ، رنگین، آتشؔ و ناسخؔ، انیسؔ و دبیرؔ کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بابِ نہم اور دہم میں مولانا محمد حسین آزادؔ اور الطاف حسین حالیؔ کی اصلاحی شاعری اور عہد اقبالؔ کے غزل گو شعراء خصوصاً جگرؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، یگانہؔ، اکبرؔ، شادؔ، عظیم آبادیؔ اور تقسیمِ ہند کے بعد کے واقعات شعراء کے حالاتِ زندگی اور نظم و غزل کے معاصرانہ چشمک کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ جوشؔ، فراقؔ، حفیظؔ، فیضؔ اور عندلیبؔ شادانی کی نظم و غزل کے نشیب و فراز بھی ان ابواب میں بیان ہوئے ہیں۔

مصنف نے قارئین و اسکالرز کی سہولت کے لئے تقریباً تمام شعراء کے کلام و مرتبہ، انکے حالاتِ زندگی بھی پیش کئے گئے ہیں اس کتاب کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر باب کے آخر میں باب کی تفصیلات کو اجمالاً بھی بیان کر دیا گیا ہے۔
ڈاکٹر ابو سعید نور الدین حصہ نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نظم کے حصہ میں بھی کچھ یہی انداز ہے اس میں سب سے پہلے شمالی ہند میں اُردو نظم کا آغاز دکھایا گیا ہے۔ پھر دکن میں اس کی ابتدائی نشونماء کا حال ولی کے زمانہ تک دکھایا ہے اس کے بعد ولی کے اثر سے شمالی ہند میں بالخصوص دہلی میں اُردو نظم نے جو ترقی کی اس سے ''اُردو نظم دلی میں'' کے عنوان سے دکھایا گیا ہے اور دورِ جدید سے پہلے تک کے شعراء کو شامل کیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں دہلی اسکول کے ماتحت جتنے ممتاز شعراء آسکتے ہیں شامل کئے گئے ہیں۔ پھر لکھنؤ اسکول کیلئے ''اُردو نظم لکھنؤ میں'' کے عنوان سے ایک مستقل باب رکھا گیا ہے تا کہ لکھنوی رنگ کے تمام شعراء کا ذکر ایک ہی جگہ آجائے۔ مولانا آزاد، حالی اور اقبال کے زمانے سے اُردو نظم میں نئے نئے کامیاب تجربے کئے جانے لگے۔ اور پرانی روایات سے ایک قسم کی بغاوت شروع ہوگئی اس کے لیے ایک مستقل باب رکھا گیا ہے۔ اس دور میں آکر اُردو کی مرکزی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس میں مختلف علاقوں کے شعراء شامل ہیں۔'' (۸۹)

جب کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی حصہ نظم میں ڈاکٹر ابوسعید نورالدین کی تاریخ نویسی میں روایت شکنی یا جدت پسندی پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''امیر مینائی کو بالعموم دبستانِ لکھنؤ کا نمائندہ مانا جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر ابوسعید نورالدین نے عام روایت کے خلاف انہیں بیک وقت لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستانوں کے پیروں میں شمار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر مینائی لکھنوی ہوتے ہوئے بھی دبستانِ دہلی سے منسوب کئے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ رام پور میں گزارا اس زمانے میں رام پور خود ایک ادبی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اور لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستانوں کا سنگم تھا۔ ڈاکٹر ابوسعید نورالدین کے سوا امیر مینائی کو واضح طور پر دبستانِ دہلی سے منسوب تو کسی نے نہیں کیا لیکن رام پور کے دورانِ قیام میں ان کا دہلوی رنگ سے متاثر ہونا دوسروں نے بھی مانا ہے۔ بحرحال ڈاکٹر موصوف کو اس پر اصرار نہیں کے امیر مینائی کو لازمی طور پر دبستانِ دہلی کا نمائندہ مانا جائے تاہم اس باب میں ان کی رائے سے اختلاف آسان نہیں۔'' (۹۰)

مصنف کی کتاب کے مطالعے کا انداز ہمدردانہ ہے معاندانہ نہیں انہوں نے کوشش کی ہے کہ ہر شخص کے ساتھ ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے ڈاکٹر موصوف کے اسلوب میں توازن اور اعتدال نمایاں ہے ان کی کتب عمومی تاریخ نگاری کی اہم کتب میں شامل ہیں۔

۱۸۔ اُردوزبان کی مختصر ترین تاریخ (ڈاکٹر سلیم اختر)

ڈاکٹر سلیم اختر اہم نقاد اور محقق ہیں۔طویل عرصہ تک تدریس کے شعبے سے منسلک رہنے کی وجہ سے ان میں ادبی مؤرخ کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ وہ ادبی تاریخ کے ان چند نامور مؤرخین میں شامل ہیں جنہوں نے تواریخ ادبیات اُردو میں اپنا حصہّ شامل کیا۔اُردوزبان کی مختصر ترین تاریخ مقتدرہ قومی زبان نے شائع کی اور اس کے دو ایڈیشن چھپے۔ نئے مواد، معلومات اور کوائف کے اضافے سے تیسرا ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز نے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا۔(۹۱) جس کے بارے میں مصنف رقمطراز ہیں:

> ''ہمارے ہاں لسانیات کا جو معیاری کام ہوا اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں لیکن یہ کتابیں صرف ان ماہرین کے لیے ہیں جنہوں نے لسانیات کا خصوصی مطالعہ کر رکھا ہو۔تمام قارئین کے لئے یہ کتابیں بھاری پتھر ثابت ہوتی ہیں۔۔۔اُردو زبان کی مختصر ترین تاریخ مقتدرہ قومی زبان نے شائع کی اور اس کے دو ایڈیشن چھپے جو اس لئے باعث تعجب تھا کہ لسانیات جیسے خشک موضوع پر کسی کتاب کے دو ایڈیشنوں کی فروخت کا مطلب یہ ہوا کہ سنجیدہ مطالعہ کے شائق قارئین موجود ہیں۔ نئے مواد، معلومات اور کوائف کے اضافے سے تیسرا ایڈیشن سنگِ میل پبلی کیشنز پیش کر رہے ہیں''۔(۹۲)

کتاب مذکورہ نو مختلف ابواب پر مشتمل ہے جو اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔فہرست ابواب یوں ہے:

باب اول:	عالمِ صوت
باب دوم:	اُردوزبان کے نام
باب سوم:	اُردوزبان کا آغاز
باب چہارم:	اصلاح زبان کی تحریکیں
باب پنجم:	اُردورسم الخط
باب ششم:	اُردو میں لغت نویسی
باب ہفتم:	اُردو میں قواعد نگاری
باب ہشتم:	اُردو میں تراجم اور وضع اصطلاحات
باب نہم:	اُردوزبان مسائل ومباحث

کتاب کی خاصیت یہ ہے کہ جب یہ اُردو زبان کے آغاز وارتقاء کو پیش کرتی ہے تو ساتھ ساتھ اُردو ادب کی چیدہ چیدہ معلومات بھی بہم پہنچاتی ہے۔ مصنف نے اُردو زبان کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے لسانی تحقیق کی شاہکار کتب خصوصاً پنجاب میں اُردو، دکن میں اُردو، سندھ میں اُردو وغیرہ پر بھی سیر حاصل تبصرہ کر دیا ہے۔

پہلے دو ابواب میں لسانیات اور اُردو لسانیات کو موضوع بنایا گیا۔ اُردو کے مختلف ناموں کی تفصیل بھی بیان کر دی گئی ہے تا کہ اُردو کے ارتقائی مراحل پر بات کرتے ہوئے زبان کی ابتدائی اشکال ذہن میں رہیں۔ تیسرے باب کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ اس میں لسانی محققین کی تحقیق کی روشنی میں اُردو کی وسعت کو پیش کیا گیا ہے لکھتے ہیں:

''اُردو زبان کے آغاز اور ابتدائی نشونما سے وابستہ مباحث کے لحاظ سے بیشتر ماہرین لسانیات میں اسے کسی خاص خطے سے مشروط کرنے کا رجحان قوی تر نظر آتا ہے۔ چنانچہ پنجاب دکن اور سندھ کو اُردو کی جنم بھومی ثابت کرنے کے لئے جو نظریات پیش کئے گئے انہیں خصوصی شہرت حاصل ہوئی بلکہ بیشتر لسانی مباحث بھی انہیں نظریات کی ضمنی پیداوار قرار پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کسی نظریہ میں بھی کلی صداقت نہیں ہو سکتی جبکہ نا کافی شواہد کے باوجود جزوی صداقت سب میں نظر آ جاتی ہے''۔ (۹۳)

جب کوئی نئی زبان وجود پذیر ہوتی ہے تو صدیوں تک اس میں صفائی ستھرائی کا کام ہوتا رہتا ہے اور کسی خاص مقام پر زبان مکمل ہوتی ہے۔ اُردو زبان بھی دبستان لکھنؤ کے اختتام تک لسانی اصطلاحات سے گزرتی رہی۔ مصنف نے ''اصلاح زبان کی تحریکیں'' کے زیرِ عنوان باب چہارم میں زبان کی صفائی اور تکمیل پر مباحث کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اگرچہ ہر عہد کے اساتذہ سخن اپنے لسانی شعور کے مطابق مختلف الفاظ کو متروک قرار دیتے رہے ہیں مگر اس ضمن میں اساتذہ لکھنؤ مصحفی، آتش اور ان کے بعد ناسخ نے خصوصی شہرت حاصل کی۔ لکھنؤ اس عہد میں مرکز تہذیب و تمدن تھا اور درد کی استثنائی مثال سے قطع نظر نامور شعرا لکھنؤ آ چکے تھے۔ میرؔ، سوداؔ اور مصحفی نے لکھنؤ کی بزم سخن کو نیا رنگ دیا۔ لکھنؤ کے جدت پسندوں نے بھی ہر معاملے میں حسن، لطافت اور نزاکت کو ملحوظ رکھا تو شاعری کیسے متاثر نہ ہوتی۔ دہلی کے شعرا دل کی بات کرتے اور انداز بیان میں سادگی ملحوظ رکھتے۔ تزئین اسلوب کے لئے تشبیہ اور استعارہ تھا مگر یہ صرف طرز ادا کی آرائش کو تھا۔ مفقود بالذات نہ تھا جبکہ لکھنؤ میں اسکے برعکس خیال پر لفظ کو اور جذبے پر طرز ادا کو ترجیح دی گئی جس کے باعث شاعری لفظ پرستی میں تبدیل ہو گئی''۔ (۹۴)

مجموعی طور پر کتاب میں لسانی اصطلاحات، لغت نویسی، قواعد و انشاء گرائمر اور مستشرقین کی مساعی بحوالہ زبان اُردو پیش کی گئی ہیں۔ آخر میں اُردو زبان کے ساتھ مسائل و مباحث اور انگریزی کے اُردو پر اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ انگریزی زبان نے جہاں دنیا کی بہت سی زبانوں پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں وہاں اُردو پر بھی اس کے اثرات نظر آتے ہیں۔ مصنف نے ان تمام مسائل کو آخری باب میں پیش کیا ہے کہ اس طرح یہ کتاب زبان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اُردو کے

مستقبل کی نشاندہی بھی کرتی دکھائی دیتی ہے جو بہتر عمل ہے۔

۱۹۔ تاریخِ ادب اُردو ۱۷۰۰ء تک (پروفیسر سیدہ جعفر۔ پروفیسر گیان چند)

پروفیسر سیدہ جعفر اور پروفیسر گیان چند نے پانچ جلدوں پر مشتمل ''تاریخِ ادب اُردو'' کے نام سے اُردو ادب کی تاریخ مرتب کی ہے۔ شروع میں یہ ایک ہی جلد میں لکھی گئی تھی لیکن کتاب کی ضخامت اتنی بڑھی کہ اسے پانچ جلدوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ یہ کتاب تحقیق اور تنقید کا امتزاج ہے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے گیان چند لکھتے ہیں:

> ''ہماری تاریخ بھی تحقیقی زیادہ ہے اور تنقیدی کم، اُردو کا ابتدائی دور ابھی تک دھند لکے میں ہے۔ ادیبوں کی پوری سوانح تو در کنار، ان کے صحیح نام تک کا علم نہیں ہوتا۔ ان کی کتابوں کی تاریخیں طے نہیں مشاہیر کی زندگی کے اہم واقعات ہوں کہ ان کی تصانیف کا زمانہ ایک تاریخِ ادب میں کوئی سنہ دیا ہوتا ہے تو دوسرے میں کچھ اور۔ اسی لئے ہم نے دور کی قدامت کے پیشِ نظر تحقیقی پہلو پر بطورِ خاص توجہ کی ہے یاد رہے کے اُردو میں Date اور History دونوں کے لئے ایک ہی لفظ ''تاریخ''، مستعمل ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری تاریخِ ادب میں ماہ وسال کی صحت پر زور دینا چاہئے۔ ہم نے ہر باب کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے کہ یہ کس کی تصنیف ہے لیکن بعض ابواب کے کچھ حصے دوسرے مصنف کے لکھے ہوئے ہیں۔'' (۹۵)

''تاریخِ ادب اُردو'' لکھنے کا یہ منصوبہ حکومتِ ہند کا تھا۔ حکومت کی طرف سے ترقی اُردو بیورو نے ڈاکٹر گیان چند اور سیدہ جعفر کے ذمے یہ عظیم کام لگایا۔ جسے ہر دو مصنفین نے بخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ان پانچ جلدوں کے کل ابواب تیرہ (۱۳) تھے لیکن آخری باب جو گیان چند کا لکھا ہوا تھا شائع ہونے سے رہ گیا۔ اسے یا اس کو مرتب کی کمزوری کہیں یا کسی اور کی بہر حال اس کا تذکرہ مصنف گیان چند نے یوں کیا ہے:

> ''تیرہ (۱۳) بابوں پر خاکہ تین ابوابوں پر مشتمل ہے اس میں چھ چھ باب دونوں نے لیے بارہویں باب کا کچھ حصہ میں نے لکھا کچھ ڈاکٹر سیدہ نے۔ میں نے اپنا کام مکمل کر کے بیورو کو بھیج دیا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بہت تفصیل سے کام کیا۔ اس لئے انہوں نے زیادہ وقت لیا۔ میں نے اپنے اوراق دلّی سے واپس منگوا کر ان میں کہیں کہیں ترمیم کی اب دونوں مصنفوں کی نگارشات سمو کر کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔'' (۹۶)

ڈاکٹر گیان چند اور سیدہ جعفر کی یہ مشترکہ کاوش ادب کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے کتاب کی ضخامت اور ابواب بندی کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ کتابِ مذکورہ کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری اکثر اوقات اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر ایک ایک باب دو سو صفحات سے تجاوز کرے گا تو اس کو ختم کرنا قاری کے لئے بہت مشکل ہو گا۔
کتاب کی تمام جلدیں قدیم ادب کا احاطہ کرتی ہیں۔ دکنی ادب موضوع خاص جب کہ شمالی ہند کے میر و سوؔدا کے دور کو بھی مفصل بیان کیا گیا ہے۔ ابواب کے عنوانات نہایت دلکش ہیں جن کو دیکھ کر کتاب مذکورہ کو تفصیل سے پڑھنے کو دل کرتا ہے۔

۲۰۔ قندِ اُردو (حافظ جلال الدین احمد زینبی)

اُردو شاعری اور نثر کی تاریخ کو محفوظ کرنے کے لئے جن مؤرخین نے اپنی خدمات پیش کی ہیں ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ تاریخی واقعات اگر چہ مشترکہ ہیں لیکن بیان کرنے کا انداز ہر مؤرخ کا اپنا ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب بھی تواریخ ادبیاتِ اُردو کا سلسلہ رواں دواں ہے۔ جب بھی مؤرخ کو اس میں ذرا سی گنجائش نظر آتی ہے وہ اس کی تاریخ لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ حافظ جلال الدین احمد جعفری زینبی بھی اُردو مؤرخین میں ایک معتبر نام ہے۔ انہوں نے قندِ اُردو کے نام سے اُردو ادب کی تاریخ مرتب کی جو شاعری اور نثر دونوں کا احاطہ کرتی ہے۔ مصنف موصوف کا انداز باقی تمام مؤرخین سے بالکل مختلف ہے۔ انہوں نے شاعری اور نثر میں چند چیدہ شخصیات اور فن پاروں پر بات کی ہے جو ایک طرح سے اُردو ادب کی منفرد تاریخ ہے۔ حصّہ نثر کی شخصیات میر امن، رجب علی بیگ سرور مرزا غالب، سر سید احمد خان، غلام غوث بے خبر، محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ دہلوی، مولوی نذیر احمد دہلوی، رتن ناتھ سرشار، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، عبدالحلیم شرر اور عبدالرشید دہلوی جبکہ شاعری میں مرزا رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر تقی میر، خواجہ حیدر علی آتش، شیخ امام بخش ناسخ، مرزا غالب، شیخ ابراہیم ذوق، انیس و دبیر، تسلیم، جلال، علامہ اقبال اور اکبر حسین رضوی شامل ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں مصنف خود لکھتے ہیں:

> ''اُس میں پہلے میر امن دہلوی اور سرور لکھنوی کے کلام (نثر) سے تھوڑا تھوڑا انتخاب اس غرض سے کیا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ابتداء میں دہلی اور لکھنؤ کی تحریر کا کیا رنگ تھا اس کے بعد اور لوگوں کے کلام کا انتخاب رکھا گیا ہے اس کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر مصنفین کے سن وفات کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ غالب سب سے اوّل وہ شخص ہیں جنہوں نے انشاء پردازی کا رنگ پلٹا۔ سر سیدؔ نے اُردو نثر کو قدیم شاہراہ سے پھیر کر سادگی پیدا کر دی اور اُردو زبان میں مضمون نویسی اور لیکچر وغیرہ کی راہ کھول دی اور اُردو زبان کی ترقی اور اس کی بقاء کے لئے کوئی امکانی تدبیر اٹھا نہیں رکھی۔ آزاد کا کوئی خاص رنگ نثر میں نہیں ہے مگر ان کو اُردو نثر لکھنے میں ایسی کامل قدرت تھی کہ رنگین اور سادہ، آسان اور مشکل ۔ ہر طرح کی عبارت لکھ سکتے تھے اور جس رنگ کی عبارت لکھتے تھے دل آویز ہوتی تھی۔ حالی اگر چہ نثر میں کسی خاص طرز کے موجد نہیں مگر ان کا رنگ تحریر سر سیدؔ اور آزاد کے بعد سب پر فوق لے گیا۔ مولوی نذیر احمد دہلوی کا کلام دہلی کی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ شرر ناول اور خیالی مضامین

یا مناظر قدرت یا کسی سین کے عمدہ پیرائے میں ادا کرنے کے بادشاہ ہیں۔شبلی نعمانی کا طرز تحریر سادہ ہے اور اس قدر دل آویز کہ قابل رشک ہے پنڈت رتن ناتھ سرشار جدید طرز فسانہ نویسی کے موجد ہیں۔مولوی ذکاءاللہ کی زبان میں اگرچہ کوئی خاص بات نہیں مگر سادگی اور بے ساختہ پن اور ظرافت کا چٹخارا زیادہ ہے اور جس قدر اُردو زبان میں ان کی تصنیفات ہیں کسی اور کی نہ ہوں گی۔منشی غلام غوث بے خبر غالب کے ہمعصر اور ان کے قدم بقدم چلتے ہیں شہید رنگین عبارت لاجواب لکھتے ہیں۔مولوی عبدالرشید صاحب نے زندگی کے منازل کا ایک سچّا فوٹو اتارا ہے کہ قابل دید ہے۔‘‘(۹۷)

مصنف نے ان ۲۷ شعرا و ادبا کی شعری و نثری خدمات کا آغاز وارتقاء پیش کیا ہے۔ہر شخصیت کے تعارف میں اس کا عہد اور رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔شعراء کا کلام اور نثر نگاروں کے اقتباسات بھی دیئے ہیں۔ حصّہ نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’نظم میں شعرائے اُردو کے ارکانِ ثلاثہ کے کلام سے پہلے انتخاب لیا گیا اس کے بعد اور شعراء کا۔یہ امر مسلّم ہے کہ فارسی طرز کے زوردار قصائد ابتداً سودا کے برابر اور آخر زمانہ میں ذوق سے بڑھ کر کسی نے نہیں لکھے تصوّف جو ایشیائی شاعری کا جز و اعظم ہے۔میر درد سے بہتر آج تک کوئی نہیں لکھ سکا۔ زبان کی سلاست جیسی میر تقی میر میں ہے کسی کو نصیب نہیں ہوئی اور سودا، میر، درد یہ وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے محض شاعری ہی نہیں کی بلکہ زبان کو تمام عیوب سے پاک وصاف کیا۔ناسخ اور آتش کو بھی زبان کی خدمت میں وہی رتبہ حاصل ہے جو سودا، میر، درد کو تھا۔انہوں نے جو عیوب باقی رہ گئے تھے ان کو درست کر کے زبان کو نہایت فصیح و بلیغ بنا دیا ہے۔اس وقت سے لکھنؤ میں یہی زبان جاری ہوگئی۔ان کا کلام لکھنؤ کی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔غالب سے بڑھ کر فلسفیانہ کلام کسی نے نہیں لکھا۔ انیسؔ اور دبیرؔ نے نظم اُردو میں جس قدر وسعت دی اور اُردو زبان کو جس قدر ان سے مدد پہونچی۔آخر زمانہ کسی سے نہیں پہونچی۔صدہا جدید محاورے ایجاد کئے۔ صدہا جدید الفاظ زبان میں داخل کردے۔امیر اللہ تسلیم کی مثنویاں لاجواب ہیں۔حالی نظم میں طرز جدید کے موجد اور مسلّم الثبوت استاد ہیں اقبال حالی کے قدم بقدم چلتے ہیں اور اس زمانہ میں ان کا طرز نہایت مقبول ہے۔ میر اکبر حسین اپنے طرز خاص میں مسلّم الثبوت استاد ہیں۔‘‘ (۹۸)

غرض یہ انہوں نے ہر شخصیت کا تذکرہ خاکے کے انداز میں پیش کیا ہے مثلاً رجب علی بیگ سرور کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’مرزا رجب علی بیگ سرور مرزا اصغر علی لکھنوی کے بیٹے آغا نوازش حسین خان نوازش کے شاگرد تھے

لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مذاق سخن رکھتے تھے۔ اُردو نثر اچھی لکھتے تھے۔ واجد علی شاہی دور کے مشہور نثار اور مقفیٰ نگار تھے۔ شگوفۂ محبت گلزارِ سرور انشائے سرور، سرور سلطانی۔ فسانہ عجائب ان کی تصانیف سے یادگار ہیں۔'' (۹۹)

کتاب مذکورہ میں مصنف کا نام معتبر ہے۔ مصنف نے قندِ اُردو کے نام سے جو تاریخ مرتب کی ان کا انداز باقی تمام مؤرخین سے بالکل مختلف ہے انہوں نے شاعری اور نثر میں چند چیدہ چیدہ شخصیات اور فن پاروں پر بات کی ہے جو ایک طرح سے اُردو ادب کی منفرد تاریخ ہے اس لئے کتاب مذکورہ عمومی تاریخ نگاری میں خاصی اہمیت کی حامل ہے۔

۲۱۔ اُردو ادب کی تاریخ (ڈاکٹر تبسم کاشمیری)

اشاعت اور زمانے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی یہ کتاب تمام تواریخ سے عمر میں بہت چھوٹی ہے لیکن اس میں تحقیق اور تنقید کی آمیزش کا بغور اور غیر جانب دارانہ اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ادب کی تاریخ کی اشد ضرورت تھی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مطابق اچھے ادبی مؤرخ کو ادبی تاریخ اور سماجی علوم کے مابین باہمی عمل پر گہری نظر رکھنی چاہیئے۔ اس حوالے سے کہتے ہیں:

''دورِ حاضر میں ادبی تاریخ کو ایک وسیع زمانی تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسے محض ادب کے محدود شعبہ سے بہرحال آزاد ہونا چاہئے۔ اس لئے ادبی تاریخ کے مؤرخ کی بصیرت، سیاسی، سماجی یا واقعاتی تاریخ کے مؤرخ سے زیادہ ہونی چاہئے۔ سماجیات کا مؤرخ اپنے محدود دائرہ کار میں سمٹتا ہوا تاریخ کا سفر کرتا ہے جب کہ ادبی مؤرخ تاریخ کے تمام دھاروں اور شعبوں پر بہ یک نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھتا ہے''۔ (۱۰۰)

ڈاکٹر تبسم کاشیری نے اپنی کتاب میں آغاز سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کی ادبی تاریخ کا احاطہ کیا ہے۔ انہوں نے پہلی دفعہ روایتی تاریخ نگاری سے ہٹ کر کوئی بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے بعض مؤرخین اس پر اعتراض بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے صرف معلومات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ساتھ تجزیہ بھی کیا ہے جو ادب کے قاری اور محقق کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

''ادبی تاریخ ماضی کی بازیافت ہے۔ اس کا اہم مقصد گئے گزرے زمانوں کو زندہ کرنا ہے۔ ادبی مؤرخ ماضی کے اندھیرے منظروں میں سفر کرتا ہے۔ خوابیدہ داستانوں کو بیدار کرنا ہے۔ گرد میں دبی ہوئی دستاویزات کو جھاڑتا ہے اور ان دستاویزات کے اوراق پر ماضی کے نام اور کرداروں سے متعارف ہوتا ہے اور ان سے مکالمہ کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ تاریخ کے ان کرداروں سے مانوس ہوتا

جاتا ہےاوراس کی دوستی ان لوگوں سے بڑھتی جاتی ہے۔ادبی مؤرخ کوحال سے سفر کرتے ہوئے
ماضی کے ان زمانوں تک جانا پڑتا ہے کہ جن زمانوں میں یہ ادبی کردار زندہ تھے اور اپنے تخلیقی عمل
سے اپنے عہد کو متاثر کر رہے تھے۔مؤرخ ان کرداروں کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ان کی
تنہائیوں اور مجالس میں حاضر رہتا ہے اور ان سے تخلیقی عمل کے بارے میں بات چیت کرتا ہے۔
ماضی کی بازیافت کے لئے ادبی مؤرخ کا متخیّلہ نہایت تیز ہونا چاہئے۔اس کا متخیّلہ بے جان ماضی
میں روح ڈال دیتا ہے۔ساکن زمانوں کو متحرک کر دیتا ہے اور سوئی ہوئی مجلسوں میں روح ڈال دیتا
ہے۔اس سلسلے میں سب سے خوبصورت مثال ''آبِ حیات'' کی ہے جہاں ادبی کرداروں کی نقل و
حرکت گفتگو،ان کی زندہ دلی اور تخلیقی زندگی کے نہایت جان دار مرقع بنائے گئے ہیں''۔(۱۰۱)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے کتاب مذکورہ کی تکمیل جاپان میں کی جوان کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔کتاب میں اُردو ادب کی ابتداء سے لے کر مرزا غالب کے دور تک تابانی اور رخشندہ تر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔انہوں نے واقعات کو محدود کرنے کی بجائے ذاتی شعور اور تجربے کی بناء پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس لیے کتاب میں ذاتی تجربات بہت اچھے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔کتاب کا مطالعہ دلچسپ اور معلومات بہم پہنچاتا ہے۔انہوں نے ماضی کو جس قدر سمیٹا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔مثال کے طور پر دبستان لکھنؤ کی تاریخ بیان کرنے کے بعد اس پر ذاتی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''فکری اور عسکری مجہولیت کے نتیجہ میں لکھنؤ کی تہذیب نے اپنی معاشرتی فعالیت کو ثقافتی سطحوں پر
بحال کرنے کی کوشش کی۔وہ قوت اور توانائی جو فکر و عمل اور عسکری زندگی میں صرف نہ ہو سکتی تھی اب
فن اور ثقافت کے میدان میں صرف ہونے لگی''۔(۱۰۲)

ڈاکٹر موصوف نے ادبی تاریخ لکھتے ہوئے ادبی مؤرخین کو مشورے بھی دیئے ہیں۔اس حوالے سے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''ادبی مؤرخ کا کام صرف واقعات اور حقائق تک محدود نہیں ہے وہ واقعات اور حقائق سے آگے
بڑھ کر ایک اور اہم فریضہ سرانجام دیتا ہے۔واقعات اور حقائق اور تاریخ کے مطالعے سے وہ ادبی
تاریخ کے کسی دور، رجحان، نظریے یا کسی شخصیت کے بارے میں ایک وژن مہیا کرتا ہے۔ادب کی
تاریخ کو جو قوت ادبی تاریخ بناتی ہے وہ مؤرخ کا وژن ہے''۔(۱۰۳)

اُردو کی ادبی تواریخ میں بیش تر کتب ایسی ہیں جو نثر یا شاعری کا الگ الگ احاطہ کرتی ہیں۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ایسی کوئی تقسیم کاری کا کام نہیں کیا۔انہوں نے شاعری اور نثر کو الگ الگ یعنی اجنبیت کی راہ دکھانے کی بجائے نظم و نثر دونوں کو ساتھ ساتھ بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی اُردو ادب کی تاریخ ،کل انیس (۱۹) ابواب پر مشتمل ہے۔پہلا باب زبان و ادب کے ابتدائی

تجزیے کو پیش کرتا ہے جس میں فاضل مصنف نے ادب کا سیر حاصل طویل تبصرہ بیان کیا ہے جسے پڑھ کر مصنف کو داد و تحسین دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ پہلا باب ہی مصنف کی علمی قابلیت اور تاریخی تجربے کا عکاس ہے۔ باقی اٹھارہ ابواب میں زبان و ادب کی ابتداء سے لے کر جنگ آزادی تک اُردو نظم و نثر کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تحقیقی و تنقیدی تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ کتاب جامع اور منفرد اسلوب میں لکھی گئی ہے۔

۲۲۔ اُردو ادب کی جستجو (رالف رسل)

رالف رسل کی کتاب ''اُردو ادب کی جستجو'' منتخب تاریخ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت ۲۰۰۳ء میں انجمن ترقی اُردو پاکستان سے ہوئی۔ اس کا ترجمہ محمد سرور رِجا نے کیا۔ کتاب کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کو اُردو ادب کی ذاتی انتخاب پر مبنی تاریخ کہا جاسکتا ہے۔ ذاتی اس لیے کہ میں نے ان باتوں پر زور دینا پسند کیا ہے جنہوں نے مجھے ذاتی طور پر اُردو ادب کے چالیس سالہ مطالعہ کے دوران سب سے زیادہ اپیل کی ہے۔ میں نے اسے اُردو ادب کی جستجو کا عنوان دیا ہے کیونکہ اس کا مطالعہ اکثر اوقات میرے لئے ایک جستجو ہی تھا۔ اُن معانی کی جستجو جن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے ان کی تلاش میں ثابت قدمی سے کام لیا تو انہیں (ایک نہ ایک دن) ضرور پالوں گا اور بالآخر پا بھی لیا۔ (۱۰۴)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں مصنف کی محنت اور بے باکی یقیناً قابل داد ہے۔ اُردو ادب کی جستجو کا ترجمہ محمد سرور رِجا نے نہایت دیانت داری سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''رالف رسل صاحب گزشتہ نصف صدی کے زائد عرصے سے انگریزی دان دنیا میں اُردو کے تعارف، تشہیر و تدریس کی قابل قدر اور لائق تحسین کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ ان کی انگریزی کتاب کا ترجمہ کرنے کے لئے قرعہ فال میرے نام پڑا ہے تو میں نے اسے اپنا اعزاز سمجھا۔''
>
> ''کتاب کا ترجمہ کرتے ہوئے میں نے کوشش کی ہے کہ رسل صاحب کی انگریزی کی روح کو اُردو کے قالب میں اس طرح ڈھالوں کہ وہاں پہنچ کر وہ یہ محسوس نہ کرے کہ اسے ایک مردہ جسم میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ میں نے حتی الامکان انگریزی محاورے کا بدل اُردو محاورے میں تلاش کیا اور اس کے ساتھ ساتھ بالعموم لغوی معنوں کا التزام بھی پیش نظر رکھا۔ بہر حال مدعا یہ تھا کہ اُردو متن سے انگریزی کی بجائے اُردو کی خوشبو آئے۔'' (۱۰۵)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مترجم نے کتاب کو بہ حیثیت مجموعی بہت دلچسپ پایا اور ترجمہ ایسے کیا کہ اُردو متن سے انگریزی کی بجائے اُردو کی خوشبو نظر آنے لگی۔

مصنف موصوف کی خدمات سے کسی کو انکار نہیں انہوں نے اس کتاب میں باب اوّل سے لے کر باب چہاردہم ابواب ترتیب دیئے جو اپنی اپنی نوعیت اور انفرادیت کے اعتبار سے اہم ہیں۔ ابواب کی فہرست یوں ہے:

حصہ اوّل: کلاسیکی شاعری ۱۸ ویں صدی سے ۱۹ ویں صدی کے وسط تک

باب اوّل: اُردو ادب کے گلشن کی پہلی بہار

باب دوّم: اُردو غزل کا شعور

باب سوّم: میرؔ، شاعر اور انسان

باب چہارم: غزلیاتِ غالبؔ

حصہ دوّم: برطانوی راج کے ردِعمل کا ادب (۱۸۵۷ء تا ۱۹۲۲ء)

باب پنجم: راج اور مسلم ردِّعمل

باب ششم: جدید ناول کا ارتقاء

باب ہفتم: نذیر احمد اور تحریک علی گڑھ

باب ہشتم: شاعری کے بارے میں بدلتے ہوئے تصورات آزادؔ اور حالیؔ

باب نہم: اکبر الہٰ آبادی کا طنز و مزاح

باب دہم: اقبال اور ان کا پیغام

حصہ سوم: ادب اور عوام (۱۹۲۰ء سے آگے)

باب یازدہم: حصولِ آزادی اور اس کے بعد

باب دوازدہم: پریم چند اور افسانہ

باب سیزدہم: ترقی پسند مصنفین کی تحریک

باب چہاردہم: فیض احمد فیض، شاعری، سیاست اور پاکستان

مصنف نے ابواب میں مواد کی ترتیب جس انداز سے پیش کی ہے کہ اسے دیکھ کر قاری کا دل خود بخود کتاب پڑھنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے مصنف خود کہتے ہیں:

''ہر باب اپنی جگہ پر مکمل ہے۔ ابواب کو تاریخ وار گروپوں میں تقسیم کیا ہے۔ اگر آپ پہلے ہی اُردو ادب سے واقف ہیں تو آپ انہیں کسی بھی ترتیب میں پڑھ سکتے ہیں۔ جس موضوع سے آپ کو سب

سے زیادہ دلچسپی ہوا سے پہلے پڑھ لیں لیکن اس مضمون میں آپ کے ہر اہم ادیب اور ہر اہم موضوع کا ذکر نہیں ملے گا اور نہ ہی میں نے ہر مضمون کی جسے میں نے شامل کیا ہے۔ ایک جیسی تفصیل دی ہے۔ بہت سے ابواب میں ٹھوس اور جامع مطالعہ کا عکس موجود ہے لیکن چند ایسے بھی ہیں جس میں متعلقہ موضوع کے سرسری خاکے سے بڑھ کر کچھ نہیں دیا گیا۔'' (۱۰۶)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کے ہر باب میں ٹھوس جامع مطالعہ اور علم میں اضافے کا عکس موجود ہے۔ کتاب مذکورہ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس میں مصنف نے باب اوّل میں ''اُردو ادب کے گلشن کی پہلی بہار'' میں تاریخِ ہند کے بارے میں مسلمانوں کا نظریہ بھی بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تاریخِ ہند کے بارے میں مسلمان قوم کے نظریے کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ خود کو ہندوستانی آبادی کا اعلیٰ وارفع طبقہ تصور کرتے تھے اور یہ کہ وہ ملک پر ان خصوصی اوصاف کی بناء پر حکومت کرتے تھے جو اللہ نے انہیں اپنے خاص فضل وکرم سے عنایت فرمائے تھے۔ برصغیر کے شمالی علاقوں پر مسلمان بادشاہوں نے کم وبیش پانچ سو سال حکومت کی یعنی ۱۷۰۷ء تک جب آخری جلیل القدر مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے وفات پائی۔ ان کی سلطنت وسطیٰ سطح مرتفع تک پھیلی ہوئی تھی۔ وقتاً فوقتاً اس کی حدیں دور جنوب تک پہنچ جاتی ہیں۔ مسلمان اس عرصے میں ہی نہیں بلکہ ہمیشہ تعداد کے اعتبار سے اقلیت میں رہے۔ گو اقلیتی فرقہ ہونے کے باوجود ان کی تعداد خاصی بڑی اور طاقت میں بہت عظیم رہی۔ انہیں اپنی عددی اقلیت کا احساس ہمیشہ دامن گیر رہا اور اس احساس نے انہیں اس بات پر اور بھی نازاں کر دیا کہ انہیں ہندوستان کی تاریخ کو مرتب کرنے کا اختیار حاصل رہا ہے۔'' (۱۰۷)

مصنف نے باب دوم میں اُردو غزل کا شعور، باب سوم میں میرؔ، شاعر اور انسان کو اسی طرح باب چہارم میں غزلیات غالب کو بیان کیا ہے۔ غزلیاتِ غالبؔ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ساری دنیا مانتی ہے کہ غالب انیسویں صدی کے عظیم ترین غزل گو شاعر ہیں اور اسی طرح یہ بھی مانتی ہے کہ ان کی غزلوں میں خاص جدّت اور امتیازی رنگ پایا جاتا ہے''۔ (۱۰۸)

کتاب ہٰذا میں جہاں باب دوم، سوم اور چہارم انفرادیت کے حامل ہیں وہاں کتاب میں باب پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم، نہم و دہم کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور کسی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ باب دہم میں اقبال اور ان کا پیغام میں اقبال کی اہمیت کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

''میرے ایک پاکستانی دوست نے ایک روز مجھ سے کہا: ''پاکستانیوں کے یہاں تین اجزائے عقیدت ہیں۔ اسلام، قائداعظم اور علامہ اقبال۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پاکستان میں قائد

اعظم کے خلاف تنقید کی اشاعت قانوناً جرم ہے۔ نیز اقبال کے بارے میں بھی اسی قسم کا قانون نافذ کرنے کے لئے تحریک ہوئی تھی! بہرکیف، پاکستانی اقبال پر بے انتہا فخر کرتے ہیں۔ بہت سے پاکستانی ان کو اُردو کا عظیم ترین شاعر مانتے ہیں اور تمام پاکستانی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اقبال ایک خاص اعتبار سے ان کا اپنا شاعر ہے'' ۔(۱۰۹)

کتاب میں حصہ سوم ادب اور عوام (۱۹۲۰ء سے آگے) کے متعلق ہے۔ اس میں حصول آزادی اور اس کے بعد پریم چند اور افسانہ، ترقی پسند مصنفین کی تحریک اور فیض احمد فیض، شاعری، سیاست اور پاکستان کے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مثلاً فیض احمد فیض۔ شاعری، سیاست اور پاکستان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''فیض کی زندگی کا اہم ترین پہلو ان کی شاعری ہے۔ فیض نے ایک انسان سے زیادہ ایک شاعر کی حیثیت سے اہل پاکستان کو نمایاں طور پر متاثر کیا ہے۔۔۔ فیض کی شاعری ان کے جذبات اور تمناؤں کو وہ اظہار بخشتی ہے جس کی انہیں ضرورت ہے اور جس کے وہ مستحق ہیں اور یہ شاعری مدت تک ظلم سے نفرت، پسے ہوئے لوگوں سے ہمدردی اور ایک خوب تر دنیا کی خواہش کے جذبات ابھارتی رہے گی'' ۔(۱۱۰)

فیض نے شاعر کی حیثیت سے اہلِ پاکستان کو جہاں متاثر کیا ہے وہاں ان کی شاعری ظلم سے نفرت، پسے ہوئے لوگوں سے ہمدردی اور ایک خوب تر دنیا کی خواہش کے جذبات کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ کتاب مذکورہ کی بہت اہمیت ہے۔ مصنف نے اس کتاب کی تحقیق میں جو محنت اور لگن کا ثبوت دیا ہے وہ لائق تحسین اور مبارک باد کے حقدار ہیں۔

۲۳۔ تاریخِ نقد (پروفیسر سید وقار احمد رضوی)

پروفیسر وقار احمد رضوی کی کتاب ''تاریخِ نقد'' تاریخ کی منفرد کتاب ہے اُردو میں تواریخ لکھنے کا زیادہ رجحان تو صرف ادب کی تاریخ لکھنے کی طرف رہا ہے لیکن اس کتاب میں پہلی دفعہ اُردو تنقید کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام یہ کتاب ۲۰۰۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

اُردو ادب میں ادبی تاریخ پر مشتمل سینکڑوں کتب اپنے اپنے حوالے سے کلاسیکی ادب کی معلومات دیتی نظر آتی ہیں تنقید ایک ایسا شعبہ ہے جس کی تاریخ کسی کی مستند کتاب نہیں ملتی پروفیسر سید وقار احمد رضوی نے اس کتاب میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اُردو اور عالمی ادب کے تناظر میں تنقید کی تاریخ اور اصولِ تنقید پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ کاوش اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں عالمی تنقید کی تاریخ کو بھی پہلی بار مدّون کر دیا ہے اس لئے تنقید کے سنجیدہ قاری کے لئے یہ کتاب بہت سی معلومات فراہم کرتی ہے۔

''تاریخِ نقد'' کو آٹھ مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔آخری باب اپنی ضرورت اور افادیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے کیونکہ اس میں مشرقی تنقید کی تاریخ مدون کی گئی ہے اور مشرقی تنقید میں عربی، فارسی اور اُردو تینوں تنقیدیں شامل ہیں۔جبکہ مغربی تنقید کے لئے بھی ایک باب کا اہتمام کیا گیا ہے جس میں یونانی، انگریزی اور اٹھارویں صدی کے بعد کی مغربی تنقید کو مرتب کیا گیا ہے۔

تاریخ نقد کا پہلا باب تذکرہ نگاری اور کلاسیکی تنقید کو پرکھنے کے لئے علم بیان، علم بدیع، فصاحت، بلاغت اور صنعتوں سے بحث کرتا ہے کلاسیکی اور ادبی تاریخ میں تنقید کے اولین نمونے بھی تذکرہ نگاری کے بین السطور میں ملتے ہیں جسے مصنف نے خوب نبھایا ہے۔ پہلے باب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ایک طرف تو تذکرہ نگاری اور علومِ شاعری کی معلومات بخوبی موجود ہیں دوسری طرف تذکرہ نگاروں کی تنقید کے شعور کی جانچ پرکھ بھی واضح ہوتی دکھائی دیتی ہے۔میرے خیال میں مصنف نے اس باب میں بہت کم صفحات پر اتنا کچھ بتادیا ہے جس کی کتب میں بھی نہ سما سکے مصنف تذکرہ نگاروں کے تنقیدی شعور کا احاطہ کرتے ہوئے تفصیلاً لکھتے ہیں:

> ''اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو تذکروں میں نہ صرف شعراء کے تاریخی حالات، سنِ وفات، پیدائش اور وطن وغیرہ کو بتایا گیا ہے بلکہ ان کے کلام پر تنقید وتبصرہ بھی ہے مثلاً ولی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ ایک سخن مسنجم شیریں گفتار شاعر تھا، یا سراج اورنگ آبادی کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کی طبع روشن شمع بزمِ سخن ہے یا خواجہ میر درد کے بارے میں یہ کہنا کہ ان کا دیوان اگرچہ مختصر ہے لیکن حافظ کے کلام کی طرح سراپا انتخاب ہے یا مصحفی کے بارے میں اظہارِ رائے اس طرح کرنا کہ ان کا قصیدہ، غزل اور مثنوی سب بہت خوب ہے۔۔۔۔۔۔لہٰذا یہ کہنا کہ تذکرہ نویس، تنقید سے نابلد تھے بالکل غلط ہے بلکہ ان میں سے بعض تنقیدی جملے مثلاً نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو صوفیانہ کہنا اب تک مروج ہے۔''(۱۱۱)

مصنف نے اس باب میں کلاسیکی عہد کے سینکڑوں تذکروں کی تاریخ کو ظاہر کیا ہے۔اس کے علاوہ آغاز زبان کے سلسلے میں مختلف مؤرخین کی کاوشوں کو بھی اس باب میں سراہا گیا ہے۔مصنف نے ابواب بندی کے ذیل میں چھوٹے چھوٹے ذیلی عنوانات سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ کون سے باب میں کون سا موضوع کتنا اہم ہے۔مغربی اور مشرقی تنقید کے حوالے سے آخری دو ابواب میں تنقید کی تاریخ پوری کتاب پر حاوی ہے بلکہ بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ یہی دو ابواب کتاب مذکورہ کے موضوع کی حد تک کافی ہیں۔تاہم مصنف نے حتیٰ الوسیع کوشش کی ہے کہ کوئی موضوع رہ نہ جائے اس لئے تنقیدی تاریخ کو متفرق ذیلی عنوانات میں مرقوم کردیا ہے۔

یونانی دبستانوں کی تنقید میں سقراط، افلاطون، ارسطو اور چند حکمائے مغرب کی تنقیدی صلاحیتوں کا احاطہ ان کی

تحریروں کے پسِ منظر میں کیا گیا ہے۔ یونانی دبستان تنقید کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ادبی تنقید کا آغاز یونان سے ہوا جس کی ابتداء ہومر کی ایلیڈ پر تنقید سے ہوئی یونانی نظریاتِ تنقید میں جو فلاسفہ ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو۔'' (۱۱۲)

میرا موضوع چونکہ تو اریخ ادبیاتِ اُردو ہے اس لئے یونانی، انگریزی، عربی اور فارسی ادب و تنقید پر بحث کرنا خارج از موضوع ہوگا البتہ اُردو ادب اور ادبی تنقید کی تاریخ جو میرے موضوع سے مطابقت رکھتی ہے اس کی تفصیل درج کرنے کا میرا فرض ہے۔ مصنف نے تاریخِ نقد میں اُردو تنقید کے حوالے سے کم و بیش پچاس ذیلی عنوانات درج کر کے کلاسیکی اور جدید ادب میں مختلف ادباء و شعراء کی تحریروں سے ناقدانہ رویوں کو تلاش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اُردو تنقید سے بحث کرنے سے پہلے اُردو نثر کے قدیم سرمائے پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ اس بات کا اندازہ ہوسکے کہ اُردو تنقید کا آغاز کب سے ہوا جہاں تک اُردو نثر کے قدیم ترین نمونے جواب تک دریافت ہوئے ہیں وہ چھوٹے چھوٹے رسالوں کی شکل میں ہیں جن میں دکن اور گجرات کے فقراء اور اہلِ دل کے اقوال والفاظ قلم بند کیے گئے ہیں۔ یہ رسالے اکثر فارسی اور عربی کی کتابوں کے ترجمے اور زیادہ تر مذہبی رنگ میں ہیں۔'' (۱۱۳)

مصنف نے اُردو تنقید کے پسِ منظر میں کلاسیکی اور جدید ادب کی جزوی تاریخ بھی مکمل کردی ہے چنانچہ سلطنت بہمنی سے لے کر رومانی دبستان تنقید کی تنقیدی کتب کا سرسری حوالہ پیش کیا ہے چند مثالیں دیکھئے مثلاً قطب شاہی دور کے آغاز وارتقاء کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سلطان قلی قطب شاہ ہمدان (ایران) کے قراقولی خاندان کا شہزادہ تھا۔ اپنی جان کی حفاظت کی خاطر بہ عہد محمود شاہ بہمنی دکن پہنچا۔ محمود شاہ بہمنی نے اسے اپنے دربار میں جگہ دی اور قطب الملک کا خطاب دیا۔ تلنگانہ کا صوبہ دار مقرر کیا لیکن بعد میں جب دکن میں طوائف الملو کی پھیلی تو اس نے قطب شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور گولکنڈہ میں سلطنت قطب شاہ کی بنیاد رکھی۔ سلطنتِ قطب شاہی کے آخری تین بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ اس کے جانشیں سلطان محمد قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ اُردو زبان کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ (۱۱۴)

عادل شاہی دور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سلاطین عادل شاہی نے سلاطین بہمنی کی طرح اُردو کی سرپرستی کی۔ ابراہیم عادل شاہ نے سلاطین بہمنی کی طرح فارسی کے بجائے اُردو کو دفتری زبان قرار دیا۔ اکثر سلاطین عادل شاہی خود عالم فاضل تھے۔ علم و فضل اور شاعروں کے قدردان تھے۔ علی عادل شاہ کو زبان اُردو سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس

کے زمانے میں شعروشاعری کا خوب چرچا ہوا۔'' (۱۱۵)

مندرجہ بالا اقتباسات اس بات کا ثبوت ہیں کہ کتاب مذکورہ اپنے موضوع کی مناسبت سے تنقید کی تاریخ ہے لیکن کلاسیکی ادب کی تاریخ بھی خود بخود ترتیب پاتی رہی ہے۔غرض یہ کہ مصنف نے تذکرہ نویسی اُردو ادب کے قدیم نمونے، فورٹ ولیم کالج، دورِ متاخرین، انشائے لطیف روحانی تحریک اور رومانی دبستان تنقید کے چیدہ چیدہ نمونے کتاب مذکورہ میں پیش کردیئے ہیں۔اسی لئے یہ کتاب ایک طرف بحثِ تنقید کا احاطہ کرتی ہے تو دوسری طرف عمومی تاریخ نگاری کے اصولوں پر بھی پورا اترتی ہے۔

۲۴۔ تاریخِ ادبیات اُردو (گارسیں دتاسی)

گارسیں دتاسی کی کتاب بعنوان'' Histoire de la litterature Hindouie et hindoustanie '' کا اُردو ترجمہ لیلیان سکسیتن نازرو نے کیا ہے اور اس کی ترتیب وتدوین اور تقدیم ڈاکٹر معین الدین عقیل نے کی۔ جسے پاکستانی اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی نے فروری ۲۰۱۵ء میں شائع کیا ہے۔سرِ آغاز میں ڈاکٹر سید جعفر احمد لکھتے ہیں:

> ''فرانس سے تعلق رکھنے والے معروف مستشرق گارسیں دتاسی کی تصنیف'' Histoire de la litterature Hindouie et hindoustanie'' کے اُردو ترجمے، تاریخ ادبیاتِ اُردو کی اشاعت کو بلاشبہ اُردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔انیسویں صدی میں لکھی جانے والی یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر چند کہ گارسیس دتاسی کے خطبات، اور تمہیدی خطبات، بہت پہلے اشاعت پذیر ہو چکے تھے تاہم اُردو ادب کی تاریخ پر ان کا یہ بنیادی کام باوجود اُردو میں ترجمہ ہو جانے کے اب تک منصۂ شہود پر نہیں آسکا تھا''۔(۱۱۶)

گارسیں دتاسی کی اُردو کی خدمات بے مثال ہیں۔اس کتاب کی اشاعت سے نہ صرف اُردو تاریخ کے لئے بنیادی مآخذ تک رسائی ہوتی ہے بلکہ گارسیں دتاسی کو بھی خراجِ تحسین پیش کرنے کا موقع ملتا ہے۔جبکہ معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

> '' گارسیں دتاسی (۱۷۹۴ء۔ ۱۸۷۸ء) بلاشبہ انیسویں صدی کے مستشرقین میں اس اعتبار سے سب سے نمایاں اور ممتاز ہے کہ اُردو تحقیق اور مطالعہ اسلام کے ضمن میں اس کے تحقیقی مطالعات نے اپنے موضوعات پر ایسا ذخیرہ مآخذ فراہم کر دیا ہے کہ جن سے استفادہ کیے بغیر اُردو زبان وادب اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ وتہذیب کا کوئی مطالعہ، خصوصاً انیسویں صدی کے تعلق سے، جامع اور

مستند نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک کثیر التصانیف محقق و مصنف تھا اور سب کچھ فرانسیسی زبان میں لکھتا رہا۔ اس کی محض چند کتابیں، اس کے انتقال کے کوئی نصف صدی بعد ہی کسی زبان میں منتقل ہونا شروع ہوئیں یا پھر ہمارے دانشوروں اور محققین و مصنّفین نے اپنے ذوق وشوق اور اپنے مطالعات کے سلسلے میں جب خصوصاً فرانس میں وقت گزارا تو اُردو کے تعلق سے اس کی تحقیقات سے واقفیت حاصل ہونے اور ان کی افادیت و اہمیت کو سمجھنے کی وجہ سے اُردو زبان میں ان کے ترجموں کو ضروری سمجھا اور یوں اس کے ''خطبات'' اور ''تمہیدی خطبات'' جیسے مجموعوں کی صورت میں اس کی تحقیقات بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشروں میں اُردو میں منتقل ہوئیں اور اُردو محققین کے لئے اہم مآخذ ثابت ہوئیں۔ پھر یہی مجموعے قدرے ترمیم و تصیح کے ساتھ سن ساٹھ اور ستر کی دہائی میں شائع ہوئے''۔(۱۱۷)

معین الدین عقیل گارسیں دتاسی کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے خصوصاً تحقیق میں انہیں رہنما کا درجہ دیا ہے۔ جبکہ لیلیان نازرو لکھتی ہیں:

''یہ کتاب میں نے براہ راست فرانسیسی سے اُردو میں ترجمہ کی ہے۔ ممکن ہے میرا ترجمہ زیادہ شگفتہ اور فصیح نہ ہو لیکن میں نے اسے اصل کے مطابق بنانے میں پوری کوشش کی ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اپنے ترجمے کا اصل متن سے مقابلہ کیا ہے۔ ٹائپ کے بعد دوبارہ اس پر نظر ڈالی گئی ہے۔ مصنفین کے ناموں اور تاریخوں کو کئی بار اصل سے ملا کر دیکھا گیا ہے اور ترجمے کو معنوی غلطیوں سے حتی الوسع پاک رکھنے کی کوشش کی گئی ہے''۔(۱۱۸)

گارسیں دتاسی کی کتاب کی اہمیت اس بات سے معلوم ہو جاتی ہے کہ مترجم لیلیان نازرو نے اس کا بار بار مطالعہ کیا اور بعد میں اس کا ترجمہ کیا اور وہ بھی اُردو میں۔ گارسیں دتاسی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''جو زبان شمال اور شمالی مغربی علاقے میں ابھری اس کا آسان اور سیدھا نام بھاشا یا بھاکا بمعنی زبان تھا۔ بعد میں اس کا نام ہندوئی یعنی زبانِ ہندو اور ہندی یعنی زبان ہند پڑ گیا'' (۱۱۹)

گارسیں دتاسی نے اُردو کے مختلف ناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ گارسیں دتاسی بہت ہی جچی تلی رائے دیتے ہیں اور دریا کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ اس کتاب میں شعراء اور مصنفین اُردو کا تذکرہ ہے جو طویل بھی ہے اور مستند بھی۔ ایک شاعر مہدی حسن خان کے بارے میں گارسیں دتاسی لکھتے ہیں:

''آباد۔ مہدی حسن خان پسر غلام جعفر خان۔ وطن لکھنؤ۔ ایک ممتاز ہندوستانی شاعر ہیں۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے اور غزل و واسوخت ان سے یادگار رہیں۔ بہارستان سخن کے نام سے سنہ ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ سے جو کتاب شائع ہوئی ہے اس میں آتش و ناسخ کے ساتھ ساتھ ان کا کچھ کلام بھی

شامل ہے جو۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اوراس کا ذکر ۱۸۵۴ء کے جرنل آف ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال Journal of Asiatic Society of Bengal کی جلد نمبر ۷ صفحہ ۶۴۲ میں کیا گیا ہے جس کا عنوان انگریزی میں The poems of Nasikh, Atish and Abad ہے۔ان کے بعض اشعار مجموعہ واسوخت مطبوعہ دہلی ۱۸۴۹ء میں بھی شائع ہوئے تھے''۔(۱۲۰)

گارسیں دتاسی کا اسلوب سادہ تھا مگر مترجم نے بھی سادہ اسلوب میں لکھا ہے۔اسی طرح سر سید احمد خان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سید احمد سے مندرجہ ذیل کتابیں یادگار ہیں: ۱۔''کتاب پر کارتنا سبہ''۔دہلی سے چھپی ہے۔ ۲۔''آثارالصادید''۔یہ دہلی کی قدیم تاریخی عمارتوں کی تاریخ ہے۔میں نے اس کتاب کے ترجمے ۱۸۶۰ء کے جرنل ایشیا ٹک میں شائع کئے ہیں۔یہ کتاب چھوٹی تقطیع پر ۱۸۴۷ء میں دہلی میں شائع ہوئی ہے۔اس میں خاکے بھی دیئے ہوئے ہیں۔اس کا دوسرا ایڈیشن دو جلدوں میں ۱۸۵۴ء میں نکلا ہے۔اس میں تین باب کے علاوہ اختتامیہ ہے۔پہلے باب میں دہلی کی مختلف حکومتوں کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔دوسرے میں شاہجہان کے تعمیر کردہ دہلی قلعہ اور دہلی کے دوسرے قلعوں کے ساتھ باشندگان دہلی کی تاریخ ہے۔تیسرے باب میں ان عمارتوں کی تفصیل ہے جو بادشاہوں یا بڑے آدمیوں نے دہلی میں تعمیر کرائی ہیں۔اختتامیہ میں اُردو یا ہندوستان کے آغاز وارتقاء پر بحث کی گئی ہے۔ضمیمے میں ۱۶۹ عمارتوں کے خاکے اور نقشے ہیں جن کی تفصیل پہلی جلد میں دی گئی ہے۔اس کتاب کو شیخ ظفر علی نے مطبع احمدی سے شائع کیا ہے۔ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی رپورٹ میں ایک کتاب کا ذکر کیا گیا ہے جس میں دہلی کے قدیم تاریخی عمارتوں کا حال ہے اور جس کے مصنف دہلی کالج کے مولوی سید محمد ہیں۔دراصل یہ سید احمد کی''آثارالصادید'' ہے''۔(۱۲۱)

تاریخ ادبیات اُردو(گارسیں دتاسی) کی کتاب انفرادیت کی حامل ہے۔یہ اساتذہ اور تحقیق کے طلباء کے لئے یہ ایک انمول تحفہ ہے۔کتاب کا مطالعہ کرتے وقت قاری دادو تحسین دینے سے نہیں رہ سکتا۔اسلوب سادہ اور تحقیقانہ ہے۔تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔گارسیں دتاسی نے تحقیق و تنقید کا جونمونہ پیش کیا تھا اسے اُردو میں لیلیان نازرو نے خوب انداز سے پیش کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، طبع تیسویں، ۲۰۱۳ء، ص ۳۳۴

۲۔ آزاد، محمد حسین، آب حیات، خزینہ علم وادب الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص، ص، ص ۱۲، ۱۳، ۱۴

۳۔ ایضاً ص، ص ۸۴، ۸۷

۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص، ص۔۳۳۴، ۳۳۵

۵۔ آزاد، محمد حسین، ص۔۱۰۶

۶۔ ایضاً ص۔۱۱۶

۷۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اُردو، مرزا محمد عسکری مترجم، علمی کتاب خانہ، اُردو بازار، لاہور، س ن، ص۔۳۲۴

۸۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، ''اُردو کی ادبی تاریخ کا ارتقاء'' (ڈاکٹر سید عامر سہیل/نسیم عباس احمر) مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ص۱۰۲

۹۔ عبدالسلام ندوی، شعرالہند (حصہ اوّل) معارف اعظم گڑھ (سلسلہ دارالمصنّفین)، طبع سوم، ۱۹۴۲ء، ص۱۰

۱۰۔ ایضاً ص، ص۳۵، ۳۶

۱۱۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخِ ادبِ اُردو، ایضاً ص، ''ص''

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً ص، ''ق''

۱۴۔ ایضاً ص، ص، ''ل، ق''

۱۵۔ ایضاً ص ۷۰

۱۶۔ ایضاً ص ۱۲۷

۱۷۔ ایضاً ص، ''ص''

۱۸۔ احسن مارہروی، نمونہ منثورات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع نو، ص ۵

۱۹۔ ایضاً ص ۳

۲۰۔ ایضاً ص ۹

۲۱۔ ایضاً ص، ص۔۲۵، ۲۶

۲۲۔ ایضاً ص ۳۲

۲۳۔ ایضاً ص ۴۸
۲۴۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخِ ادب اُردو، المصر اب پبلشرز، ملتان، طبع اوّل، ستمبر ۲۰۰۵ء، ص ۶۳
۲۵۔ ایضاً
۲۶۔ ایضاً
۲۷۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر سید (ایم۔اے۔ڈی لٹ) مختصر تاریخ ادب اُردو، آزاد کتاب گھر، کلاں محل دھلی، س ن، ص ۱
۲۸۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر سید (ایم۔اے۔ڈی لٹ) مختصر تاریخ ادب اُردو، اُردو اکیڈمی سندھ، طبع سوم، ۱۹۷۱ء، ص ۵
۲۹۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر سید (ایم۔اے۔ڈی لٹ) مختصر تاریخ ادب اُردو، آزاد کتاب گھر، کلاں محل دھلی، ص ۳۵
۳۰۔ ایضاً ص ۹۶
۳۱۔ ایضاً ص ۱۳۲
۳۲۔ ایضاً ص، ص ۳۲۱، ۳۲۲
۳۳۔ ایضاً ص ۳۱۹
۳۴۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اُردو، بک کارنر جہلم، پاکستان، ستمبر ۲۰۱۶ء، ص ۱۸
۳۵۔ ایضاً ص ۱۷
۳۶۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخِ اُردو، اُردو اکیڈمی سندھ، طبع چہارم، ۱۹۸۸ء، ص ۱
۳۷۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اُردو، بک کارنر جہلم، پاکستان، ص ۶۰
۳۸۔ ایضاً ص ۸۴
۳۹۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر، تاریخ زبان اُردو، اُردو مرکز لاہور، (صدر دفتر اُردو اکیڈمی سندھ)، ۱۹۶۶ء، ص ۲
۴۰۔ ایضاً ص ۶۴
۴۱۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخِ ادب اُردو، ص ۷۱
۴۲۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، اُردو ادب ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۶ء، مکتبہ خیابان ادب، چیمبر لین روڈ، لاہور، طبع اوّل، ستمبر ۱۹۶۷ء، ص ۱
۴۳۔ ایضاً ص ۱۲۱
۴۴۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخِ ادب اُردو، ص ۷۳
۴۵۔ ابواللیث صدّیقی، ڈاکٹر، آج کا اُردو ادب، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۷۰ء، ص ۲

۴۶۔ ایضاً ص ۵۱

۴۷۔ ایضاً ص، ص ۱۹۵، ۱۹۶

۴۸۔ ایضاً ص، ص ۱۹۹، ۲۰۰

۴۹۔ ایضاً ص ۲۴۶

۵۰۔ ایضاً ص ۲۹۸

۵۱۔ ایضاً ص ۳۶۳

۵۲۔ ایضاً ص ۳۶۵

۵۳۔ ایضاً ص ۳۹۸

۵۴۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخِ ادب اُردو، ص ۱۰۷

۵۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۔۱۱

۵۶۔ ایضاً ص ۱۴

۵۷۔ ایضاً ص ۵۶

۵۸۔ ایضاً ص، ص ۱۲۵، ۱۲۶

۵۹۔ ایضاً ص ۱۱۶

۶۰۔ ایضاً ص ۱۸۶

۶۱۔ ایضاً ص ۲۱۷

۶۲۔ عین الحق فرید کوٹی، اُردو زبان کی قدیم تاریخ، ارسلان پبلی کیشنز لاہور، (مغربی پاکستان) جون ۱۹۷۲ء، ص ۱۴

۶۳۔ ایضاً ص ۷۰

۶۴۔ ایضاً ص ۶۹

۶۵۔ ایضاً ص ۷۲

۶۶۔ عبدالحق، ڈاکٹر، مولوی (بابائے اُردو)، اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، کراچی، طبع چہارم، ۱۹۷۷ء، ص ۲

۶۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد اوّل) مجلس ترقی ادب لاہور، طبع دوم، جنوری ۱۹۸۴ء، ص ۴۱

۶۸۔ عبدالحق، ڈاکٹر، مولوی (بابائے اُردو)، اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، ص، ص ۔۵، ۶

۶۹۔ ایضاً ص،ص ۴۵، ۴۶

۷۰۔ ایضاً ص ۳۴

۷۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردوادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۱۳۹

۷۲۔ محمود بریلوی، پروفیسر، مختصر تاریخ ادب اُردو (باتصویر)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، طبع اوّل ۱۹۸۵ء، ص ۷

۷۳۔ ایضاً ص ۱۵۲

۷۴۔ ایضاً ص ۱۹۵

۷۵۔ ایضاً ص ۳۳۶

۷۶۔ ایضاً ص ۵۴

۷۷۔ محمد اکرام، شیخ، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، طبع ہشد ہم ۱۹۹۴ء اظہار سنز پرنٹرز، لاہور، ص ۵

۷۸۔ ایضاً ص، ص ۲۵، ۲۶

۷۹۔ ایضاً ص ۷۷

۸۰۔ ایضاً ص، ص ۸۷، ۸۸

۸۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردوادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اوّل، فروری ۱۹۹۱ء، ص ۳

۸۲۔ ایضاً ص، ص ۳۱، ۳۲

۸۳۔ ایضاً ص، ص ۲۹، ۳۰

۸۴۔ ابوسعید نورالدین، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات اُردو (حصہ اوّل)، مغربی پاکستان، اُردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۴۱

۸۵۔ ایضاً ص ۴۷

۸۶۔ ایضاً ص، ص ۸۷، ۸۸

۸۷۔ ایضاً ص ۹

۸۸۔ ابوسعید نورالدین، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات اُردو (حصہ دوم)، مغربی پاکستان، اُردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۴۶۵

۸۹۔ ایضاً ص ۱۵

۹۰۔ ایضاً ص ۱۰

۹۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، (اضافہ شدہ ایڈیشن)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۱

۹۲۔ ایضاً ص، ص ۹، ۱۱

۹۳۔ ایضاً ص، ص ۹۴، ۹۵

۹۴۔ ایضاً ص ۱۴۳

۹۵۔ سیدّہ جعفر، پروفیسر، گیان چند، پروفیسر، تاریخ ادب اُردو (جلد اوّل)، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، جولائی، ستمبر ۱۹۹۸ء، ص، ص ۱۳، ۱۴

۹۶۔ ایضاً ص ۱۱

۹۷۔ جلال الدین احمد جعفری، زینبی، مولوی حافظ، قند اُردو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص، ص۔۹، ۱۰۔

۹۸۔ ایضاً ص، ص۔۱۰، ۱۱

۹۹۔ ایضاً ص ۱۸

۱۰۰۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰

۱۰۱۔ ایضاً ص ۱۱

۱۰۲۔ ایضاً ص ۳۸۷

۱۰۳۔ ایضاً ص ۱۴

۱۰۴۔ رالف رسل، اُردو ادب کی جستجو، (محمد سرور رجا مترجم)، انجمن ترقی اُردو پاکستان، گلشن اقبال، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۹

۱۰۵۔ ایضاً ص ۱۲

۱۰۶۔ ایضاً ص ۱۰

۱۰۷۔ ایضاً ص ۴۲

۱۰۸۔ ایضاً ص ۱۲۱

۱۰۹۔ ایضاً ص ۳۱۱

۱۱۰۔ ایضاً ص، ص ۴۴۱، ۴۴۲

۱۱۱۔ وقار احمد رضوی، پروفیسر ڈاکٹر سید، تاریخ نقد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد/کراچی، طبع اوّل، ۲۰۰۸ء، ص، ص ۴۸، ۴۹

۱۱۲۔ ایضاً ص ۱۶۰

۱۱۳۔ ایضاً ص ۲۸۵

۱۱۴۔ ایضاً ص ۲۹۲

۱۱۵۔ ایضاً ص ۲۹۰

۱۱۶۔ گارسیں دتاسی (تاریخ ادبیات اُردو) فرانسیسی سے اُردو مترجم (لیلیان سکسیتن نازرو)، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، طبع اوّل، فروری ۲۰۱۵ء، ص ۷

۱۱۷۔ ایضاً ص ۹

۱۱۸۔ ایضاً ص ۴۰

۱۱۹۔ ایضاً ص ۴۷

۱۲۰۔ ایضاً ص ۱۰۷

۱۲۱۔ ایضاً ص، ص ۴۳۸، ۴۳۹

باب سوم: صنف وار تاریخ نگاری

اُردو ادب کی تاریخ نگاری میں اصناف کی تاریخ بھی بہت اہمیت رکھتی ہے خصوصاً اصناف کی تاریخ نگاری سے اصناف کی ارتقائی صورتِ حال سامنے آتی ہے، موضوعات میں تنوع اور سماجی صورتِ حال بھی سامنے آتی ہے۔ اصناف کی تاریخ سے موضوعات کے ساتھ ساتھ فنی تجربوں اور فن میں ارتقاء کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ ہمیشہ اصناف کا مطالعہ بہت اہم رہا ہے کیونکہ اصناف کے مطالعے سے رجحانات طبع اور احساساتِ انسانی کا بھی علم ہوتا ہے۔

جب اصناف کے مطالعے سے جذبات، احساسات اور فکریات کا ارتقاء سامنے آتا ہے تو اصناف کا مزاج بھی سمجھ آجاتا ہے۔ غزل، قصیدہ، مرثیہ، داستان، ناول، ڈراما، افسانہ اپنے اپنے مزاج کے اعتبار سے الگ الگ تخلیقات سے پیش کرنے کے طریقے ہیں۔ اصناف کی تاریخ نگاری سے اصناف کی مزاج شناسی سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

صنف وار تاریخ نگاری میں جو کتابیں شامل کی گئیں ہیں۔ ان کی ترتیبِ نو زمانی اعتبار سے کی گئی ہے۔ گلِ رعنا سے لے کر اُردو افسانہ اور افسانہ نگار تک ان تمام کتب کو شامل کیا گیا ہے جو اصناف کی تاریخ نگاری سے اصناف کی ارتقائی صورت حال جو کہ سامنے لائیں ہیں اور مؤرخ کو بہت سا مواد فراہم کرتی ہیں۔

۱۔ گُلِ رَعْنا (حکیم سید عبدالحیی)

حکیم سید عبدالحیی کی کتاب گُل رعنا کا بار اوّل ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ گل رعنا کے مصنف مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ’’انسان کہ دل میں کسی چیز کہ دیکھنے یا سننے یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے ذوق وشوق، عشق ومحبت، حیرت واستعجاب، طیش وغضب، رنج وغم وغیرہ کی جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں ان کو اس طرح سے موزوں کر کے ادا کرنا کہ جو اثر اس کہ دل میں ہے وہی دوسروں پر چھا جائے اس کا نام شاعری ہے۔‘‘(۱)

گل رعنا کہ پیش نظر اُردو شاعری ہے۔ گویا گل رعنا شاعری کی تاریخ ہمارے سامنے لاتی ہے۔ مصنف اُردو زبان اور اُردو شاعری کی تاریخ کے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ’’زبان اُردو کے ظہور پر خیال کرو اور اس کی تصنیفات پڑھو تو اس میں نثر سے پہلے نظم آئے گی جب ملکی زبانوں نے اپنی وسعت اخلاق سے عربی فارسی الفاظ کہ مہمانوں کو جگہ دی تو طبیعتوں میں اس

قدرتی روئیدگی نے بھی زور کیا لیکن وہ صد ہا سال تک دوہروں کے رنگ میں ظہور کرتی رہی، یعنی فارسی کی بحریں اور فارسی کہ خیالات ایک زمانہ تک اس میں گھسنے نہ پائے۔ جہاں تک چھان بین کی گئی ہے سب سے پہلے امیر خسرو نے جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت وایجاد رکھتی تھی، ملکِ سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے انشاء پردازی کا ایک طلسم خانہ کھولا، مکرنی، انمل، دوسخنی، قسم قسم کے گیت اور پہلیاں خاص ان کے آئینہ کمال کا جوہر ہیں ''خالقِ باری'' کو بھی ان ہی کی طبع رسا کا نتیجہ سمجھو، تو اس حیثیت سے اس کو اُردو نظم کی داغ بیل قرار دینا ایک حد تک ٹھیک ہے مگر اس کی کیا سند ہے کہ یہ انہی کی تصنیف ہے۔ ایسی زبانی روایتوں سے جو کتبوں کے ملّا ایک دوسرے سے لیتے چلے آئے تاریخ کی بنیاد نہیں پڑتی پہیلیوں اور گیتوں کی حالت دوسری ہے ان کی بنیاد مضبوط چٹان پر قائم ہے۔ اسی طرح سے امیر خسرو نے اختر عین موسیقی کے راگ اور راگنیوں میں سے ہیں ان کی سند بڑی پکی ہے۔ بہر حال اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس کی داغ بیل امیر خسرو کی ڈالی ہوئی ہے۔'' (۲)

گلِ رعنا میں جہاں اُردو زبان اور اُردو شاعری کی تاریخ کو واضح کیا گیا ہے وہاں مصنف نے طبقہ متقدمین، طبقہ متوسطین اور طبقہ متاخرین سے شعراء کا جائزہ لیا ہے مثلاً طبقہ متقدمین میں دورِ اوّل ہے جس میں نصرتی دور، دورِ دوم میں شعراء دکن وغیرہ جب کہ تیسرے دور میں شاہ مبارک آبرو اور اشرف علی خان شامل ہیں۔ اسی طرح متوسطین (دورِ اوّل) جانِ جاناںؔ، رفیع سودا، میر تقی میر وغیرہ جب کہ متاخرین میں دورِ اوّل اور دورِ دوم کہ شعراء ناسخ سے لیکر انیس تک کا تذکرہ ہے۔ متقدمین میں سے نصرتی کہ بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ محمد عادل شاہ اور اس کے بیٹے علی عادل شاہ کے زمانہ کے شاعر ہیں اور اپنے وقت کہ ملک الشعراء تھے، افسوس ہے کہ ان کے حالات گمنامی کے پردہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ نام ونسب تک کا ہم کو علم نہیں۔ زبیری نے بساتین السلاطین (تاریخ بیجاپور) میں ان کا ذکر کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ان کی تصنیفات میں گلشنِ عشق ایک مثنوی ہے جس میں منوہر کنور اور مدمالتی کی عشق بازی کا قصہ نظم کیا ہے۔ دوسری کتاب علی نامہ ہے۔ شاہنامہ فردوسی کا جواب ۱۰۷۶ھ میں لکھا تھا۔ جس میں علی عادل شاہ کی فتوحات اور اس کے زمانہ کے کارنامے نظم کئے ہیں۔ تیسرا مجموعہ قصائد کا ہے، چوتھا غزبوں کا دیوان ہے۔'' (۳)

متقدمین نے اُردو شاعری کو جو سرمایہ شعری دیا اس کو مصنف نے بہت عمدہ اور محققانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب سے تاریخِ شعر واضح ہوجاتی ہے۔ متوسطین کے شعراء میں جانِ جاناں کہ بارے میں لکھتے ہیں:

''شمس الدین جانِ جاناں نام، مظہر تخلص، والد کا نام مرزا جان تھا۔ عالمگیر مرحوم کہ دربار میں

صاحبِ منصب تھے۔نسب ان کے باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے۔ماں بیجا پور کہ شریف گھرانے سے تھیں، دادا بھی دربارِ شاہی میں صاحبِ منصب تھے۔دادی اسد خان وزیر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں ان رشتوں سے تیموری خاندان کہ نواسے تھے، کالا باغ علاقہ مالوہ میں ۱۱ رمضان ۱۱۱۱ھ کو پیدا ہوئے۔عالمگیر مرحوم کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ ''پسر جان پدری باشد'' اس کا نام ہم نے جانِ جاناں رکھا۔کثرتِ استعمال سے جانِ جاناں ہوگیا۔''(۴)

جانِ جاناں کی اہمیت اور اُردو شاعری میں مقام جو بھی ہو وہ تو مسلم ہے ان کے سوانح کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ خالصتاً محققانہ ہے۔ متاخرین میں سے ناسخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' شیخ امام بخش نام، ناسخ تخلص، شیخ خدا بخش خیمہ دوز کہ بیٹے تھے اور بعض اشخاص کہتے ہیں کہ اس نے متبنیٰ کیا تھا، بچپن فیض آباد میں بسر کیا، اس زمانہ کہ رواج کہ مطابق ورزش پر طبیعت مائل ہوئی، ہزاروں ڈنڈ کرتے اور سیکڑوں ہاتھ جوڑیوں کے ہلاتے، ورزش سے بدن کشرتی اور پھرتیلا ہوگیا تھا۔''(۵)

گلِ رعنا ایک ایسی کتاب ہے جس میں مصنف نے شعراء کے کلام پر رائے کے ساتھ ساتھ شعراء کے حالاتِ زندگی اور زوق وشوق کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کہ مطالعے کہ بغیر تاریخِ شعر سے کامل آگاہی نہیں ہوسکتی۔

۲۔ تاریخِ نظم ونثرِ اُردو (آغا محمد باقر ایم۔اے)

آغا محمد باقر ایم۔اے۔ایم۔او۔ایل۔بی۔ٹی کی کتاب ''تاریخِ نظم ونثرِ اُردو'' نظم ونثر کی تاریخ ہے تاہم اس میں اصناف کے حوالے سے بھی بات کی گئی ہے۔یہی بات اس کتاب کو تاریخ کی دوسری کتابوں سے جدا اور منفرد کرتی ہے۔ اس کتاب کے پندرہ ابواب نظم کے لئے وقف ہیں جبکہ پانچ ابواب نثر کے لئے ہیں۔

ابواب کے عنوان مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اُردو اور اس کی اصل

۲۔ ادب اُردو کی ترقی کے ابتدائی دور

۳۔ اُردو شاعری کی عام خصوصیات

۴۔ قدیم شعراءدکن

۵۔ اساتذہ دہلی۔ طبقہ متقدمین۔ حاکم وآبرہ کا زمانہ

۶۔ اساتذہ دہلی۔ طبقہ متوسطین

۷۔ اساتذہ دہلی۔ طبقہ متاخرین۔ انشاء اور مصحفی کا زمانہ

۸۔ اساتذہ لکھنؤ۔ ناسخ و آتش کا زمانہ

۹۔ دربارِ لکھنؤ کے شعراء۔ واجد علی شاہ اختر کا زمانہ

۱۰۔ اُردو مرثیہ اور مرثیہ گو (لکھنؤ)

۱۱۔ نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی

۱۲۔ طبقہ متوسّطین شعرائے دہلی۔ ذوق و غالب کا زمانہ

۱۳۔ امیر و داغ کا زمانہ

۱۴۔ جدید اُردو شاعری آزاد اور حالی کا زمانہ

۱۵۔ آخری دور، نظر لکھنوی، چکبست لکھنوی، ڈاکٹر اقبال

۱۶۔ نثرِ اُردو کی ابتدا اور ترقی

۱۷۔ نثرِ اُردو کا دورِ متوسط اور جدید

۱۸۔ اُردو ناول کی ابتداء۔ شرر اور سرشار کا زمانہ

۱۹۔ اُردو ڈرامہ

۲۰۔ زبانِ اُردو کی خاص خوبیاں اور اس کے متعلق آراء

کتاب کا پہلا باب بہت اہم ہے جس میں اُردو ہندی کا تعلق زبان اور ادبِ اُردو پر فارسی کا احسان، اُردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی کثرت کے اسباب، یورپین زبانوں کا اُردو پر اثر، نثر اور نظم کی زبان۔ ادبی اُردو زبان اُردو کے قدیم نام، اُردو کا رسم الخط اور نظمِ اُردو پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ''اُردو کو فارسی کی شاخ اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد فارسی دان حملہ آوروں کے لشکروں اور دارالخلافوں میں پڑی ہے۔ نیز اس میں فارسی الفاظ بکثرت ہیں اور اس کی شاعری کی بحریں اور رسم الخط فارسی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زبانِ اُردو اس بھاشا کی شاخ ہے جو اطرافِ دہلی میں بولی جاتی تھیں اور اس کا تعلق براہِ راست شور سینی پراکرت سے تھا۔ زبانِ اُردو کی صرف ونحو۔ محاورات اور بکثرت ہندی الفاظ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ یہ زبان ہندی سے بنی ہے۔ میر امن اور قدیم اُردو شاروں کی طرح یہ سمجھنا کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے دارالسلطنت اور اُردو یا لشکر سے زبان اُردو کی نشو نماء کو اسی قدر تعلق تھا کہ اس کا نام اُردو ہو گیا۔ چونکہ

اُردو میں ہنوز پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔اس لئے نئی زبانوں کی طرح اس میں اجنبی الفاظ ومحاورات کو قبول کر لینے کا مادّہ بدرجہ اتم موجود تھا چنانچہ فارسی کے نرم و ملائم الفاظ کو اس نے باآسانی جذب کر لیا۔'' (۶)

دوسرے باب میں ادبِ اُردو کی ترقی کے ابتدائی دور کو بیان کیا گیا ہے اور اس باب میں نظمِ اُردو کی صنف وار ترقی کو بیان کیا گیا ہے مثلاً ریختی، مراثی جبکہ نثر میں نثرِ مقفیٰ، ناول نویسی اور اُردو ڈراما کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مثلاً ریختی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''معاملہ بندی نے بعد میں ریختی کی صورت اختیار کر لی۔ ریختی عورتوں کی زبان کو کہتے ہیں اس قسم کے اشعار جذباتِ نفسانی ابھارنے کے لئے کہے جاتے تھے۔اسی لئے وہ زیادہ فحش ہوتے تھے۔ ریختی کی مثالیں ولی کے ہم عصروں کے کلام میں بھی ملتی ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے بعد میں یہ رنگ بالکل متروک ہو گیا اس کو دوبارہ انشاء اور ان کے دوست سعادت یار خان رنگین نے زندہ کیا۔سب سے بڑے ریختی گو میر یار علی خان متخلّص جان صاحب سمجھے جاتے تھے۔انہوں نے اس کو ایک الگ فن قرار دیا اور اسی رنگ میں عمر بھر شاعری کی یہ صنف شاعری اب بالکل متروک ہو چکی ہے۔'' (۷)

اسی طرح اُردو ڈرامہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''اُردو ادب میں یہ بالکل نئی صنف ہے۔ فارسی میں اس کا وجود نہ تھا۔ اس صنف کو ابھی کمال حاصل نہیں ہوا۔ یورپ کے مشہور ڈرامے ہماری زبان میں ترجمہ ہو رہے ہیں گویا اُردو ڈرامہ نویسی کے سامنے ایک درخشاں مستقبل موجود ہے۔'' (۸)

اُردو ڈرامہ اُردو اصنافِ ادب میں جو اہمیت رکھتا ہے مصنف نے اس اقتباس میں بیان کر دیا ہے۔اُردو ڈرامہ ایک روشن مستقبل رکھتا ہے۔حصّہ نظم کے باب چودہ میں جدید اُردو شاعری پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''قدیم زمانہ کے مرثیہ نویسوں نے موجودہ طرزِ جدید کے لئے ایک شارع عام تیار کر دیا تھا۔لیکن نیچر کی شاعری ان کے ہاں بطورِ فروغ کے تھی۔اس لئے وہ اپنی طرف لوگوں کو متوجہ نہیں کر سکی۔ دوسرے ایک نئی چیز کچھ آسانی سے مقبول نہیں ہوتی۔تیسرے بڑے بڑے وضعدار اور قدامت پرست بزرگوں کے سامنے ایک بدعت کا پھولنا پھلنا کچھ آسان نہ تھا۔نظیر اکبرآبادی سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مناظرِ قدرت، واقعات اور جذبات کے سچے فوٹو کھینچے۔ایک مضمون کو اصلی رنگ میں ادا کرنے کے لئے انہوں نے کسی قدیم بندش اور قواعد کی پرواہ نہ کی۔لیکن قدامت پرستوں نے ایک جدید رنگ کو قدر کی نگاہوں سے نہ دیکھا۔حقیقتاً اس پرانے رنگ کو بدلنے کے لئے کسی زبردست قوت کی ضرورت تھی جو خداوندِ تعالیٰ نے آزاد اور حالی کی زبردست شخصیتوں کے لئے

امانت رکھ چھوڑی تھی۔'' (۹)

مصنف نے جدید اُردو شاعری کے حوالے سے نظیر اکبر آبادی، آزاد اور حالی کو اہم شخصیتیں قرار دیا ہے۔ حصہّ نثر کا سولھواں باب نثر اُردو کی ابتدا اور ترقی سے متعلق ہے۔ اس باب میں مصنف نے خالصتاً تحقیقی انداز اختیار کیا ہے۔ اس حوالہ سے اُردو کی ترقی میں پادریوں کے کردار پر لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے بائیبل کے ترجمے بنجمن شلر اور کالنبرگ نے ۱۷۴۸ء میں کئے۔ مرزا محمد فطرت اور کالج کے دیگر منشیوں نے عہدِ جدید کا ترجمہ اُردو میں کیا جو ڈاکٹر ہٹلر کی نظر ثانی کے بعد ۱۸۰۵ء میں شائع ہوا اسی طرح سیرام پور کے پادریوں نے بائیبل کے اُردو اور ہندی میں ترجمہ کئے۔ پادری مارٹن نے عہدِ جدید کا ترجمہ ۱۸۱۶ء میں یونانی سے اُردو میں کیا۔ جو مرزا محمد فطرت کی نظر ثانی کے بعد طبع ہوا۔ پوری بائیبل کا ترجمہ سیرام پور کے پادریوں نے ۱۸۱۹ء میں شائع کیا۔ پادری لوگ اپنے دین کی اشاعت کے لئے ہندوستانی زبان میں تحریر و تقریر کیا کرتے تھے اس لئے ان کی تبلیغ سے بھی اُردو زبان کو بہت وسعت اور ترقی ہوئی۔'' (۱۰)

مختلف زبانوں سے مختلف فاضلین نے اُردو زبان میں ترجمے کئے جو اس باب میں بیان کر دئے گئے ہیں۔ نثرِ اُردو کے حوالے سے مصنف کا باب اٹھارواں، انیسواں بہت اہم ہے جس میں انہوں نے ناول اور ڈراما پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''افسانے اور قصّے سننے کا شوق انسان کے دل میں فطری طور پر موجود ہے جب اُردو زبان نے مستقل حیثیت اختیار کی تو اس میں بھی افسانوں اور قصوّں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بہت سے قصّے فارسی سے اُردو میں ترجمہ ہوئے۔ بعض عربی اور سنسکرت سے براہِ راست آئے یا دونوں زبانوں کے قصّوں کو گھٹا بڑھا کر اخذ کئے گئے۔'' (۱۱)

اُردو زبان میں قصّے، کہانیاں اور داستان دوسری زبانوں سے ترجمے ہوئے ہیں تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ مترجمین نے ترجمہ نگاری میں تخلیقت پیدا کر دی ہے۔ مصنف موصوف نے اس طرف اشارہ کیا ہے جبکہ ڈرامہ کے متعلق مصنف لکھتے ہیں:

''ڈرامہ غیر ملکی صنف ہے یہ انیسویں صدی میں اُردو میں داخل ہوا۔ ہماری زبان میں ڈرامہ نگاری کافی ترقی کر چکی ہے لیکن پھر بھی ترقی کی بہت کچھ گنجائش باقی ہے۔'' (۱۲)

ان تمام مندرجات کو مدِّ نظر رکھا جائے تو آغا محمد باقر کی یہ کتاب بہت اہم ہے کیونکہ مصنف نے نہ صرف تاریخ نظم و نثر بیان کر دی ہے بلکہ اصناف کے ارتقاء کو بھی احسن طریق پر بیان کر دیا ہے۔ ڈرامہ نگاری غیر ملکی صنفِ نثر ہونے کہ باوجود برصغیر پاک و ہند میں جس طرح عروج حاصل کیا وہ سب مصنف موصوف نے اس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

۳۔ اُردو میں ڈراما نگاری (سیّد بادشاہ حسین از حیدرآبادی)

سیّد بادشاہ حسین حیدرآبادی کی کتاب ''اُردو میں ڈراما نگاری'' فنِ ڈراما نگاری پر پہلی اور مستند کتاب ہے جو سب سے پہلے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی (۱۳) اور اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں تاج بکڈ پو لاہور نے شائع کیا۔ کتاب میں ڈرامہ نگاری پر جتنا مفصل اور وقیع مواد موجود ہے شاید ہی کسی اور کتاب میں موجود ہو۔ کیونکہ مصنف خود فنِ ڈراما نگاری سے وابستہ رہنے والے تھے اور ڈرامے سے ذاتی دلچسپی رکھتے تھے۔ ویسے سیّد بادشاہ حسین حیدرآبادی ایک پڑھے لکھے محقق تھے۔ ملاحظہ ہو کہ کس طرح مصنف نے تحقیق کے بعد کتاب کو مرتب کیا:

> ''۳۴ء کے آخر میں حیدرآباد واپس ہوا اور کتاب مرتب کرنی شروع کی متقاضی احباب کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے یہ فرمائش بھی کی کہ کتاب کا ایک خرچہ ڈرامہ کی تکنیک کے بارے میں شامل رکھو۔ چونکہ مجھے نہ صرف ڈرامے لکھنے کا شوق رہا تھا بلکہ ان کو اسٹیج پر پیش کرنے کا بھی کافی تجربہ ہوا تھا اس لئے میں نے یہ حصّہ بھی مرتب کرنا شروع کیا۔ اس کے سوا فن اور اصول کے اعتبار سے ڈرامہ ترقی نہ کر سکا تھا۔ اور ڈرامہ اور اسٹیج سے دلچسپی رکھنے والوں نے اس طرف توجہ نہ کی تھی اس لئے میں نے اس طبقہ کے استفادہ کے لئے مبادیات پیش کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔
>
> ۳۵ء کے شروع میں کتاب شائع ہوئی اور مجھے خوشی ہوئی کہ صاحبان ذوق ونظر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اکثر یونیورسٹیوں نے اُردو ایم۔ اے کے نصاب میں شامل کیا۔ تھیٹر اور فلم سے دلچسپی رکھنے والوں نے بھی جس طرح چاہئے تھا پڑھا۔ اخبارات اور رسائل نے بہت اچھے تبصرے کئے ان سب کے لئے میں ممنون ہوں۔'' (۱۴)

جب لکھنے والے کو فن سے ذاتی دلچسپی ہو اور اگر جنوں کی حد تک ہو تو پھر ایسی کتاب ہی تحریر ہوگی۔ سیّد بادشاہ حسین حیدرآبادی نہ صرف ڈرامے کی تحقیق میں دلچسپی رکھتے تھے بلکہ ڈرامے کی پیش کش میں وہ شامل رہے۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب جلد ہے فروخت ہوگئی۔ یونیورسٹیوں اور دیگر اداروں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا چنانچہ دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں معمولی سی ترمیم کے بعد شائع ہوا۔ اس سلسلے میں سیّد بادشاہ حسین حیدرآبادی کہتے ہیں:

> ''چند سال بعد اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوا، پبلیشروں اور یونیورسٹیوں نے فرمائش کی کہ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جائے کیونکہ کتاب بازار میں کامیاب ہو رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء کی ابتداء میں، میں نے نظرثانی شروع کی۔ مواد میں اضافہ کیا نئے ڈراموں پر تبصرہ کیا اور کچھ تصاویر بھی قدیم تھیٹریکل کمپنیوں کی جمع کیں تا کہ ناظرین کی ضیافت قطر کا بھی سامان ہو جائے۔ لیکن چونکہ حیدرآباد میں اسی زمانہ سے حالات خراب ہو رہے تھے۔ اس لئے اس کی اشاعت کا موقع نہ مل سکا۔ ۴۸ء کے اوائل

میں حیدر آباد کا زوال ہوا اور ۴۹ء کے اوائل میں حقیقتاً ''بیک بنی و دو گوش'' کراچی چلا گیا۔ کتابوں کا ذخیرہ وہیں چھوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی نظرِ ثانی کیا ہوا مسودہ بھی جوں کا توں وہیں رہ گیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے پبلشرز صاحبان کے تقاضوں میں شدت ہوگی۔ مجھے تامل صرف اس لئے تھا کہ نظر ثانی کے لئے نہ کتابیں پاس ہیں اور نہ اکٹھا کیا ہوا مواد ساتھ ہے۔ لیکن بعض احباب نے یہ کہ کر ہمت بڑھائی کہ اُردو ڈرامہ کے رجحانات میں پچھلے چند سالوں میں کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوئی در کتاب میں اضافہ اور ترمیمات کی فی الوقت کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے یہ اسی طرح شائع کی جاسکتی ہے پبلشرز صاحبان نے بھی اس سے اتفاق فرمایا اور تقاضوں کو جاری رکھا۔ ان حالات میں میرے لئے مزید انکار یا تامل ممکن نہ ہوسکا۔ اس لئے دوسرا ایڈیشن معمولی سی نظر ثانی کے بعد پیش کرر ہا ہوں۔'' (۱۵)

کتاب کا تیسرا ایڈیشن تاج بک ڈپو لاہور نے شائع کیا۔ (۱۶) اس ایڈیشن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بادشاہ حسین حیدر آبادی نے اس ایڈیشن کے لئے جو دیباچہ تحریر کیا ہے وہ ڈراما نگاری کے فن کے لئے نقاد ہیں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ بیان کردی ہیں۔ اس دیباچے سے بادشاہ حسین کی تنقید پر گرفت کا بھی علم ہوتا ہے۔ بادشاہ حسین نے اگرچہ ڈرامے کے حوالے سے نقاد کی خوبیاں بیان کی ہیں تاہم نقاد کی عمومی خوبیاں بھی واضح ہوجاتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ڈراما کے نقاد کا ایک مقصد ہونا چاہئے اور صرف ایک۔ اس کو چاہئے کہ '' اپنی'' بے لاگ اور بے لوث رائے کا کھلے بندوں اظہار کرے کسی ڈرامہ کو دیکھ کر اس کے دل پر جو استقامت پیدا ہوں ان کی جھلک دوسروں کو دکھا دیں۔۔۔۔۔۔۔ اپنے غیر جانبدارانہ تاثرات سے لوگوں کو متاثر کرے اور بس ڈراما کے نقاد کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ آپ کو یہ بتائے کہ فلاں ڈرامہ دیکھنے کے قابل ہے یا نہیں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص خواہ وہ کتنی ہی وسیع نظر اور کتنی ہی عمیق اور تنقیدی نگاہ کیوں نہ رکھتا ہو ڈراما جیسی مختلف المذاق ادب کی صنف کے متعلق خود اعتمادی سے کام لے رجحان ذہنیت اور خیال کے اختلافات کی وجہ سے ہر شخص کی پسند علیحدہ علیحدہ ہے جو چیز ایک کو بہترین معلوم ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی معیاری اور فنی خوبیوں سے مالا مال کیوں نہ ہو ضروری نہیں کہ دوسرے کو بھی بہترین معلوم ہو۔۔۔۔۔۔۔ مختصر یہ کہ ڈرامہ کے نقاد کا یہ کام نہیں کے دوستوں کے لئے ڈراما پسند کرے بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی پسند کا اعلان کردے۔'' (۱۷)

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ حسین تنقیدی شعور رکھتے تھے بلکہ ان کی ڈراما نگاری پر گہری نظر کا ادراک بھی ہے اور ان کی علمی بصیرت کی وسعت کا بھی علم ہے۔ کتاب کے چودہ ابواب مقرر کئے گئے ہیں تاہم صرف عنوان درج کردئے گئے ہیں بابِ اول، دوم اور سوم جیسے الفاظ سے ابواب کا اندراج نہیں ہوا ابواب کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ ڈرامہ کی ابتداء

۲۔ ڈرامہ کی قسمیں

۳۔ ڈرامہ اور تھیٹر

۴۔ اُردو ڈرامہ کی پیدائش

۵۔ اندرسبھا

۶۔ قدیم اُردو ڈراموں کی بعض اہم خصوصیات

۷۔ طرزِ قدیم کی علمبردار

۸۔ شیکسپیئر کے ترجمے

۹۔ دوسرے قدیم ترجمے

۱۰۔ قدیم ناٹک کمپنیاں

۱۱۔ طرزِ جدید کے پیشرو

۱۲۔ طرزِ جدید کے پیرڈ

۱۳۔ فلم اور اُردو ڈراما

۱۴۔ اُردو ڈراما کا مستقبل

اور آخر میں سب مآخذ بھی دے دئے ہیں۔ ڈرامے کی ابتداء کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انسانی زندگی کی ابتداء نقالی سے ہوئی ہے اور نقالی ڈراما کی پیش مشق ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادبیات کی اوّلین صف ڈرامہ ہے۔'' (۱۸)

کتنے خوبصورت انداز میں ڈراما کی ابتداء اور اوّلیت کو بیان کر دیا گیا ہے۔ ڈرامہ کے مستقبل کے بارے میں مصنف نے لکھا تھا:

''بلاشبہ اُردو ڈرامہ کی ترقی کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں لیکن ہماری کوششوں میں اتحاد اور یک جہتی نہیں ہے اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہماری اصلاحی انجمنِ، علمی ادارے، شوقیہ ڈرامیٹک کلب، رسائل وغیرہ متفقہ طور پر لائحہ عمل تجویز کریں۔ اور اس پر سختی کے ساتھ پابند رہیں ایک مرکزی ہو اور مقامی انجمنِ ادارے اور طلب سب کے سب مرکزی ایسوسی ایشن سے ملحق کر دئے جائیں اسی طرح ایک مقررہ نظام العمل مرتب ہو سکتا ہے۔ اور اتحاد وعمل کے ذریعہ کل کی کامیابی آج ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔'' (۱۹)

ڈرامے کے مستقبل کہ حوالہ سے وہ کوششوں کو ضروری قرار دے رہے ہیں تاہم ڈرامے کا مستقبل جو بھی ہوا وہ اہلِ علم جانتے ہیں۔تاہم بادشاہ حسین کی کتاب فن ڈرامہ نگاری میں ایک بہت اہم اور جامع کتاب ہے اپنے مواد اور اسلوب کے حوالے سے بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔اس کتاب کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ فن ڈراما نگاری پر ابتدائی کتاب ہونے کے باوجود جامع اور مستند کتاب ہے۔

۴۔ جدید اُردو شاعری (عبدالقادر سروری)

''جدید اُردو شاعری'' کے مصنف عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب کے تین حصّے مقرر کئے ہیں۔ پہلے حصّہ میں شعر کی ماہیت، شعر کی تعریف، شعر کی تقسیم، اور اُردو شاعری کی اصناف کے عنوان سے جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے جب کہ دوسرے حصّہ میں انقلابات سے پہلے کی شاعری، تنزل کے اسباب، انقلابات کے اثرات، جدید شاعری کہ معمار، جدید شاعری کی پیدائش کا زمانہ پر روشنی ڈالی ہے اسی طرح تیسرے حصّے میں عصر اصلاح، درمیانی زمانہ، عصر حاضر، شعراء کہ مستقبل اور چند دقتیں کے عنوان قائم کئے گئے ہیں، مولوی عبدالحق نے اس کتاب کے متعلق یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''مولوی عبدالقادر صاحب سروری تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد برابر اُردو کی خدمت کر رہے ہیں اس سے قبل افسانوں سے متعلق ان کے ترجمے اور تالیفات شائع اور مقبول ہو چکی ہیں۔ ''جدید اُردو شاعری'' اس وقت ان کی آخری تالیف ہے اس کتاب کی ابتداء میں انہوں نے جدید شاعری کے اسباب و محرکات اور اس کے بانیوں اور حامیوں کے کلام پر بہت خوبی اور جامعیت کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ اور اس کے بعد شعرائے حال کا تذکرہ اور ان کے کلام کی تنقید ہر ایک کے درجہ اور حیثیت کے مطابق بہت سلیقے سے کی ہے۔ وہ کہیں اپنے موضوع سے نہیں ہٹتے اور اپنی حدود سے کہیں تجاوز نہیں کرتے۔ ممکن ہے کہ کسی کی تعریف انہوں نے استحقاق سے زیادہ کی ہو۔لیکن کسی کے حق میں ناانصافی نہیں کی۔ آخر میں انہوں نے شعرائے مستقبل پر ایک نظر ڈالی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مدت سے اس کے لئے مسالا اکٹھا کر رہے تھے۔کوئی کتاب یا رسالہ یا اخبار ان کی نظر سے نہیں بچا اور جو بات کام کی جہاں سے ملی اپنی کتاب کے لئے سینت کے رکھ لی۔ گویا انہوں نے اپنا مسالا ایک چوٹی کی طرح ریزہ ریزہ جمع کیا اور ایک ہوشیار معمار کی طرح اس مال مسالے سے خوش نما عمارت بنالی۔'' (۲۰)

مولوی عبدالحق کہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے کتاب کی تیاری میں تحقیق و تنقید سے کام لیا ہے۔ اور بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کی ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی جس سے تشنگی کا احساس ہو۔ عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب

کی تیاری کے متعلق لکھتے ہیں:

''کتاب کہ ماخذِ استفادہ بہت ہیں جن میں اکثر کا حوالہ اپنے اپنے موقع پر دیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی کتاب ''دی انفلوئس آف انگلش لٹریچر آپ ان اُردو لٹریچر'' سے جو مجھے مدد ملی، اس کا ذکر کسی ضمن میں نہ آ سکا اس لئے میں اس مقام پر اس کا اعتراف کرتا ہوں اور مسٹر رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اُردو'' سے استفادہ کہ اعتراف کا اعادہ بھی ضروری سمجھتا ہوں۔'' (۲۱)

عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب کی تیاری میں بہت سی کتب سے اسفادہ کیا ہے اور ان کا حوالہ بھی دے دیا ہے کچھ کتب کا حوالہ دینا بھول گئے ہیں تو آخر میں اعتراف بھی کیا ہے۔ پہلے حصے میں شعر کی تعریف مفکرین کے اقوال سے اس طرح کرتے ہیں:

''شعر مقفیٰ انشاء ہے۔ یہ ایسا فن ہے جو تعقل اور تخیل کی مدد سے انبساط کا پیوند صداقت کہ ساتھ لگاتا ہے۔'' (ڈاکٹر جانسن)

''شعر انشاء کی وہ نوع ہے جو سائنس کی مدِ مقابل ہے اسکا راستِ مقصد انبساط ہے نہ کہ صداقت۔'' (کالرج، بیوگریفیا لٹریریا باب)

''شعر، صداقت، حسن اور قدرت کے ساتھ عشق کا اظہار ہے اس کے اوراکات کی توضیح تخیل اور تصور کے ذریعے کی جاتی ہے اور کس کی زبان کا توازن یکسانیت میں اختلاف کے اصول کا تابع ہے۔'' (لے ہنٹ)

''شعر الفاظ کا ایسا استعمال ہے کہ اس سے تخیل دھوکا کھا جائے۔ مصور رنگ کی مدد سے جو کام کرتا ہے اس کو الفاظ کے ذریعے سرانجام کرنے کی صفت کا نام شاعری ہے۔'' (مکالمے، اے سے آن ملٹن)

''شعر کسی چیز یا کسی واقع کا فطری تاثر ہے، جو اپنی صفائی کی بدولت جذبات اور تخیل میں ایک غیر ارادی تحریک برپا کر دیتا ہے اور اسی تحریک کی مطابقت سے اس کے اظہار کی آواز اور طرز میں اتار چڑھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔'' ''(ہزلٹ، مضمون ''پوئٹری ان جنزل'') (۲۲)

فنِ شاعری میں کتاب تصنیف کرتے ہوئے شعر کی تعریف کرنا ضروری سمجھا گیا تو حوالوں اور مستند مآخذ کی مدد سے شعر کی تعریف کر دی گئی۔ جدید اُردو شاعری پر انگریزی کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جدید شاعری کی ابتداء اُردو میں انگریزی نظموں کہ ترجموں سے ہوئی، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے ترجمے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جنہیں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ بعد میں جب انگریزی زبان کی تعلیم ملک کہ طول وعرض میں پھیل گئی تو ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ مروجہ شاعری کہ انداز سے بے

حد متاثر ہوا۔ تر جموں کے ساتھ ساتھ نئی طرز کی نظمیں اُردو میں بھی لکھی جانی شروع ہوئیں اس وقت
اُردو شاعری درحقیقت تین اخلاط کا مجموعہ تھی۔ ذہنیت اور اسلوب ہندی تھا سانچے فارسی شاعری کہ
تھے اور خیالات انگریزی شاعری سے ماخوز۔ رفتہ رفتہ اجزاء ایک دوسرے کے اس قدر جزو بدن
ہوئے کہ ایک مرکب تیار ہو گیا اور ایک مستقل صورت شاعری نے اختیار کر لی۔'' (۲۳)

متذکرہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شاعری کن کن مشکلات اور مراحل سے گزری اور انگریزی شاعری کے اُردو شاعری پر کیا کیا اثرات مرتب ہوئے جب کہ کتاب کہ تیسرے حصے میں شعراء مستقبل کے حوالہ سے اختر شیرانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اختر ایک نفیس مذاق اور حسن پسند نظر رکھتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلی چیز جو ان کے کلام میں
جاذبِ توجہ ہے وہ ان کے حسین موضوع ہیں۔ ''خدائے رقص''، ''اعتراف''، ''ترانہ'' وغیرہ موضوع
کے انتخاب کہ لحاظ سے اچھی نظمیں کہلانے کی مستحق ہیں۔ تاریخ کے خشک واقعات سے بھی ان کی نظر
بعض ایسے حسین گوشوں کا انتخاب کر لیتی ہے کہ نظم میں بیان ہونے کہ بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری
کا موضوع بننے ہی کہ لئے معرضِ وجود میں آئے تھے۔'' (۲۴)

اختر شیرانی کہ بارے میں جس اسلوبِ بیان سے کام لیا ہے وہ ساری کتاب میں نظر آتا ہے اور جس عمدگی اور خوبی سے اختر شیرانی کہ موضوعات کے انتخاب کی انفرادیت کو نمایاں کیا ہے وہ اس کتاب کو ہی اہم بنانے کے لئے کافی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جدید اُردو شاعری کی تفہیم کے لئے عبدالقادر سروری کی یہ کتاب تاریخِ شعر میں اہم مقام رکھتی ہے۔ اصناف کی تاریخ میں یہ کتاب شاعری کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے اس کتاب میں شاعری کی تاریخ کے حوالہ سے بہت کم تشنگی ہے۔ عبدالقادر سروری کا اسلوب بھی محققانہ اور تنقیدی ہے۔

۵۔ اُردو میں حج کے سفرنامے (ڈاکٹر محمد شہاب الدین)

ڈاکٹر محمد شہاب الدین کی کتاب ''اُردو میں حج کے سفرنامے'' نثری صنف میں سادہ نثر کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ یونیورسل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ سفرنامے کی تاریخ مرتب کرنے والوں میں سب سے اہم اور مقید نام ڈاکٹر انور کا ہے۔ جنہوں نے اُردو میں سفرنامہ نگاری کی روایت لکھ کر سفرنامے کی مکمل تاریخ مرتب کر دی ہے۔ ان کے اور سفرناموں پر جزوی نام کسی نہ کسی طرح جاری ہے۔

ڈاکٹر محمد شہاب الدین کی یہ کتاب حج کے سفرناموں کے حوالے سے ہے جو سفرِ مقدس کے ان تمام ممکنہ تاثرات کا احاطہ کرتی ہے جو صفحۂ قرطاس پر سامنے آ چکے ہیں۔ کتاب کے ابواب مندرجہ ذیل ہیں:

باب اول: سفرنامہ اور حج نامہ (صنف ادب کی حیثیت سے)

بابِ دوم: اُردو میں حج ناموں کا پسِ منظر اور ابتدائی دور

بابِ سوم: اُردو حج نامے ۱۹۰۱ء تا ۱۹۴۷ء

بابِ چہارم: اُردو حج نامے ۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۹ء

بابِ پنجم: حج ناموں کے اُردو تراجم

فاضل مصنف نے پہلے باب میں سفرنامے کو بطور صنف ادب خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے کہ حج کے حوالے سے ہزاروں کتب لکھی گئی ہیں لیکن وہ تاثرات جو الفاظ میں ڈھل کر سفرنامے کی صنف پر پورا اترتے ہیں دراصل وہی سفرنامہ ہے۔ جسے اُردو ادب میں باقاعدہ صنف کی حیثیت حاصل ہے۔ ویسے تو علماء وصوفیاء کی اکثریت حج مقدس کا فریضہ ادا کرتی ہے اور اسلامیات کی رو سے وہ سفر کی داستان کتابی صورت میں بھی لے آتے ہیں۔ لیکن ہم انہیں ادبی سفرنامے کی صف میں نہیں پرکھتے کیونکہ وہ سفرنامے کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ ایسی کتاب صرف اور صرف حج کی تاریخ مرتب کرتی ہیں جو مسلمانوں کے لئے مددگار ثابت ہوتی ہیں اور زائرین حج کے لئے رہنما کا درجہ بھی رکھتی ہیں۔ مصنف نے اس ساری بحث کو واضح کر دیا ہے کہ سفرنامہ کیا ہے؟ سفرنامے کے اصول وضوابط اور تقاضے کیا ہیں؟ سفرنامے کے ساتھ ساتھ حج کے سفرنامے کیا ہیں؟ اور ایک ادیب کے قلم سے تاثرات حج کیسے قلمبند ہوتے ہیں؟ یہ ساری تفصیل بابِ اول میں درج ہے جیسے مصنف نے بخوبی بیان کیا ہے۔ مصنف نے حج کے سفرناموں کو اپنی کتاب میں دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ۱۹۰۰ء سے تقسیم ہند تک کا دور ہے جبکہ تقسیم ہند سے ۲۰۰۹ء تک کے عہد کو دوسرے دور کا نام دیا ہے۔ مصنف نے حج نامہ کے ذیل میں ایک باب کا اضافہ کیا ہے جو تراجم پر مشتمل ہے۔ مصنف نے ایسے حج ناموں کی تفصیل دی ہے جو عربی، فارسی یا دیگر زبانوں سے اُردو میں منتقل ہوتے ہیں اس میں اصل مصنف کی طرف توجہ زیادہ دی گئی ہے جبکہ مترجم پر مصنف سرسری گزر گئے لکھتے ہیں:

> ''اب تک حج کے جن سفرناموں کے تراجم تک راقم سطور کی رسائی ہو پائی ہے وہ درج ذیل ہیں اور آئندہ صفحات میں ان کا فنی اور ادبی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے سفرنامہ نگار یہ ہیں حکیم ناصر خسرو، محمد بن خبیر اندلسی، ابن بطوطہ، عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ، محدث دہلوی، رفیع الدین فاروقی، جان لوئس اور مصطفیٰ خان شیفتہ وغیرہ۔'' (۲۵)

ڈاکٹر محمد شہاب الدین نے حج کے سفرناموں کی تاریخ و تدوین پر مفصل کتاب تالیف کر کے اسلامی ادب کی پاسداری کا ثبوت دیا ہے جو ان کا خاصہ ہے۔ ان کی کاوش ادب اور مذہب دونوں زاویوں سے اہمیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے حج کے سفرناموں کی ارتقائی صورتحال کو بیان کیا ہے اور ۲۰۰۹ء تک سفرناموں کا جائزہ بیان کر دیا

ہے۔اگر چہ یہ سفر نامے حج سے ہی متعلق ہیں تاہم سفر ناموں کی اہمیت موضوعات اور فنی اصول اور قواعد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کا اسلوب سادہ اور مختصر اور تنقیدی ہے۔

۶۔ اُردو کی نثری داستانیں (ڈاکٹر گیان چند)

ڈاکٹر گیان نے جب اُردو کی نثری داستانیں لکھیں اور الٰہ آباد یونیورسٹی نے ۱۹۴۸ء نے انہیں ڈی فل کی ڈگری عطا کی تو اسے بہت پذیرائی ملی۔اس کتاب کا مارچ ۱۹۴۸ء میں پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔۱۹۴۰ء تک یہ ایڈیشن ختم ہوگیا بعد میں ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن انجمن ترقی اُردو پاکستان نے ۱۹۴۹ء میں شائع کیا۔(۲۶) کتاب کا موضوع اتنا دلکش ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اُردو کی منظوم داستانیں'' کے عنوان سے ۱۹۷۱ء میں شائع کروایا۔جمیل الدین عالی اس صورتحال کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اُردو کی منظوم داستانیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا وہ مقالہ ہے جس پر انہیں ۱۹۶۴ء میں جامع کراچی، پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔اس وقت تک اُردو کی چند منظوم داستانوں پر علیحدہ علیحدہ تو تبصروں اور مقالوں کی کمی نہیں رہی تھی لیکن نثری داستانوں پر ایک تفصیلی کام مکمل ہو کر انجمن ہی سے شائع ہو چکا تھا۔وہ ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ہے جو ایک طرح سے خود بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھوائی تھی۔'' (۲۷)

ڈاکٹر گیان چند اپنی کتاب کہ بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے ۱۹۴۵ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے اُردو کیا، ایم اے میں میرے ذہین ہم جماعت مجتبٰی حسین تھے جو اب بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ میں صدرِ شعبہء اُردو ہیں۔میں نے ذکر کیا تھا کہ ایم اے کرنے کہ بعد میں ریسرچ میں داخلہ لونگا انہوں نے مجھے اُردو داستانوں کے موضوع پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔اپنے ہم جماعتوں میں سے صرف میں نے ڈی فل (الٰہ آباد یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی بجائے ڈی فل کہتے ہیں) میں داخلے کی درخواست دی اور نثری داستانوں کا موضوع لیا۔نگراں مقرر ہوئے پروفیسر سید ضامن علی، صدر شعبہء اُردو۔اس وقت تک شعبے میں تمام ریسرچ اسکالروں کے وہی نگراں ہوتے۔ میرے دو بیرونی ممتحن جعفر علی خان اور ڈھاکہ کے ڈاکٹر عندلیب شادانی تھے۔اگست میں ملک کی تقسیم ہوگئی اس لئے شادانی مرحوم سے رابطہ قائم کرنا دشوار ہوگیا۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں مجھے ڈگری ملی۔'' (۲۸)

ڈاکٹر گیان چند کی ادبی خدمات سے کسی کو انکار نہیں انہوں نے کئی اہم ادبی فن پارے متعارف کروائے لیکن ''اُردو

کی نثری داستانیں'' کانعم البدل شاید کوئی اور کتاب نہ مل سکے۔اس کتاب نے گیارہ مخیم ابواب میں جو اپنی اپنی نوعیت اور انفرادیت کے اعتبار سے اہم ہیں۔ابواب کی فہرست یوں ہے:

پہلا باب	عہد قدیم میں قصہ گوئی
دوسرا باب	اُردو کا قدیم افسانوی ادب
تیسرا باب	داستانوں کے فروغ وزوال کے اسباب
چوتھا باب	دکنی قصے
پانچواں باب	شمالی ہند میں داستان نویسی فورٹ ولیم کالج تک
چھٹا باب	اُردو کی سنکرت الاصل کہانیاں
ساتواں باب	سرور کا عہد
آٹھواں باب	اُردو میں الف لیلیٰ
نواں باب	داستانِ امیر حمزہ (۱)
دسواں باب	داستانِ امیر حمزہ (۲)
گیارہواں باب	بوستانِ خیال

ڈاکٹر گیان چند کی پیش کردہ نثری داستانیں اُردو ادب کے افسانوی ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔کتاب ہٰذا کے پہلے تین ابواب مختلف نثری قصوں کی تاریخ اور ابتدائی معلومات کو پیش کرتے ہیں۔مصنف موصوف نے افسانوی ادب کی ابتدائی عام معلومات پیش کی ہیں۔مصنف لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں بھی افسانوی ادب کی جڑیں بہت گہری ہیں۔وید، برہمن، اپنشد، پران، مہابھارت وغیرہ میں متعدد ضمنی کہانیاں شامل ہیں۔ان مقدس کتابوں کی تاریخ بہت مشتبہ ہے'' (۲۹)

اُردو کے قدیم نثری ادب کو وجہی کی سب اس کے تناظر میں بیان کرتے ہوئے فرید لکھتے ہیں:

> ''یہ نثری کیا کم باغ و بہار ہے کہ اس پر جا بجا وجہی نے اُردو اور فارسی شعر اور بعض جگہ برج بھاشا کے دوہے بھی مستزاد کیے ہیں۔نثر میں بھی جا بجا عربی، فارسی اور اقوال اور ضرب الامثال سے کام لیا ہے۔غرض یہ کہ اسلوب ہو یا موضوع وجہی کسی مقام پر بند نہیں ہیں۔وہ اُردو کے کسی انشاء پرداز سے نیچے نہیں رہتے اُردو نثر کی ابتدائی صدیوں کی تاریکی میں سب رس روشنی کے مینار کی طرح دور تک ضوپاش اور جلوہ بار ہے۔'' (۳۰)

مصنف نے الف لیلیٰ کی داستان، داستان امیر حمزہ، توتا کہانی، سنگھاسن بتی، کلیلہ و دمنہ، قصہ مادھونل و کام

کندلا اور داستانوں کے دیگر مستقبل اور قدیم سلسلوں کے بارے میں تفصیلاً بحث کی ہے یعنی داستانوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ مصنف نے داستانوں کے مختلف سلسلوں پر بھی روشنی ڈالی ہے مثلاً الف لیلیٰ کہ حوالے سے لکھتے ہیں:

''یورپی زبانوں میں الف لیلیٰ کی تحقیق آسمان کے تارے توڑتی ہے۔ جرمن، فرانسیسی، انگریزی، ڈینش اور روسی زبانوں میں الف لیلیٰ کے بارے میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ فرنچ میں محض الہٰ دین و چراغ کی تحقیق میں ایک کتاب مکمل لکھی گئی لیکن اُردو میں محققوں نے ابھی تک اس داستانِ عظیم کو درخوداعتنا نہیں جانا۔'' (۳۱)

یورپی اور دیگر زبانوں میں الف لیلہ پر جتنا کام ہوا اس کی وضاحت کرنے کا مقصد مصنف کا یہ ہے کہ ہمارے محققین بھی اس طرف توجہ دیں۔ ہمارے ہاں تحقیق کا رجحان نہیں ہے۔ یورپی محقق ایک لفظ پر کتابیں لکھ ڈالتے ہیں جیسا کہ جرمن، فرانسیسی اور انگریزی میں الف لیلہ پر کئی کتب تحریر کردی ہیں۔ اسی طرح داستانِ امیر حمزہ کہ بارے میں لکھتے ہیں:

''داستان امیر حمزہ کی کتاب کا نام نہیں اس کا کوئی ایک مصنف نہیں۔ یہ کسی ایک زمانے سے منسوب نہیں کی جاسکتی۔ یہ تو الف لیلہ کی طرح قصہ خوانی کی ایک شاخ ایک روایت، ایک موضوع ہے جس کے ہزار پہلو ہیں جو صدیوں تک ارتقاء پائی رہتی ہیں۔ جو خاک ایران سے اٹھتی ہے اور ہندوستان کی ہواؤں میں بالیدہ ہوتی ہے۔ اس کی تین منازل ارتقاء میں سے دو فارسی قبا میں ظاہر ہوتی ہیں اور نثری یعنی آخری اُردو کے ملبوس خوش رنگ میں ہے۔'' (۳۲)

امیر حمزہ ایک داستانی سلسلہ تھا جو قصہ خوانی کے خیال سے قائم ہو۔ اس میں پلیٹ، کردار اور دیگر لوازم فن محض خیالی تھے مگر اشاراتی معنویت بھی رکھتے تھے۔ اُردو داستانوں کی تاریخ جتنی قدیم اور تابناک ہے اسی طرح ڈاکٹر گیان چند موصوف یہ کتاب بھی اُردو ادب میں ایک روشن اور درخشندہ ستارہ ہے۔ اسی طرح ایک کتاب میں مصنف نے اُردو کی شہرہ آفاق داستانوں خصوصاً نوطرز مرصع۔ داستان امیر حمزہ سمیت سنسکرت اور فارسی کی اُردو آموز پیش داستانوں کے تفصیلی تجزیہ پیش کئے ہیں۔ تواریخ ادبیات ویسے تو بہت سی احاطہ تحریر میں لائی گئی ہیں لیکن ''اُردو کی نثری داستانیں'' کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اُردو میں نثری داستانوں کا باقاعدہ آغاز تو فورٹ ولیم کالج کے سنگ بنیاد سے ہوا لیکن اس سے پہلے جتنی بھی داستانیں رقم ہوئیں خواہ مذہبی رنگ میں تھیں یا عشق ومحبت کی بحر حال ڈاکٹر گیان چند نے تمام داستانوں کی تاریخ کا خوب صورت تحقیقی موقع پیش کر کے خود کو سرخرو کردیا ہے۔ جب تک اُردو زبان رہے گی داستانوں کے اس قیمتی نسخے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ڈاکٹر گیان چند کی یہ کتاب ان کی دوسری کتب کی طرح اہم ہے جس میں نثری داستانوں کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔

۷۔ اُردو کی دو قدیم مثنویاں (اسماعیل امروہوی مرتبہ نائب حسین نقوی)

ادبی مؤرخین کے تواریخ پر نظر پڑتی ہے تو سب سے زیادہ عمومی تاریخ نویسی کا ذخیرہ نظر آتا ہے۔ البتہ اگر صنف وار تاریخ نگاری کو دیکھا جائے تو اُردو کی منظوم اور نثری داستانیں مؤرخین کی توجہ کا مرکز بنی رہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ''اُردو کی دو قدیم مثنویاں'' ہیں۔ جسے اسماعیل امروہوی نے تالیف کیا۔ سید نائب حسین نقوی نے اس کے قلمی نسخے کا کھوج لگا کر ۱۹۷۰ء میں مجلسِ ترقی ادب لاہور کے اہتمام سے شائع کرا کے مثنوی تاریخ میں ایک اور شاہکار کا اضافہ کر دیا۔ جو ان کا خاصہ ہے ان سے ان کے نظریئے کو بہت تقویت ملتی ہے کہ ابتدائی دور میں شمالی ہند کے اُردو شاعر اور ادیب محض دکنی اُردو ادب سے متاثر ہو کر اُردو کی طرف مائل نہیں ہوئے بلکہ ان کی تخلیقی سرگرمیوں خود شمالی ہند کے حالات کی مرہونِ منت ہے۔ ان دو مثنویوں ''وفات نامہ بی بی فاطمہ'' اور ''معجزہ انار'' کے موضوعات کا تعلق چونکہ بنیادی طور پر مذہبی عقائد سے ہے اس لئے ان میں تغزل کی رنگا رنگی اور انجیل کی جولانی تو بے شک نہیں لیکن اسماعیل کے اندر بیان کی سلاست اور متانت قابل داد ہے۔

میر اسماعیل امروہوی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر ہمارے نقادوں کی نظر نہیں پڑتی جس کی وجہ سے وہ غیر معروف شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت سے لاعلمی ہماری بدقسمتی یا ذوق ادب کی کمی ہو سکتی ہے۔ ہمارے تذکرہ نگار اس موضوع پر خاموش تماشائی بنے نظر آتے ہیں۔ صرف مولوی عبدالحق نے اپنی تحریروں میں ان کا سرسری ذکر کیا ہے اس کتاب کو منظرِ عام پر لانے کا سہرا اس کے مرتب نائب حسین نقوی کے سر پر ہے جنہوں نے یہ کارنامہ سرانجام دیا کہتے ہیں:

> ''میر اسماعیل کی شخصیت، احوال اور عصر سے لاعلمی کو ہماری بدقسمتی یا ذوق ادب کی کمی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے تذکرہ نگاروں اور محققین کی نگاہیں بھی میر اسماعیل تک نہیں پہنچ سکیں۔ صرف مولوی عبدالحق اور بعض دوسرے محققین نے اسماعیل کا محض حوالہ دیا ہے جس کے سبب موصوف کا نام ادبی حلقوں میں روشناس ہو گیا تھا۔'' (۳۳)

کتاب مذکورہ جو دو مثنویاں پر بٹی ہیں۔ میر اسماعیل نے اپنے عہدِ عصر کے متعلق پیش نظر دونوں مثنویوں میں نظم کر دیا۔ پہلی تصنیف وفات نامۂ بی بی فاطمہ ۱۱۰۵ھ ہے دوسری معجزہ انار بادشاہ بلقیس ہے۔ (۳۴) پہلی مثنوی کے تین سو انیس اشعار ہیں دوسری مثنوی ''معجزہ انار'' ۱۴۸ اشعار پر مشتمل ہے۔

اس لئے مرتب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے تین سو سال پہلے کی اس کتاب کو ڈھونڈ نکالا۔ پہلی مثنوی کے چند اشعار دیکھیں:

الٰہی! تو صاحب ہے سنسار کا
ھمن کون ہے امید دیدار کا

تیرا نام ہر دم کوئی ہوتا

ٹھکانہ جنت بیچ اوس دیوتا

گناہاں میں بھریا ھوں میں بیشمار

طفیل محمد بخش کردگار

کیوں نعت اس میں محمد ﷺ رسول

دو عالم صدقِ دل میں کی جیو قبول ۔ (۳۵)

مرتب نے کتاب مذکورہ میں مؤلف کے معاصرین افضل پانی پتی ۔جعفر زٹلی وغیرہ سے مؤلف کا موازنہ بھی کیا ہے۔ جس سے اس دور کہ شعراء ادب نہیں اسماعیل امروہی کی خدمات کا جائزہ بھی سامنے آتا ہے۔

کتاب کی دوسری مثنوی ''معجزہ انار'' میں شاہ خیر بلقیس شاہ کی کہانی بیان کی گئی ہے یہ مثنوی اگرچہ مختصر ہے لیکن مثنوی کے مروجہ اصولوں پر پورا اترتی ہے۔اس لئے یہ بات بہت حد تک ٹھیک ہے کہ اُردو کا قدیم ادب چاہے وہ دکنی ہو یا شمالی ہند کا ادب ہو کہیں کہیں آج بھی قلمی نسخوں اور مخطوطوں کی شکل میں موجود ہے لیکن دیکھنا ہے کہ نائب نقوی کون بنتا ہے۔ یہ کام ادبی مؤرخین، اسکالرز اور محققین جس طرح ہمارے سینئر محققین اور اساتذہ نے قدیم ادب کو حتی الامکان منظر عام پر لانے کی کوشش کی جس کی مثال اسماعیل امرہوی کی یہ کتاب ''اُردو کی دو قدیم مثنویاں ہے۔ادبی حلقوں کو چاہیئے کہ بے شک جدید ادب میں نام کمائیں لیکن کلاسیکی ادب کو پس پشت ڈال کر ان کی ترقی کھوکھلی اور بے بنیاد تصور کی جائے گی۔

۸۔ اُردو کی منظوم داستانیں (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

یوں تو داستان نگاری اور داستانوں کی تاریخ پر کئی کتب لکھی گئیں ہیں لیکن جو کتاب داستان کی تاریخ کی صحیح ترجمانی کرتی ہے وہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ''اُردو کی منظوم داستانیں'' ہے۔۶۸۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو انجمن ترقی اُردو کراچی نے پہلی دفعہ ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔نو ابواب پر مشتمل کتاب مذکورہ کا انتساب ''پیر محفوظ علی'' کے نام کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان نے جامعہ کراچی سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی نگرانی میں ۱۹۶۴ء ڈاکٹریٹ کیا تھا۔کتاب مذکورہ ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ڈاکٹر جمیل الدین عالی لکھتے ہیں:

> ''دراصل یہ کتاب ڈاکٹر فرمان پوری کا وہ مقالہ ہے جس پر انہیں ۱۹۶۴ء میں جامعہ کراچی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ ان کے نگرانِ مقالہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تھے اور بیرونی معائنہ کاروں میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم جیسے بڑے نام شامل ہیں۔اس وقت تک اُردو کی چند منظوم داستانوں پر علیحدہ

علیحدہ تو تبصروں اور مقالوں کی کمی نہیں رہی تھی لیکن نثری داستانوں پر ایک تفصیلی کام مکمل ہو کر انجمن ہی سے شائع ہو چکا تھا۔ وہ ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ہے جو ایک طرح سے خود بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھوائی تھی۔'' (۳۶)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی اس کتاب میں ان داستانوں کا ذکر کیا ہے جو ہمارے کلاسیکی ادب کی اہم مثنویاں ہیں۔ کتاب کا نام شاید انہوں نے ڈاکٹر گیان کی کتاب ''اُردو کی نثری داستانیں'' کے حوالے سے رکھا ہو۔ بہر حال ہر دو کتب داستانوں کہ مکمل خزانے کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس کتاب کہ نو ابواب ہیں ہر باب اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد ہے۔ فہرست ابواب یوں ہے:

باب اول	منظوم داستانوں کی قدامت واہمیت
باب دوم	منظوم داستانوں کی ہیت ترکیبی اور فنی لوازم
باب سوم	اُردو میں منظوم داستانوں کا آغاز اور قدیم دکنی منظوم داستانیں
باب چہارم	شمالی ہند میں منظوم داستانوں کا آغاز اور سماجی پس منظر
باب پنجم	شخصی منظوم داستانیں یا آپ بیتیاں
باب ششم	غیر شخصی مختصر عشقیہ منظوم داستانیں
باب ہفتم	غیر زبانوں سے ماخوز داستانیں اور منظور ترجے
باب ہشتم	بعض طویل اور اہم منظوم داستانوں کا تفصیلی مطالعہ
باب نہم	منظوم داستانوں کا عہد عروج و زوال

مصنف نے اپنی اس تحقیقی کاوش میں ۱۸۷۰ء تک کی گئی منظوم داستانوں کا تحقیقی جائزہ لیا ہے جو ایک حد تک اُردو مثنویوں کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

''اس مقالہ میں ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۸۷۰ء تک کی اُردو منظوم داستانوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان منظوم داستانوں کی نوعیت واہمیت اور شاعرانہ حسن واثر کا مفصل ذکر تو آئندہ سطور میں ملے گا۔ اس جگہ اس قدر کہنا ہے کہ حرف اُردو نہیں بلکہ دنیا کے ہر متمدن قوم اور شائستہ زبان میں شروع سے منظوم داستانوں کو قبول عام حاصل رہا ہے اور آج جسے عالمی کلاسیکل ادب سے تعبیر کیا جاتا ہے اس میں زیادہ حصہ منظوم داستانوں ہی کا ہے۔ یہ منظوم داستانیں صرف یہی نہیں کہ قدیم ترین صنفِ سخن ہونے کی حیثیت سے تاریخی اہمیت کی حامل ہیں بلکہ ادبی وفنی نقطہ نظر سے بھی ان میں عظمت بزرگی کے آثار ملتے ہیں اور اس حد تک کہ انکا شمار ہمیشہ زندہ ادب میں کیا جائے گا۔'' (۳۷)

فاضل مصنف نے پہلے تین ابواب میں منظوم داستانوں کی اہمیت فن اور آغاز وارتقاء کے حوالہ سے مفصل بحث کی

ہے۔ جو داستانوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان کی اہمیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ کتاب مذکورہ چونکہ ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ ہے اس لئے تحقیقی ضرورتوں کے پیشِ نظر ان ابواب کا اہتمام کر کے محقق نے آنے والے اسکالرز کے لئے کام آسان کر دیا ہے۔ منظوم داستانوں کی اہمیت اور فنی حوالے سے لکھتے ہیں:

''منظوم داستانیں شاعرانہ اور ادبی نقطہءنظر سے بھی نہایت اہم ہیں۔ کوئی شخص ان کا مطالعہ کئے بغیر اعلیٰ درجہ کی شاعری اور ادب کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس لئے دنیا کا بہترین ادب بالعموم منظوم داستانوں کی صورت میں ہے۔ وہ کالی داس کے ڈرامے ہوں یا تلسی داس کی رامائن، میر حسن کی مثنوی سحر البیان ہو یا نسیم کی گل بکاؤلی، فردوسی کا شاہنامہ ہو یا ہومر کی الیڈ و اور اوڈیسی ورجل کی اینڈ ہیو یا توسو کی یروشلم آزاد، ملٹن کی فردوس گمشدہ ہو یا اسپنسر کی فیری کوئن۔ گوئٹے کی فاؤسٹ ہو یا ڈانٹے کی طربیہ ربانی۔ ان میں سے کوئی بھی داستانوی عناصر سے خالی نہیں ہے بلکہ اکثر میں داستان کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ منظوم داستانوں کا ایک اور پہلو نہایت اہم ہے۔ وہ ان کا اخلاقی اور اصلاحی پہلو ہے۔ چونکہ داستانوں میں کامیابی کا میدان ہمیشہ نیکوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور بدخصلت، بدنیت ہمیشہ منہ کی کھاتے ہیں اس لئے ان سے شکستہ دل نیکوں کی نفسیاتی اور روحانی اطمینان وتسلی کا پہلو نکل آتا ہے۔ عملی طور پر ان سے اخلاق کی اصلاح اور نیکی کی تبلیغ وفروغ میں مدد ملتی ہے۔ داستان سننے والا نیکی اور بدی کے نتائج سے متاثر ہو کر اکثر اپنے اعمال کا محاسبہ شروع کر دیتا ہے اور غیر شعوری طور پر نیکی کی برکتوں کا قائل ہو جاتا ہے۔'' (۳۸)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا اہم کارنامہ جنوب ہند اور شمالی ہند کی منظوم داستانوں کی تاریخ مرتب کرنا ہے۔ انہوں نے دکن اور دہلی کے داستانوں میں تخلیق کی گئی۔ منظوم داستانوں کی تاریخ اور ان پر محققانہ تبصرہ پیش کیا ہے جس سے نہ صرف داستانوں کی معلومات ملتی ہیں بلکہ ہندوستان کہ شمال اور جنوب کی تہذیب کا مکمل عکس بھی ملتا ہے۔

جنوبی ہند کی منظوم داستانوں کا کثیر سرمایہ دکن کے بہمنی دور، قطب شاہی دور اور عادل شاہی دور میں تخلیق ہوا۔ جس میں فخر والدین نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' سے آغاز کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مقیمی، صنعتی، امیر خسرو، رستمی، نصرتی، میراں جی، قدرتی، فیروز، محمود، وجہی، قلی قطب شاہ، غواصی ابن نشاطی اور دیگر بیسیوں شعراء نے اُردو مثنویاں لکھنے کا آغاز کیا جو دیکھتے ہی دیکھتے ادب کا ایک کثیر خزانہ جمع ہو گیا۔ اس کلاسیکی ادب کا تمام تر سہرا قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں کہ سر ہے۔ عادل شاہی دور کی جن مثنویوں کو مصنف نے بطور خاص موضوع بنایا ہے وہ مقیمی کی'' چندر بدنو میہار'' امین دکنی کی ''بہرام وحسن بانو'' صنعتی کی ''قصہ بےنظیر اور قصہ ملکہ مصر'' ملک خوشنود کی ''ہشت بہشت'' رستمی کی خاور نامہ نصرتی کی ''گلشن عشق اور علی نامہ''، قراتی کی ''قصص الانبیاء اور باسمیٰ کی ''یوسف زلیخا'' ہیں۔ قطب شاہی دور کی تیس مثنویوں کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے جن کی فہرست معہ مصنف اور ہجری سن کے یوں ہے:

۱۔	کدم راؤ پدم راؤ	مصنفہ	نظامی،	بعہد بہمنی ۸۲۵ھ اور ۸۳۸ھ کے درمیان	
۲۔	خوب ترنگ	,,	شیخ خوب محمد چشتی،	بعہد خود مختاری گجرات	۹۸۶ھ
۳۔	قطب مشتری	,,	وجہیؔ،	بعہد قطب شاہی	۱۰۲۰ھ
۴۔	چندر اور لوک	,,	عواصیؔ،	بعہد قطب شاہی قبل	۱۰۳۵ھ
۵۔	سیف الملوک و بدیع الجمال	,,	,,	,,	,, ۱۰۳۵ھ
۶۔	طوطی نامہ	,,	,,	,,	,, ۱۰۴۹ھ
۷۔	لیلیٰ مجنوں	,,	,,	,,	,, نامعلوم
۸۔	چندر بدن و مہیار	,,	مقیمی،	بعہد عادل شاہی	۱۰۳۵ھ تا ۱۰۵۰ھ
۹۔	بہرام و حسن بانو	مصنفہ	امین دکنی،	بعہد عادل شاہی	۱۰۵۰ھ
۱۰۔	قصہ بے نظیر	,,	صنعتی،	,,	,, ۱۰۵۵ھ
۱۱۔	گلدستہ	,,	,,	,,	,, ۱۰۵۵ھ
۱۲۔	قصہ ملکہ مصر	,,	,,	,,	نامعلوم
۱۳۔	ہشت بہشت	,,	ملک خوشنود	,,	,, ۱۰۵۶ھ
۱۴۔	خاور نامہ	,,	رستمی،	,,	,, ۱۰۵۹ھ
۱۵۔	بہرام اور حسن بانو	,,	تکملہ،	,,	,, ۱۰۶۰ھ
۱۶۔	ماہِ پیکر	,,	جنیدیؔ،	بعہد قطب شاہی	۱۰۶۴ھ
۱۷۔	پھول بند	,,	ابن نشاطیؔ	,,	,, ۱۰۶۶ھ
۱۸۔	گلشن عشق	,,	نصرتیؔ،	بعہد عادل شاہی	۱۰۶۸ھ
۱۹۔	علی نامہ	,,	,,	,,	,, ۱۰۷۶ھ
۲۰۔	بہرام و گل اندام	,,	طبعی،	بعہد قطب شاہی	۱۰۸۱ھ
۲۱۔	ابوشحمہ	,,	امین،	,,	,, ۱۰۹۰ھ
۲۲۔	پدماوت	,,	غلام علی،	,,	,, ۱۰۹۱ھ
۲۳۔	جنگ نامہ	,,	سیوکؔ،	,,	,, ۱۰۹۲ھ
۲۴۔	قصہ زقوم شاہ	,,	خاکیؔ یا فتاحی،	,,	,, ۱۰۹۲ھ
۲۵۔	قصہ رضوان شاہ	,,	فائزؔ،	,,	,, ۱۰۹۴ھ

۲۶۔	قصص الانبیاء منظوم	,,	قدرتی، بعہد عادل شاہی	۱۰۹۴ھ
۲۷۔	ظفر نامہ	,,	لطیف، بعہد قطب شاہی	۱۰۹۵ھ
۲۸۔	یوسف زلیخا	,,	ہاشمی، بعہد عادل شاہی	۱۰۹۹ھ
۲۹۔	قصہ مہر وماہ یا ظفر نامہ	,,	مظفر، بعہد قطب شاہی	نامعلوم
۳۰۔	عشقِ صادق	,,	ضعیفی، بعہد مغلیہ	۱۱۰۰ھ (۳۹)

دکن کے کلاسیکی ادب کے بعد مصنف نے شمالی ہند کے مثنویوں کی تاریخ بھی درست انداز سے مرتب کی ہے۔ مذکورہ کتاب دکن اور دہلی کے داستان ادب کو خوبصورت انداز سے پیش کرتی ہے البتہ سیاسی حالات اتنے ابتر تھے کہ مغل حکومت کا چراغ گل ہونے کو تھا۔ غزل اور مثنوی کا ادب تو عروج پر تھا لیکن ملکی حکومت کو دیمک لگی ہوئی تھی جو چند سالوں کے درمیان ختم ہوگی اور انگریز ہندوستان پر قابض ہوگئے۔ شمالی ہند کے منظوم داستانوں کا رواج میر ومرزا کے دور سے شروع ہوا۔ مصنف نے میر ومیرزا سمیت دہلی اور لکھنؤ کے مثنوی نگاروں کا بغور جائزہ لیا ہے اور ایک ایک مثنوی کا خلاصہ معہ تبصرہ بھی پیش کیا ہے۔

۹۔ شعرائے اُردو کے تذکرے (ڈاکٹر حنیف نقوی)

یہ کتاب شعرائے اُردو کے تذکروں کے جائزوں پر مشتمل ہے۔ مصنف نے بہت محنت سے تذکرہ نگاری کے فن، روایت اور چند اہم تذکروں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ''اُردو کی پہلی ادبی تاریخ ''آبِ حیات'' کی اشاعت کے زمانے تک تذکروں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے جس کی بناء پر یہ دور بلا شبہ تذکرہ نگاری کا عہدِ زرّیں کہے جانے کا مستحق ہے۔ اس زمانے کے تذکروں میں اُردو زبان وادب اور اس کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والی تہذیب کے بارے میں معلومات کا جو متنوع اور وافر سرمایہ محفوظ ہے، اسکی قدر و قیمت کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں ادبِ قدیم سے متعلق موضوعات پر تحقیقی وتنقیدی زاویہ نظر سے کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ تذکروں کی اس اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے محتویات ومشتملات پر سیر حاصل بحث کے ذریعے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اس طرح اُجاگر کیا جائے کہ ایک عام قاری کے ذہن میں بھی ان میں سے کسی تذکرے کے انفرادی معیار اور افادی حیثیت کے بارے میں کوئی خلطِ مبحث باقی نہ رہے۔'' (۴۰)

مذکورہ اقتباس سے مصنف کے کتاب لکھنے کا مقصد عیاں ہے۔ درحقیقت یہ ایک تخلیق کی کتاب ہے اور تحقیق ہمیشہ سچ

کوسامنے لانے کا نام ہے،مصنف دیباچے مزید لکھتے ہیں:

''مقالے کے مختلف ابواب میں تذکروں کے متعلق موجودہ معلومات سے پوری طرح کام لینے کے باوجود تنقیح مباحث اوراستخراج نتائج میں ہم نے اپنے اندازِنظر کی انفرادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔اپنے پیش رو محققین و ناقدین سے استفادے کا ہمیں اعتراف ہے لیکن فیصلہ کن مقامات میں حتیٰ الامکان نہ تو ہم نے ان کے خیالات و بیانات سے متاثر ہوکر کوئی رائے قائم کی ہے اور نہ ثانوی ذرائع سے حاصل شدہ معلومات پر اکتفاء کیا ہے۔البتہ عربی سے سرسری واقفیت اور فارسی کے تمام تذکروں کے براہِ راست مطالعے کی دشواری کے باعث بعض اوقات اس موضوع پر کام کرنے والے مشہور ومعتبر مصنفین اور صاحبِ نظر کرم فرماؤں کی اعانت کا سہارالینا پڑا ہے۔'' (۴۱)

مصنف نے اپنے اندازِنظر پر زور دیتے ہوئے استخراج نتائج کے لئے اپنے نکتہءنظر کو اہمیت دی ہے۔ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنے مقالے کے آٹھ ابواب مقرر کئے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تذکرہ نگاری بحیثیت فن

۲۔ عربی و فارسی میں تذکرہ نگاری کی روایت

۳۔ اُردو تذکرہ نگاری۔آغاز سے شیفتہ کے عہد تک

۴۔ نکات اشعراء اور دوسرے ابتدائی تذکرے

۵۔ چمنستانِ شعراء سے گلشنِ سخن تک

۶۔ تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحاء اور معاصر تذکرے

۷۔ طویل اور جامع تذکرے

۸۔ حاصلِ کلام

ان تمام ابواب سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تذکروں سے متعلق تمام معلومات اور مواد اس کتاب میں موجود ہے۔ڈاکٹر حنیف نقوی کو اس مقالے کی بنیاد پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی تفویض ہوئی، وہ لکھتے ہیں:

''یہ مقالہ ڈاکٹر ابومحمد صاحبِ سحر پروفیسر وصدر شعبہء اُردو گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال کی نگرانی میں لکھا گیا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے مواد کی فراہمی سے اس کی ترتیب تک سارے ہی مراحل میں جس انہماک اور توجہ کے ساتھ میری رہنمائی فرمائی ہے میں اس کے لئے ان کا بے حد ممنون ہوں۔یہ موصوف کے علمی شغف اور ناقدانہ ومحققانہ بصیرت ہی کا فیضان تھا کہ خدمت لوحِ قلم کے اس صبر طلب مرحلے میں تمنا کی بیتابی کسی مقام پر گریز پائی پر مجبور نہ کرسکی اور راقم اسطور کو ایک ایسے موضوع

پر جس کی دقت بھی کسی شرح و بیان کی محتاج نہیں ایک مبسوط تحقیقی وتنقیدی مقالہ اہلِ نظر کی بارگاہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ (۴۲)

ڈاکٹر حنیف نے تحقیق کے اصول اور قواعد کو مدِ نظر رکھا اور تذکروں کی معلومات فراہم کرنے میں پوری محنت سے کام لیا ہے۔ مقالے کے آخری باب'' حاصل کلام''میں وہ لکھتے ہیں:

''تذکروں کی قدر و قیمت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لئے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ تذکرہ نویسی کا فن نہ تو براہِ راست تاریخ نگاری کہ ذیل میں آتا ہے نہ اسے فنِ سیرت یا سوانح نگاری کہ تحت رکھا جاسکتا ہے۔ اور نہ اس کا دائرہ کار تنقید کی طرح صرف اچھے برے کی پرکھ تک محدود ہے بلکہ درحقیقت یہ ان تمام فنون یا اصناف ادب کا آمیزہ اور بجائے خود ایک فن یا صنفِ ادب ہے۔ تذکرہ نگار شاعر کے مختصر حالاتِ زندگی کو قلم بند کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما عوامل کا ذکر کرتا ہوا اس کی وضع قطع اور عادات و اخلاق کی کیفیت بیان کرتا ہے اور اس کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں پر اجمالی انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں بطورِ نمونہ چند اشعار پیش کر کے اپنی ذمہّ داریوں سے سبکدوش ہوجاتا ہے۔''(۴۳)

تذکرے کے فن پر لکھنے کے لئے جن صلاحیتوں اور خوبیوں کا ہونا ضروری ہے وہ اس اقتباس میں مصنف نے بیان کر دیا ہے۔ تاہم کہا جاسکتا ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب میں تحقیق اور تنقید کا پورا پورا خیال رکھا ہے اور فنِ تذکرہ نگاری کی پوری تاریخ بیان کردی ہے۔

ڈاکٹر حنیف نقوی نے تذکروں کا جائزہ نہ صرف محققانہ انداز سے لیا ہے بلکہ تنقید کے پہلو کو بھی مدِّ نظر رکھا ہے۔ درحقیقت تاریخِ ادب اُردو میں تذکروں کی خاص اہمیت ہے جس کو اس کتاب میں اجاگر کردیا گیا ہے۔ بے شک تذکروں میں محض بنیادی اور سوانحی معلومات بہم پہنچائی جاتی تھی مگر اس بنیادی اور سوانحی معلومات سے ہی تحقیق اور تنقید کی بنیاد فراہم ہوئی۔ اس پہلو کو ہی ڈاکٹر موصوف نے بیان کیا ہے۔

۱۰۔ اُردو سٹیج ڈراما (رادھا کنہیا سے انارکلی تک اُردو سٹیج ڈرامے کی مکمل تاریخ)
(ڈاکٹر اے بی اشرف)

ڈاکٹر اے بی اشرف کی کتاب ''اُردو سٹیج ڈراما ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کا ابتدائی حصہ ہے'' یہ بنیادی طور پر ڈرامے کی تاریخ اور ارتقاء کے بارے میں ہے۔ تاہم اسمیں ڈرامے کے فن، اس کے آغاز و ارتقاء اور برصغیر میں اُردو

ڈرامے کے ظہور اور اس کے مختلف ادوار پر بھی مجمل بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے ڈرامے کی فنی حیثیت کے حوالے سے مختلف ادوار پر روشنی ڈالنے کہ ساتھ ساتھ ڈرامے کی ابتدائی صورتوں سے اب تک ہونے والی تبدیلیوں پر بحث کرتے ہوئے مصری، چینی، یونانی اور قدیم سن سکرت ڈراموں کا موازنہ بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اے بی اشرف کہتے ہیں:

''میری یہ کتاب دراصل میرے پی۔ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالے ''اُردو ڈرامے کا ارتقاء'' اور حکیم احمد شجاع کا بحیثیت ڈرامہ نگار خصوصی مطالعہ کا پہلا اور ابتدائی حصہ ہے۔ اس مقالے پر مجھے بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ جب اس مقالے کو چھپوانے کا خیال پیدا ہوا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس مقالے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے الگ الگ شائع کراؤں۔ چناچہ اس پہلے حصے کو میں نے الگ کر لیا اور اس میں موجود عنوان کے تحت شائع کرا رہا ہوں۔ تحقیقی مقالے میں اس مواد کی نوعیت کچھ اور تھی اب میں نے اس میں ترمیم و اضافہ کر کے اسے کچھ اور صورت دیدی ہے۔ موجودہ صورت میں اس کتاب کے مندرجہ ذیل ابواب ہیں:

باب اول　　ڈرامہ کا فن

باب دوم　　مختلف تہذیبوں کی قدیم ڈرامائی روایات اور ڈراما سرزمین پاک و ہند میں باب سوم اُردو ڈرامے کا آغاز و ارتقاء (آرام تک)

باب چہارم　　اُردو ڈرامے کا رنگِ قدیم

باب پنجم　　قدیم رنگ میں اصلاحی دور اور جدید دور کا آغاز (۴۴)

کتاب کا پہلا باب ڈرامے کی فنی ہیت میں مصنف نے ڈرامے کے فن کہ حوالے سے سات حصے کئے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

(۱)　ڈرامہ کی فنی حیثیت - ڈرامہ ایک فن کی حیثیت سے - اس فن کی قدامت و دیگر اصنافِ ادب اور ڈرامے میں فرق-- تعریف

(۲)　ڈرامہ کہ بنیادی عناصر- (الف) داخلی عناصر - (آہنگ، تسلسل، تعطل تذبذب، تصادم (ب) خارجی عناصر- تھیٹر اور ڈراما (سٹیج- اداکار - تماشائی)

(۳)　ڈرامائی مفاہمتیں - ضرورت اور جواز

(۴)　آحادِ ثلاثہ - (وحدتِ زماں، وحدتِ مکاں اور وحدتِ عمل) تعریف - موجودہ دور میں ان کی حیثیت - وحدتِ تاثر کی اہمیت

(۵)　ڈرامے کے اجزائے ترکیبی: (قصہ، کردار، الفاظ، خیال، آرائش، موسیقی)

(٦)　ڈرامائی خط (تمہید، ارتقاء، انتہا، تنزل، انجام)

(۷)　ڈرامے کی اقسام (حزنیہ، طربیہ، مخلوط، المطربیہ، میلوڈراما، فارس، براسک، اوپیرا، ڈریم وغیرہ) (۴۵)

اس باب کے مطالعے سے فن ڈراما نگاری کہ اجزاء اقسام اور دیگر بنیادی عناصر پر روشنی پڑتی ہے۔ گویا ڈراما کی تفہیم کہ لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس بیان میں بیان کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا باب قدیم ڈرامائی روایات اور ڈرامے کی روایات سرزمین پاک و ہند میں ڈرامے کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے نہایت اہم باب ہے۔ روایت اور ابتدا کی تفہیم ہی سب کچھ سمجھا دیتی ہے۔ ڈاکٹر اے بی اشرف ڈرامے کی قدامت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈرامہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود یہ انسان اور اس کے جولان گاہ۔۔۔۔ یہ دنیا کیونکہ ڈرامے کی ابتداء انسان کی پیدائش کے ساتھ ہوئی انسان کی سرشت میں نقالی کا جو جذبہ فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا ہے وہ ڈرامے کے وجود کا باعث بنا۔ پھر زبان کی تشکیل کہ بعد گفتگو کے ذریعے یا ہرکات وسکنات کہ وسیلے سے کسی عمل کو متشکل و مجسم کرنا بھی فطرتِ انسانی کا حصہ رہا ہے۔ اظہار ذات کی فطری خواہش کے تحت انسان جب اپنے تجربوں کو بیان کرنے کا آرزومند ہوا تو اس نے حرکت و عمل سے بھی مدد لی۔ نقل یا گفتار اور حرکت و عمل کہ ذریعے اپنے آپ کو دوسروں پر منکشف کرنا ہی ڈرامے کی بنیاد ہے۔ گویا یہ ایک بنیادی انسانی ضرورت ہے۔ جان گیز نے ڈرامے کو انسان کی بنیادی ضروریات کی پیداوار قرار دیا ہے۔'' (۴۶)

اس اقتباس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ڈراما بہت قدیم صنف سے بلکہ آغازِ انسان سے ہی اس کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔

باب سوم میں اُردو ڈراما لکھنے میں کیسے ارتقاء پذیر ہوا لکھنوٗ کا شاہی سٹیج، رادھا کنہیا، اندرسبھا، ڈراما بنگال میں آرام کا تفصیلی مطالعہ اور دیگر پارسی ڈراما نگاروں کا مطالعہ شامل ہے۔ اُردو ڈرامے کے آغاز کے متعلق مصنف کہتے ہیں:

''اب تک جو گفتگو پہلے باب میں کی گئی ہے اس کا تعلق برِصغیر پاک و ہند میں ڈرامے کی روایت کے آغاز سے ہے۔ اس سلسلے میں تاریخی اعتبار سے ڈرامے کی روایات کا جو خزانہ برصغیر میں دستیاب رہا ہے، جن جن زبانوں میں رہا ہے، جن جن صورتوں میں رہا ہے ان سب کا ذکر حسبِ ضرورت کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً پہلے باب میں کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو ڈرامے کے سیاسی، سماجی اور فنی پسِ منظر کا جائزہ بھی اتنی تفصیل سے لیا گیا ہے جتنی ضرورت تھی۔ یہاں تک جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس سے اُردو ڈرامے کا ایک ایسا پسِ منظر تیار ہوجاتا ہے جس کے حوالہ سے اب ہم اپنی بات کو آگے بڑھانے کے قابل بھی ہوئے ہیں۔ اور براہِ راست اُردو زبان میں لکھے گئے ڈراموں کا جائزہ بھی لے سکتے ہیں۔ چناچہ اس بحث سے قطع نظر کے اُردو کا پہلا باقاعدہ ڈراما یہ ہے یا وہ۔۔۔۔ میں براہِ راست تاریخی اعتبار سے اُردو ڈرامے کے ارتقائی عمل کا جائزہ لینا پسند کروں گا کیونکہ اُردو ڈرامہ

کے ابتدائی نقش کہ بارے میں اتنی مباحث موجود ہیں کہ یہاں ان کا اعادہ تضیع اوقات بھی ہے۔اور تکرارِ محض بھی، میں صرف حاشیے میں اسکا اشارہ کردونگا۔'' (۴۷)

باب چہارم میں اُردو ڈرامے کا رنگ قدیم بیان ہوا ہے جس میں رونق بنارسی، حسینی میاں ظریف، حافظ محمد عبداللہ، مرزا نظیر بیگ اور متفرق ڈراما نگاروں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔مثلاً مصنف رونق بنارسی کہ بارے میں لکھتے ہیں:

''چوتھے باب کا آغاز ہم رونق بنارسی کے ذکر سے کرتے ہیں۔رونق بنارسی تھیٹر کے پہلے نہایت اہم غیر پارسی ڈراما نگار تھے، ان کا نام محمود احمد اور تخلص رونق تھا۔ان کے آباؤ اجداد بنارس کے رہنے والے تھے لیکن بعد میں دکن منتقل ہوگئے اور رونق اس سرزمین میں پیدا ہوئے۔اٹھارہ سال کی عمر میں بمبئی آئے اور یہاں ایک کاٹن مل میں ملازم ہوگئے لیکن ان کے ادبی اور شعری ذوق نے انہیں تھیٹر کی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز ڈراما نویس اور اداکار کی حیثیت سے کیا۔ وہ پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے ساتھ وابستہ ہوئے۔اور ساری زندگی وہی گذاردی۔ ۱۸۸۶ء میں خودکشی کرکے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔'' (۴۸)

مصنف نے جس انداز سے رونق بنارسی کا اُردو ڈرامے کی خدمات کو موضوع بنایا ہے اور انکی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے تحقیق کو پیشِ نظر رکھ کر اپنا مقالہ مکمل کیا ہے۔

کتاب کا باب پنجم قدیم رنگ میں اصلاحی دور اور جدید دور کا آغاز بہت اہم ہے۔اس میں طالب بنارسی، احسن لکھنوی، آغا حشر کاشمیری، بیتاب دہلوی، حکیم احمد شجاع، امتیاز علی تاج کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب میں امتیاز علی تاج تک اُردو ڈراما نگاری کا مجموعی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔مصنف لکھتے ہیں:

''اب تک ہم نے اُردو ڈرامہ کے ارتقاء سے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اُردو اسٹیج ڈرامہ نے مختلف فنی مراحل طے کرنے اور مغربی اثرات قبول کرنے کے باوجود کبھی اعلیٰ اور ارفع مقام حاصل نہ کیا۔اُردو ڈرامہ مسلمانوں کے دور اور تاریخی اعتبار سے جاگیرداری معاشرے کی زوال آمادہ قدروں کی پیداوار تھا۔اس معاشرے کی ساری تخلیقی قوتیں زوال پستی اور غلامی کی نذر ہوچکی تھیں۔سارا معاشرہ بنجر پن کا شکار تھا۔غلامی، اکتاہٹ اور کسالت کے آثار سے اس دور کا سارا منظر نامہ مرتب ہورہا تھا۔سستی، تھکاوٹ اور آہستہ روی کے یہ اثرات ہمیں اس دور کہ ڈرامے میں دکھائی دیتے ہیں۔زوال پذیر معاشرے میں تفریح کا سامان رقص و موسیقی، تعیش پسندی اور مزاح وظرافت کے سطحی عناصر میں تلاش کیا جاتا تھا۔یہی کچھ ابتدائی ڈرامے کی کائنات ہے۔چنانچہ رادھا کنہیا سے لیکر اندرسبھا تک اور اندرسبھا سے پارسی دور تک اُردو ڈرامہ کی روایت جن مقاصد کہ تحت وجود میں آئی تھی اور جو سیاسی، سماجی اور فنی محرکات اس کی ابتدائی نشونماء

اور ترویج وترقی میں عمل پیرا رہے تھے۔ان کی بناء پر ہم اس طرح کے فن کی توقع کر سکتے تھے جیسا کہ
پیدا ہو۔اس کی تفصیل اُردو ڈرامے کے سیاسی وسماجی پسِ منظر کا جائزہ لیتے ہوئے پیش کر دی گئی ہے
اس کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔'' (۴۹)

فاضل مصنف نے اس کتاب ''اُردو سٹیج ڈراما'' کے ہر باب کو ایک خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اور بڑی تفصیل کہ ساتھ ڈراما نگاروں کے فن کا جائزہ بھی لیا ہے۔اس لحاظ سے یہ کتاب انفرادیت کی حامل ہے۔مصنف نے اُردو اسٹیج ڈرامہ کے آغاز وارتقاء کو محققانہ انداز سے بیان کیا ہے۔

۱۱۔ اُردو افسانے کا ارتقاء (ڈاکٹر مسعود رضا خاکی)

ڈاکٹر مسعود رضا خاکی کا شاہکار ''اُردو افسانے کا ارتقاء'' کا پہلا ایڈیشن اگست ۱۹۸۷ء میں مکتبہء خیال لاہور کے زیرِ اہتمام منظرِ عام ہوا۔(۵۰) چھ ابواب پر مشتمل اس کتاب کہ پہلے دو ابواب میں افسانہ نگاری کا فن اور ارتقائی پسِ منظر پر مباحث ہیں۔ابواب تیسری میں چھوٹے چھوٹے ذیلی عنوانات کا اہتمام کر کے قارئین کے لئے سہولت قائم کی گئی ہے۔اس کتاب کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہونی چاہئے تھی کہ اس میں افسانے کے قواعد وضوابط پسِ منظر سے لے کر عہدِ موجود تک افسانہ نگاری کی سوسالہ تاریخ کو رقم کر کے اس پر مجموعی جائزہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ پہلے باب کا تعارف کراتے ہوئے مصنف خود لکھتے ہیں:

''پہلا باب افسانہ نگاری کے فن سے متعلق ہے اور افسانے کو ایک ادبی صنف کی حیثیت سے جو مقام حاصل ہے اسکا تعارف کرایا گیا ہے۔اس کی انفرادی تعریف کے سلسلے میں مختلف زبانوں کے مفکرین اور ناقدین کہ اقوال کا تحقیقی جائزہ لیکر افسانے کی اُردو میں ایک جامع تعریف متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے علاوہ دوسری ادبی اصناف خصوصاً قصہ گوئی کی دوسری اقسام کے مقابلے میں افسانہ کو جو امتیازی خصوصیات حاصل ہیں ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔'' (۵۱)

مصنف نے پہلے باب ''افسانہ نگاری کا فن'' میں اضافے کی جامع تعریف اور افسانے کی امتیازی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔گو کتاب کا اصل موضوع اُردو کا ارتقاء ہے۔لیکن پہلا باب افسانے کے ارتقائی مراحل کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

پہلے باب کی طرح دوسرا باب بھی موضوع سے قطع نظر ہے لیکن پہلے باب میں مصنف نے افسانہ نگاری کہ فن پر بات کی ہے اس لئے دوسرے باب میں اُردو افسانے کا ارتقائی پسِ منظر پیش کرنا مصنف کے لئے ضروری تھا جس کا انہوں نے بخوبی مظاہرہ کیا ہے۔اُردو افسانے کا آغاز تو بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا۔لیکن اس کا پسِ منظر مصنف نے عربی اور فارسی

زبانوں کہ قدیم قصوں میں دیکھنے کی کوشش کی ہے یہی نہیں بلکہ اُردو زبان کی منظوم اور نثری داستان اور پھر فورٹ ولیم کالج کہ سرمایہ قصص کا ارتقائی پسِ منظر بھی پیش کیا ہے۔اس سارے قصے کو سمیٹتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں۔

''اگر چہ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اُردو زبان کے موجودہ مختصر افسانہ کی پیدائش شعور کے ایک ایسے تابناک زمانہ میں ہوئی جبکہ ادب قومی زندگی میں ایک تعمیری رول ادا کرنے لگا تھا اور بقول پروفیسر سید احتشام حسین اسے (اُردو افسانہ کو) گھٹنوں چل کر جوان نہیں ہونا پڑا بقول پروفیسر سید وقار عظیم ہمارے افسانے کی عمر ابھی بہ مشکل پچاس سال کی ہے لیکن حقیقت بھی اپنی جگہ روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ افسانہ کے صحیح خدوخال کو پہچاننے اور اس کی منفرد حیثیت کو سمجھنے کے لئے اُردو قصہ گوئی کے ارتقائی مراحل اور زمانی ترتیب کو بھی پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔اور ان سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی رجحانات کے پسِ منظر کا بھی مطالعہ کرنا پڑتا ہے جنہوں نے بیسویں صدی کے عوام اور خواص کو زندگی کہ ہر شعبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔''(۵۲)

مصنف نے جس طرح اُردو افسانے کا ارتقاء پیش کیا ہے اسی طرح اپنی کتاب کو بھی ارتقائی ترتیب دیکر خوبصورتی سے آراستہ کیا ہے۔جسکی مثال کتاب کی ابواب بندی ہے۔تاریخ نگاری کا سہارا لیتے ہوئے مصنف نے تیسرے باب میں اُردو افسانے کا آغاز جبکہ چوتھے اور پانچویں باب میں افسانہ نگاری کی تقریباً صدسالہ تاریخ رقم کردی ہے۔مصنف نے ایک باب کو آغاز سے ۱۹۳۶ء یعنی پریم چند تک جب کے پانچویں باب کو نئے رجحانات کا عنوان دے کر افسانے کی تاریخ کو ۱۹۸۰ء تک پہنچا دیا ہے۔مصنف نے سیکڑوں افسانہ نگاری کی طویل فہرست کو گنوا کر قابلِ ذکر افسانہ نگاروں کہ فن و شخصیت کو بروئے کار لاتے ہوئے افسانے کہ قاری کہ لئے مفید معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کر دیا ہے نئے رجحانات کا زمانہ کے حوالہ سے مصنف لکھتے ہیں:

''اُردو افسانے میں رجحانات کی ابتداء راشدالخیری، پریم چند، ہلدرم اور نیاز فتح پوری نے کی تھی۔ ان کے شباب کا زمانہ ۱۹۲۸ء تک ہے۔اس رنگ میں بہت سے افسانہ نگاروں نے لکھنے کی کامیاب کوشش کی لیکن اپنا انفرادی رنگ جمانے کا جو جذبہ ہر ادیب میں ہوتا ہے اس کی تسکین کے لئے نئے زاویوں کی تلاش بھی شروع ہوگی غیر زبانوں کے افسانوں کو اُردو میں منتقل کرنے کا رجحان اسی نئے گوشے نظروں کے سامنے آئے اور زمانہ کی بدلی ہوئی اقداء کے ساتھ پریم چند اور ان کے بہت سے معاصرین نے بھی اپنے افسانوں میں موضوعات کا رخ کیا''۔(۵۳)

افسانہ نگاری کہ میدان میں جتنے بھی نامور افسانہ نگار سامنے آئے مصنف نے ان کے افسانوں کی تاریخی ترتیب اور فن کو پیش کر دیا ہے۔ترقی پسند افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی اور بیدی جبکہ روحانی لف نومی ادیبوں میں نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری، قاضی عبدالغفار، عابد علی عابد اور ساغر نظامی کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔

اس کے علاوہ منٹو، ممتاز مفتی، حسن عسکری، آغا بابر، قدرت اللہ شہاب، غلام عباس، مرزا ادیب، احمد عباس اور سہیل عظیم آبادی بھی اس کتاب کا موضوع ہیں۔

مصنف نے چند خواتین افسانہ نگاروں مثلاً شکیلہ اختر، شائستہ اکرام اللہ، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، ممتاز شیریں جب کہ نئی پود میں ابنِ انشاء، شوکت صدیقی، اشفاق احمد، امجد الطاف اور کئی دوسرے افسانہ نویسوں کا بھی سرسری ذکر کر کے ان کے افسانوں کا جائزہ لیا ہے۔ اپنی اس کاوش کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں نے مجموعی حیثیت سے ان تمام افسانہ نگاروں کے انفرادی مقامات کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی پہلی تخلیق کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ان کے افسانوں کے تمام مجموعوں کا بھی تذکرہ کر دیا ہے۔ آخری باب میں افسانے کے ارتقاء پر ایک مجموعی نظر ڈالی گئی ہے۔ اور وہ پہلو جو ابواب کی تقسیم کی وجہ سے تشنہ وضاحت رہ گئے تھے ان کو آخر میں واضح کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ چند فہرستیں بھی ہیں جن کی شمولیت تحقیقی نقطہ ءنظر ضروری تھی۔ لیکن مقالے کہ متن میں ان کہ لئے گنجائش نہیں تھی اس لئے ان کو بطور ضمیمہ آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔'' (۵۴)

ڈاکٹر مسعود رضا خاکی نے ''اُردو افسانے کا ارتقاء'' کو تقریباً پانچ سوصفحات پر پھیلا دیا ہے اس لئے عمومی تاریخ نگاری کی تواریخ جواب دہی کرنے کہ ساتھ ساتھ ان کے افسانے کہ تمام مجموعوں کا بھی تذکرہ کر دیا ہے۔ آخری باب میں افسانے کہ ارتقاء پر ایک مجموعی نظر ڈالی گئی ہے اور وہ پہلو جو ابواب کی تقسیم کی وجہ سے تشنہ رہ گئے تھے ان کو آخر میں واضح کر دیا ہے۔ اس کہ علاوہ چند فہرستیں بھی ہیں جن کی شمولیت تخلیقی نقطہ ءنظر ضروری تھا لیکن مقالے کہ متن میں ان کے لئے گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے ان کو بطور ضمیمہ آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مسعود رضا خاکی نے ''اُردو افسانے کا ارتقاء'' کو تقریباً پانچ سوصفحات پر پھیلا دیا ہے اس لئے عمومی تاریخ نگاری کی تواریخ جو مجموعی ادب کو پیش کرتی ہیں وہ بھی چھ سات سوصفحات تک محدود ہوتی ہیں۔ مصنف کی عطایہ ہے کہ انہوں نے صرف ایک صنفِ ادب یعنی افسانے کو اتنا وسیع تناظر میں پیش کر دیا ہے کہ ان کا اعلیٰ کارنامہ ہے۔

۱۲۔ داستان کی داستان (آرزو چوہدری)

مختلف زبانوں کے ادب میں منظوم قصوں کا رواج قدیم تہذیبوں میں کسی نہ کسی حوالے سے موجود تھا۔ عربی فارسی کے بعد جب اُردو زبان تاریخ عالم میں متعارف ہوئی تو یہاں بھی فارسی سے اثر لیتے ہوئے منظوم داستانوں کا آغاز ہوا منظوم قصے سے شعر و آواز کو الگ کر دیا جائے تو صرف قصہ یعنی داستان باقی رہ جاتی ہے۔ لہٰذا داستان بھی اثر افرینی اور تاثیر انگیزی

اپنے اندر ضرور رکھتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قدیم دکنی ادب اور شمالی ہند میں غزل مثنوی اور قصیدہ کہ ساتھ ساتھ داستانیں بھی لکھی گئیں۔ بادشاہوں کے درباروں سے منسلک قصہ گو اور شعراء کی کثیر تعداد اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ نثری داستان کا رواج بھی اُردو ادب کے آغاز سے ہو گیا تھا۔

''داستان کی داستان'' آرزو چودھری کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے جس میں قدیم داستانوں سے لے کر جدید ادب تک کے دور کی منظوم اور نثری داستانوں کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ چھ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ء کو عظیم اکیڈمی لاہور نے شائع کیا۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ''داستان کی داستان ایک عرصے سے سپنوں کی چاندنی بن کر مسلسل کشتِ دل و جان پر برس رہی تھی شعور و لاشعور کے غیر مرئی افق پر کئی سال تک تاباں و فروزاں چاند تنہا تنہا طلوع و غروب ہوتے رہے اور میں چاندنی میں بھیکتا رہا، بھیکتا رہا۔ اور اب بفضلِ خدا اور احباب کی دعاؤں کہ طفیل چھن چھن برستی یہ چاندنی سمٹ کر تعبیر کی صورت سامنے آئی ہے۔'' (۵۵)

اس کتاب میں عالمی کلاسیکی کہانیوں کہ پسِ منظر میں اُردو داستانوں کی تاریخ کے علاوہ ان پر تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

کتاب مذکورہ کے دس ابواب میں پہلے باب کے علاوہ باقی تمام ابواب اُردو داستانوں کی تاریخی ترتیب پیش کرتے ہیں پہلے باب میں دنیا کے قدیم ترین ادب خصوصاً سومیری دور، بابلی کہانیاں، چین، جاپان اور تبت کی اساطیری داستانیں یونانی ادب، عربی ادب، روسی ادب اور قدیم سن سکرت زبان کی داستانوں کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلے باب میں مصنف نے جس محنت اور اولالعزمی کا ثبوت دیا ہے لائقِ ستائش ہے۔ فصلِ دوم شعر و نغمہ کہ عنوان سے ہے جس میں جنوبی ہند کی منظوم داستانوں کہ ساتھ ساتھ دہلی اور لکھنؤ کی مشہور مثنویوں کا تعارف دیا گیا ہے۔ اس باب میں بیجاپور، گول کنڈا، اودھ، دہلی اور لکھنؤ کی شہرہ آفاق مثنویوں پر مبصرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ کہانی کا خلاصہ اور اشعار کے حوالے مصنف کے مستند ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً میر تقی میر کی دریائے عشق پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دریائے عشق کی داستان قدرِ طویل ہے۔ پورا قصہ پونے تین سو اشعار پر مشتمل ہے واقعات میں تسلسل ہے اور اسلوبِ بیان تازہ و شگفتہ ہے دریائے عشق کا قصہ میر کے حصوں میں سب سے بہتر ہے۔'' (۵۶)

فاضل مصنف کے اس شاہکار کی داد اس لئے دینا بھی ضروری ہے کہ کتاب ہٰذا میں تقریباً سو سے زائد مثنویوں اور نثری داستانوں کی تلخیص پیش کر دی گئی ہے جس سے ''داستان کی داستان'' کو ادبی شہرت نہیں مل سکی جس کی ذمہ داری ہمارے ادبی حلقوں، محققین اور اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر گیان چند کی تصنیف ''اُردو کی نثری داستانیں'' اور

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ''اُردو کی منظوم داستانیں'' ادب کی دنیا میں شہرت کہ عظیم مرتبہ تک پہنچ چکی ہے۔ کتاب ہٰذا میں منظوم و نثری داستانوں کا ایک ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پہلا باب علم انسانیت کے آغاز وارتقاء اور نشیب وفراز کو پیش کرتا ہے۔ جس کی طرف مؤرخین کی توجہ نہیں گئی حالانکہ بنظر غائر اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو داستانی ادب کہ بہت تشنہ پہلو سیراب ہوتے نظر آتے ہیں۔

مصنف آرزو چودھری نے لفظ داستان کی مناسبت سے آخری دو ابواب میں اُردو کے اولین ناول نگاروں مولوی نذیر احمد، رجب علی بیگ سرور، شرر، سرشار اور اس کے بعد نیاز فتح پور، مرزا ادیب، انتظار حسین اور خواجہ احمد عباس کے ناولوں سے داستان کے پہلو نکال کر انہیں داستان میں شامل کر دیا ہے جو ایک نئی بات ہے۔ مجموعی طور پر کتاب مذکورہ داستانی ادب کہ ان تمام پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہے جو داستان کا حصہ ہیں۔ بنیادی معلومات نے کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ادب اور تاریخ کے قارئین اور اسکالرز کے لئے سہولت پیدا ہوگئی ہے۔

فصلِ دوم اور سوم کتاب کے اہم اور ضخیم ابواب ہیں کیونکہ ان میں اُردو ادب کی تمام منظوم داستانوں کو موضوع بنایا گیا ہے ان میں طبع زاد اور نیم طبع زاد کہانیاں پیش کی گئی ہیں سرزمینِ دکن، دہلی اور لکھنؤ کی تہذیبیں اور طرزِ معاشرت کی سینکڑوں مثالیں اس دور کے روشن ادبی ادوار کی عکاس ہیں۔

اُردو ادب میں داستانوں کا جو کثیر سرمایہ تراجم کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے وہ فورٹ ولیم کالج کا مرہون منت ہے۔ اس لئے مصنف نے فارسی الاصل، سنسکرت الاصل اور عربی الاصل داستانوں کے لئے الگ الگ باب مختص کئے ہیں۔ ہر داستان کے آغاز اور اس لئے مختلف حوالے سے مختلف مترجموں کے نام اور تعارف بھی دیا ہے جس سے تشنہ معلومات کی سیرابی ہوتی ہے۔ اس لئے نوطرز مرصع، باغ و بہار، آرائش محفل، داستان امیر حمزہ، بوستانِ خیال، مذہب عشق، گل صنوبر، قصہ اگر گل اور شگوفہ محبت جیسی عظیم داستانیں معہ اُردو ادیبوں کہ ساتھ منسلک ہو کر رہ گئیں اصل میں فارسی الاصل ہیں۔ مصنف نے مندرجہ بالا داستانوں کو فارسی سے اُردو میں منتقل کرنے کے تمام مراحل اور مصنفین کی محنت وعظمت کو سراہا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان داستانوں کو پڑھتے وقت نیم طبع آزاد ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔

یہی صورتحال سنسکرت کی مشہور داستانیں کلیلہ ودمنہ اخلاقِ ہندی، ضیائے حکمت، توتا کہانی، قصہ مادھونل اور دیگر داستانوں کی ہے جو فورٹ ولیم کالج کے ذریعے اُردو میں منتقل ہوئیں۔ مذکورہ کتاب میں تمام ابواب انفرادیت کے حامل ہیں۔ مصنف موصوف نے اس کتاب کی تحقیق میں جو محنت اور لگن کا ثبوت دیا ہے وہ لائق تحسین اور مبارک باد کے حق دار ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے قارئین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

۱۳۔ دبستانِ لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء (ڈاکٹر آغا سہیل)

ڈاکٹر آغا سہیل کی تصنیف ''دبستانِ لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء'' مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور کے زیرِ اہتمام دسمبر ۱۹۸۸ء کو شائع ہوئی۔ کتاب مذکورہ کا انتساب مصنف نے اپنی اہلیہ ''حشمت آراء بیگم'' کے نام کیا ہے۔

کتاب ہٰذا فاضل مصنف کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے تاریخی عنصر نمایاں ہونے کی وجہ سے راقم نے اسے اپنے مقالے میں شامل کیا ہے۔ ابتدائیہ میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''مغربی پاکستانی اُردو اکیڈمی نے ازراہ بندہ نوازی میرے ڈاکٹریٹ کے مقالے بعنوان ''دبستانِ لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء'' کوشائع کرنے کا فیصلہ کر کے میری توقیر میں اضافہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔داستان جو لکھنؤ میں لکھی گئی اور لکھنؤ میں پھلی پھولی اور ترقی کہ مدارج طے کرتی ہوئی کبھی سرور کی فسانہ عجائب میں ظاہر ہوئی اور کبھی جاہ، قمر اور تصدق حسین کی طلسم ہوش رُباء میں تو اس نے ایک تہذیبی شکل اختیار کرلی۔ اب لکھنؤیت کی پہچان اسی داستان کہ حوالہ سے قائم ہوتی ہے۔''(۵۷)

مذکورہ کتاب مقالے کی مکمل صورت میں شائع نہیں ہوئی بلکہ اسے مختصر کر کے شائع کیا گیا ہے۔ شائع شدہ کتاب کے ابواب کی تفصیل یوں ہے:

باب اوّل	دبستانِ لکھنؤ میں داستان کے اوّلین نقوش
باب دوم	لکھنؤ کی اہم اور غیر اہم داستانیں
باب سوم	تحسین اور نوطرزِ مرصع
باب چہارم	مرزا رجب علی بیگ سرور اور افسانہ عجائب
باب پنجم	پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد داستان داستانی عناصر اور لکھنؤیت کی نمائندگی
باب ششم	طلسمات ومہمات کی داستانیں اور لکھنؤیت
باب ہفتم	دبستانِ لکھنؤ

سرزمین لکھنؤ کو ادبی شہرت اس وقت ملی جب نواب آصف الدولہ نے ریاست اودھ کے دارالسلطنت فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو بیت السلطنت بنایا۔ آصف الدولہ رزم اور بزم دونوں کے قائل تھے اس لئے انہوں نے عسکری قوت کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کو وہ ادبی فضاء دی جسے آج ادبی دنیا دبستانِ لکھنؤ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ لکھنؤ میں مرثیہ، قصیدہ، غزل اور مثنوی پر بہت کام کیا گیا لیکن باقی اصناف کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں کچھ ایسی داستانیں مرقوم ہوئیں جن کی ادبی حیثیت مسلمہ

ہے۔

فاضل مصنف نے پہلے باب میں لکھنؤ میں لکھی گئی داستانوں کے حوالے سے معلومات فراہم کی ہیں۔لکھنؤ کی اہم داستانوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''دکنی قصوں کا آغاز سب رس سے ہوتا ہے اور جنوبی ہند سے یہ روایت شمالی ہند پہنچتے پہنچتے اور بھی کئی مرحلے طے کرتی ہے۔سب رس، نوطرز مرصع اور فسانہ عجائب مقفیٰ اور مسجع ہونے کی وجہ سے ایک ہی خاندان کی داستانیں ہیں اس کے بعد سنگھاسن بتیی کا زمانہ ہے اور طوطی نامہ ہے پھر قصہ جنگِ امیر حمزہ ہے یہ بھی دکن میں مرتب ہوئی جو بعد میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں بھی لکھی گئی۔'' (۵۸)

باب مذکورہ میں مصنف نے پینتیس داستانوں کی فہرست بیان کی ہے۔جن کا تعلق دبستان لکھنؤ سے تھا آگے چل کر ان کی تفصیل بھی بیان کر دی گئی ہے۔

باب دوم میں لکھنؤ کی اہم اور غیر اہم داستانوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔اہم داستانوں کے ذیل میں ان سولہ داستانوں کی تاریخ مرتب کی گئی ہے جو صحیح معنوں میں لکھنؤ اور لکھنؤ معاشرت کی ترجمان ہے اور دبستانِ ارتقا کے سلسلے کی اہم کڑی سمجھی جاتی ہے۔ان داستانوں نے لکھنؤ کی ادبی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔لکھنؤ کی اہم داستان کی فہرست یوں دی گئی ہے:

۱۔ نوطرزِ مرصع۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطاء حسین خان تحسین

۲۔ رانی کتیکی کنور اودے بھان۔۔۔۔۔۔سید انشاء اللہ خان انشاء

۳۔ فسانہ عجائب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مرزا رجب علی بیگ سرور

۴۔ بستانِ حکمت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فقیر محمد خان گویا

۵۔ سرورِ سلطانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مرزا رجب علی بیگ سرور

۶۔ قصہ امیر حمزہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مرزا امان علی خان لکھنوی

۷۔ شبستانِ سرور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مرزا رجب علی بیگ سرور

۸۔ ترجمہ بوستانِ خیال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فرزندِ احمد صیغر بلگرامی

۹۔ طلسمِ حیرت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جعفر علی شیون کاکوروی

۱۰۔ شگوفہ محبت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مرزا رجب علی بیگ سرور

۱۱۔ طلسمِ فصاحت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد حسین جاہ

۱۲۔ داستانِ امیر حمزہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید عبداللہ بلگرامی

۱۳۔ ترجماں بوستانِ خیال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آغا صبحو وغیرہ

۱۴۔ داستانِ امیرحمزہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تصدّق حسین

۱۵۔ داستانِ امیرحمزہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جاہ و قمر

۱۶۔ الف لیلیٰ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رتن ناتھ سرشار (۵۹)

مصنف نے ان داستانوں کی فہرست کے بعد ہر داستان کا مختصر پیرا میں تعارف بیان کر دیا ہے جس سے مفید معلومات ملتی ہیں۔ مصنف لکھنؤ کی اہم اور غیر اہم داستانوں کو الگ الگ بیان کرنے کی ضرورت کیوں پڑی اسکے بارے میں یہ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''اوپر لکھنؤ کی ان اہم داستانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو صحیح معنوں میں لکھنؤ اور لکھنؤی معاشرت کی ترجمان ہیں اور داستانی ارتقاء کے سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔ جب کے لکھنؤی داستانوں کا ایک طویل سلسلہ اور بھی ہے۔ جو لکھنؤ کے کھاتے میں تو رکھی جاتی ہیں لیکن داستانی ارتقاء میں انھوں نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ بلکہ اسی سبب سے ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کہ غیر اہم اور ناقابلِ ذکر ہیں تاہم ان پر ایک نگاہ ڈال لینا ضرور ہے۔'' (۶۰)

''دبستانِ لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء'' میں لکھنؤ کی تین اہم اور مستند داستانوں پر الگ الگ باب مختص کئے گئے ہیں جو کتاب کی موضوع کی مناسبت کے حوالے سے خوب ہیں۔ مری عطاء حسین تحسین کی نوطرزِ مرصع، رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب، اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کی فسانہ آزاد پر مصنف نے الگ الگ بحث کی ہے۔ یہ داستانیں پچھلے ابواب میں بھی درج ہو چکی ہیں۔ لیکن ان پر تفصیلاً بات کر کے مصنف نے اپنے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ کتاب کے کل ۲۷۵ صفحات میں سے ۱۲۲ صفحات ان تین داستانوں کے لئے وقف کر کے مصنف نے ان کی اہمیت و افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ مندرجہ بالا ابواب میں داستان نگاری کا تفصیلی تعارف اور داستانوں کی تفصیلی تاریخ اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ کتابِ ہٰذا تحقیقی مقالہ ہونے کے باوجود لکھنؤی داستان کی مستند تاریخ ہے جسکا اعتراف خود مصنف نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے:

''مقالہ کے ابتدائی تین ابواب میں اصنافِ نثر کے سلسے میں داستان کو ایک بار دقیع صنف کی حیثیت سے پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے اور اُردو ادب کے ذیل میں اس صنف کی افادیت کو واضح کیا گیا ہے۔ مختلف شواہد کی روشنی میں اپنے بیان کو تقویت پہنچانے کے لئے تاریخی استدلال سے بھی کام لیا گیا ہے۔'' (۶۱)

آخری باب ''دبستانِ لکھنؤ'' کے عنوان سے ہے جو پانچ صفحات اور پانچ سطروں پر محیط ہے جس میں لکھنؤ کے داستان نگاروں اور داستانی تاریخ کو سرسری مگر مکمل انداز سے پیش کیا گیا ہے مصنف بات کو سمیٹتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

''تحسین، انشاء، سرور، جاہ اور قمر کہ عہد کی تہذیبی متاعِ زمانی و مکانی تسلسل کے ساتھ اپنے

اپنے فن پاروں میں جگہ پاتی رہی یا اگر صحت مند اور توانا قدریں ہمہ گیر شکل میں آفاقی بنتی رہیں تو زیادہ سے زیادہ نکھرتی گئیں اور نکھر نکھر کر عہد با عہد منتقل ہوتی رہیں۔ چناچہ جو وقت کی چھلنی سے چھن کر منتقل ہوا وہ ہر عہد میں زندہ رہا اور مصفا بنا جو تلچھٹ بچ رہی وہ محافظ خانوں میں پہنچ گئی اور مکدر کہلائی لہٰذا مذکورہ بالا فن کاروں نے دونوں اعتبارات سے ادب کو مالا مال کر دیا۔'' (۶۲)

ڈاکٹر آغا سہیل نے لکھنوی داستانی ادب پر جس انداز سے اپنا مقالہ مکمل کیا ہے وہ تحقیقی بھی ہے اور تنقیدی بھی۔ درحقیقت آغا موصوف نے داستانِ لکھنؤ کے کردار پر بھی روشنی ڈالتے ہے۔ خصوصاً نوطرزِ مرصع، فسانہ عجائب، فسانہ آزاد پر جامع اور مستند روشنی ڈالی ہے اور ''لکھنویت'' کو داستانی ادب میں بھی تلاش کیا ہے۔ دہلویت اور لکھنویت میں جو فرق ہے وہ بھی مصنف نے بیان کیا ہے۔

۱۴۔ اُردو میں مقدمہ نگاری کی روایت (ڈاکٹر ارم سلیم)

ڈاکٹر ارم سلیم نے ''اُردو میں مقدمہ نگاری کی روایت'' کو تالیف کر کے صنف وار تاریخ نگاری میں اپنا نام شامل کروالیا ہے۔ کتاب مذکورہ سنگ میل پبلی کیشنز سے ۱۹۸۸ء کو شائع ہوئی۔ جس میں مقدمہ نگاری کے فن اور خصوصیات پر بھی بات کی گئی ہے۔ جب کہ مقدمے کی تاریخ اور چند اہم مقدمے بھی موضوع بنائے گئے ہیں۔ ابواب بندی یوں ہے:

باب اول — مقدمہ کیا ہے

باب دوم — مقدمہ کے مترادفات

باب سوم — مقدمہ شعر و شاعری

باب چہارم — سب سے بڑا مقدمہ باز

باب پنجم — تین اہم مقدمے

باب ششم — چند ہنگامہ خیز مقدمہ اور دیباچے

کتاب میں الطاف حسین حالی کی کتاب مقدمہ شعر و شاعری کو اُردو کا پہلا مقدمہ قرار دیا ہے۔ حالی کی یہ کتاب ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی جبکہ ان کہ دیوان کا حصہ پہلے بن چکی تھی۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جس کتاب کی بدولت حالی پہلے نقاد ٹھہرے وہ اصل میں کتاب نہیں بلکہ ان کے اپنے دیوان کا دیباچہ تھا جو بعد میں مقدمہ کی شکل میں آ گیا ہے اور مقدمہ کی اصطلاح وضع ہو کر صنف ادب میں داخل ہوگئی۔ مصنفہ نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے محاسن کلام غالب، خلیل الرحمٰن عظمٰی کا مقدمہ کلام ''آتش'' اور ڈاکٹر مسعود حسین خان کا مقدمہ ''تاریخ زبان اُردو'' کو اُردو کے تین اہم مقدمے قرار دیا ہے لیکن

زیادوتر مولوی عبدالحق کی مقدمہ نگاری کو سراہا ہے۔ ''مقدمات عبدالحق'' کو مقدمہ نگاری کی اولین اور آخری کتاب کا نام دیا ہے۔مولوی عبدالحق کے بارے میں لکھتی ہیں:

'' اُردو بابا عبدالحق۔۔۔۔۔سچا ہیرا۔۔۔۔۔عظیم انسان۔۔۔۔۔شمع انجمن۔۔۔۔۔یک چراغیت۔۔۔۔۔بقۃ السلف۔۔۔۔۔عاشق اُردو۔۔۔۔۔اُردو کا معمار اعظم۔۔۔۔۔اُردو کا زخمی سپاہی۔۔۔۔۔اُردو کا دوسرا درویش۔۔۔۔۔اُردو کے بڑے میاں۔۔۔۔۔جواں ہمت بڈھا۔۔۔۔۔مجدد اُردو یہ ہیں چند القابات اور خطابات جو مختلف لکھنے والوں نے مولوی عبدالحق کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ان کے لئے لکھے مقالات میں بطور عنوان استعمال کئے۔'' (۶۳)

تین اہم مقدمے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ان پر سیر حاصل تبصرے اور تجزئے کر کے ان کی مقدمہ نگاری کو بھی سراہا گیا ہے۔کتاب ہٰذا بنیادی طور پر تنقیدی اصولو پر مبنی ہے۔لیکن مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو مقدمہ نگاری کی تفصیلی تاریخ بھی اس میں موجود ہے۔اسی بناء پر میں نے اپنے مقالے کا موضوع بنایا ہے۔مثلاً خلیل الرحمٰن اعظمی کے مقدمے ''مقدمہ کلام آتش'' پر رائے دیتے ہوئے اس میں تنقید، تاریخ اور تحقیق کے پہلوؤ کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ملاحظہ ہو:

''خلیل الرحمٰن عظمٰی نے اگرچہ اسے ''مقدمہ کلام آتش'' قرار دیا لیکن اپنی اصل صورت میں یہ کسی کتاب کا مقدمہ نہیں تھا بلکہ ایک طویل تنقیدی مقالے کی صورت میں قسطوں میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس سے ہمیں مقدمہ نگاری کے فنی مطالعہ کے سلسلہ میں یہ نکتہ بھی ہاتھ آیا ہے کہ کسی بھی تنقیدی تحریر کو مقدمہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔قطع نظر اس سے کہ وہ کسی کتاب کہ ساتھ مقدمہ کے طور پر شائع ہوئی تھی یا نہں یہ نکتہ اس لئے قابل توجہ ہے کہ گذشتہ ابواب میں ہم نے جن مقدمات کا ذکر کیا ہے وہ سب کہ سب کسی نہ کسی کتاب کا حصہ تھے جب کے خلیل الرحمٰن اعظمٰی کا مقدمہ ان سب کے برعکس اولین صورت میں رسالہ میں باالاقساط شائع ہوتا رہا۔'' (۶۴)

مصنفہ نے کتاب کہ آخر میں چند ہنگامہ خیز معاصرانہ چشمک،خصوصاً باغ و بہار اور فسانہ عجائب، دہلی، اور لکھنؤ کی ادبی چپقلش اور مقدمہ شعروشاعری کی بحث بھی کی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔راقمہ کو اس میں تاریخی عناصر اور انفرادیت نظر آئی اس لئے اسے شامل مقالہ کیا گیا ہے۔اور تنقید میں مقدمہ نگاری کو اولیت حاصل ہے۔اس لئے اسی کتاب میں مقدمہ نگاری کی تاریخ کو نمایاں کیا ہے۔

۱۵۔ اُردو میں نعت گوئی (ڈاکٹر ریاض مجید)

اُردو ادب میں عام طور پر نعت گوئی کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس کی ابتداء عہد سرسید میں ہوئی۔

حالانکہ یہ خیال مبنی پر حقیقت نہیں ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے اپنی کتاب ''اُردو میں نعت گوئی'' میں نعتیہ شاعری کے اولین نمونے اُردو ادب کے دکنی دور میں تلاش کر کے انہیں ثبوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی کتاب میں نعتیہ شاعری کے حوالے سے جنوبی ہند اور شمالی ہند کے لئے الگ الگ باب مختص کئے گئے ہیں۔ ابواب بندی ملاحظہ ہو:

باب اوّل	تمہیدی مباحث
باب دوم	محرکات و ماخذات
باب سوم	اُردوئے قدیم کے نعتیہ نمونے اور جنوبی ہند میں اُردو نعت گوئی کا جائزہ
باب چہارم	شمالی ہند میں اُردو نعت گوئی کا جائزہ
باب پنجم	عصرِ جدید کی نعت گوئی
باب ششم	عصرِ حاضر کی نعت گوئی

کتاب مذکورہ میں تمہیدی مباحث اور محرکات و ماخذِ میں مصنف نے نعت گوئی کی صنف کی اہمیت اور اس کے ماخذ کے حوالے سے مفصل بحث کی ہے۔ نعت گوئی کی اہمیت اور اُردو ادب میں اس کے آنے کے اسباب کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی ادب میں اُردو میں نعت گوئی کا پس منظر دکھایا گیا ہے۔ اُردو شاعری کا دور اولین دکن سے شروع ہوا۔ مصنف نے تیسرے باب میں دکنی ادب کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے تفصیل مہیا کی ہے۔ انہوں نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے شاہی خاندان اور شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے دیگر اہم ناموں کی شاعری کے نعتیہ حوالے پیش کئے ہیں۔ اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ سے لے کر ولی دکنی تک تقریباً تمام اہم شعراء کسی نہ کسی حوالے سے نعتیہ اشعار پیش کرتے رہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ''گیارہویں صدی ہجری کے آغاز کے قریب جب بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد قطب شاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا تو اُردو ادب کے ایک انتہائی گراں قدر و قیع اور تاریخی دور کا آغاز ہوا۔ قطب شاہی سلطنت قریب قریب دوسو سال (۹۱۶ھ تا ۱۰۹۸ھ) تک قائم رہی۔ اس سلطنت کے بادشاہوں کی ایک مشترک خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہ صرف آپ تعلیم یافتہ تھے بلکہ علم و ادب کے فروغ سے بھی انتہائی دلچسپی رکھتے تھے اور شعر و سخن کی قدر دانی کے علاوہ خود بھی شعر گوئی کا عہدہ زوق رکھتے تھے۔ یہ دور جس قدر اُردو شاعری کے لئے ساز گار ثابت ہوا اسی قدر نعت گوئی کے لئے بھی مبارک رہا۔'' (۶۵)

فاضل مصنف نے جس طرح قطب شاہی دور کے سلاطین اور شعراء کی نعت گوئی کا ذکر کیا ہے اسی طرح آگے چل کر تمام شعراء کی نعتیہ شاعری کو انفرادی طور پر بھی بیان کیا ہے۔ قلی قطب شاہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''محمد قلی قطب شاہ اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔انہوں نے زندگی کو وسیع تناظر میں دیکھا اور کم وبیش سبھی مروجہ اصناف شاعری میں اپنی محسوسات ومشاہدات کا اظہار کیا۔موضوعات کے تنوع اور مضامین کی رنگارنگی کے اعتبار سے انہیں نظیرا کبرآبادی کا پیشرو کہا جا سکتا ہے۔ان کی شاعری میں مذہبی موضوعات پر بھی متعدد نظمیں ملتی ہیں۔اُردو نعت کے اولین اسم بکثرت اور قابل ذکر نمونے انہیں کے کلیات میں نظر آتے ہیں۔'' (۶۶)

مصنف نے جنوبی ہند کے شعراء میں قلی قطب شاہ، ابراہیم عادل شاہ، ولی دکنی اور معاصرین ولی کی نعتیہ شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں۔جبکہ شمالی ہند میں میرؔ وسوداؔ، مصحفیؔ، مومنؔ، امیر مینائیؔ اور محسن کاکورویؔ کی نعت گوئی کو بطور خاص موضوع بنایا ہے جو لائق تحسین ہے۔

کتاب کے آخری دو ابواب عصرِ جدید اور عصرِ حاضر کی نعت گوئی کو پیش کرتے ہیں۔عصرِ جدید سے مصنف نے عہد سرسید سے لیکر تقسیم ہند تک کے نامور شعراء جبکہ عصرِ حاضر سے قیام پاکستان کے بعد سے دورِ موجود تک کے نعت گوشعراء کے حالات زندگی اور ان کی نعتیہ شاعری کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔

۱۶۔ فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں (ڈاکٹر عفت زریں)

ڈاکٹر عفت زریں کی کتاب ''فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں'' مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۹۲ء کو شائع ہوئی کتاب کے نام سے تو یوں ظاہر ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اہتمام جتنی بھی نثری داستانیں منظر عام پر آئیں وہ سب اس کتاب کا موضوع ہوں گی لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔مصنفہ نے صرف چار شہرہ آفاق نثری قصوں کی تاریخ اور ان میں تہذیبی عناصر کو پیش کیا ہے۔وہ چار نثری تصانیف بالترتیب آرائش محفل، باغ وبہار، بتیال پچیسی اور قصہ گل بکاؤلی ہیں۔مصنفہ نے اپنے اظہار کے دوران کہیں کہیں اپنے اشعار بھی پیش کئے ہیں جو موقع محل کے مطابق بھلے معلوم ہوتے ہیں۔مثلاً آغاز میں داستان میں تاریخ اور تہذیب تلاش کرنے کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''داستان دل بھی ہے، تہذیب کی تاریخ بھی
وقت کے قصے ہیں جو دہرائے جاتے ہیں یہاں'' (۶۷)

کتاب مذکورہ مصنفہ کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے جو انہوں نے دہلی یونیورسٹی دہلی سے پی۔ایچ۔ڈی کے لئے تحقیق کیا ہے۔اس بات کا ذکر کرتے ہوئے صرف آغاز میں لکھتی ہیں:

''دس سال پیش تر جب راقمہ نے اپنے تحقیقی مقالے کے لئے ''فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانوں کا تہذیبی مطالعہ'' بطور عنوان چنا اور ''شعبہء اُردو دہلی یونیورسٹی دہلی'' نے اس کی منظوری عطا کی

تو موضوع کی ندرت پر جہاں ایک گونہ مسرت ہوئی وہاں میں سلسلہ تحقیق وتنقید کی دشواریوں کا احساس بھی مسلسل میرے ذہن کو گھیرے رہا۔'' (۶۸)

ڈاکٹر شریف احمد نے کتاب پر مفصل پیش لفظ تحریر کیا ہے جو مصنفہ کی دلجوئی اور عظیم کارنامے کے حوالے سے اظہار تحسین ہے۔ لکھتے ہیں:

''مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر عفت زریں نے اپنے ذوق وشوق اپنی محنت، کاوش اور اپنی لگن اور لگاؤ سے اس کا مطالعہ بھی کیا اور اس سلسلہ کو جاری بھی رکھا اور ایک منزل تک اسے پہنچانے کی کوشش بھی کی اس میں ان کے ریسرچ گائیڈ اور عزیز ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے رہنمایانہ کردار کو کھیے کے دخل رہا رہا ہے۔ ایک اچھا طالب علم بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق اپنے استاد کو بھی محنت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں سوچتا ہوں اور صحیح سوچتا ہوں کہ اُردو ادب میں اس کی ادبیات کی مزاج شناسی اس طرح کے افکار اور قدروں کے احساسات، تعارف اور تجزیئے کے ذریعے ہی ممکن ہے۔'' (۶۹)

مصنفہ نے کتاب مذکورہ تحقیق کرنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے صرف چار داستانوں کا انتخاب کرنے کا مقصد اس عہد کے تہذیبی ماحول اور مشرقی روایات کو بروئے کار لانا بتایا ہے۔ اپنا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''فورٹ ولیم کالج کی داستانوں کا مطالعہ دراصل ان مشرقی روایات اور وسطی عہد کے اس تہذیبی ماحول کا مطالعہ ہے جو اس وقت تک اپنے پورے آب ورنگ کے ساتھ موجود تھا۔ ان داستانوں کے ترجمہ کرنے والے یا اس کے تالیف کرنے والے ہندوستانی مقاموں سے تعلق رکھتے تھے وہ اپنے ساتھ ایک رہنما کی حیثیت سے کام کرنے والے رنگوں کے نقطہ نظر سے واقف ہیں۔ یہ تو ممکن ہے لیکن انکا فکر وخیال مفسرین کے اندازِ نظر اور طریقہ رسائی کے سانچے میں ڈھل گیا ہو اس کا امکان بہت کم ہے۔'' (۷۰)

کتاب میں شامل داستانیں آرائشِ محفل اور باغ و بہار بالترتیب حیدر بخش حیدری اور میر امن کی تالیف کردہ ہیں۔ مصنفہ نے ان کہانیوں کے ماخذات پسِ منظر اور تراجم کے حوالے سے تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ قصہ گل بکاؤلی اور بتیال پچیسی بھی مختلف زمانوں سے گذر کر اُردو میں ترجمہ ہوئیں۔

ان چار داستانوں کا خلاصہ پسِ منظر، مصنفین کے حالاتِ زندگی کہانیوں کا عہد اور فورٹ ولیم کے پلیٹ فارم کے حوالے سے بہت سی مفید معلومات دی گئی ہیں۔ ہر داستان کے آغاز سے انجام تک قاری کی سہولت اور معلومات کے پیش نظر مکمل تاریخ رقم کر دی گئی ہے۔ ذیل میں ہر داستان کا ایک ایک اقتباس مندرج ذیل کیا جاتا ہے۔ جس سے کہانی کا انداز اور مصنفہ کی کاوش کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ آرائش محفل جسے قصہ حاتم طائی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے پر اظہار رائے دیکھئے:

''قصہ حاتم طائی یوں تو کہنے کو سات سوالوں کی داستان ہے۔ اگر چہ ایک سوال کی داستان میں کئی کئی

داستانیں شامل ہوگئی ہیں۔اوراس میں سے ہرایک میں ہماری سماجی روایتوں اورتہذیبی قدروں کا حسن بکھرا ہوا ہے ان سے ہم اپنی ماضی کی صدیوں سے چلی آ رہی مختلف روایتوں اور گوناں گوسلسلوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔'' (۷۱)

مذکورہ اقتباس میں ایک تو آرائش محفل کی تاریخ اوراس میں شامل تہذیبی عناصر کو بیان کیا گیا ہے دوسرے اس کے سلسلہ درسلسلہ دھنک کے رنگوں کو بھی بتادیا گیا ہے۔یعنی مصنفہ نے ہرداستان کی اہمیت اورافادیت پرسیر حاصل گفتگو کی ہے۔ قصے کہ خلاصے کہ ساتھ ساتھ اس میں موجود مثبت پہلوؤں پر بات کی ہے جو تاریخ اور تنقید کی آمیزش سے تحقیقی نسخہ مصنفہ نے تیار کیا ہے اسے ادبی تاریخ میں مدتوں یادرکھا جائے گا۔

آرائشِ محفل کہ بعد باغ و بہار کی بات کی جائے تو اس کے مصنفہ نے زیادہ صفحات مختص کئے ہیں کیونکہ فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانوں میں جوشہرت باغ و بہار کو ملی وہ کسی اورداستان کے حصے میں نہیں آئی۔ باغ و بہار کی وجہ سے میرامن کو جوشہرت ملی وہ کسی اور مصنف کو بھی اس کتاب پر نہیں مل سکی۔اگرچہ باغ و بہار کا قصہ میرامن سے صدیوں پہلے کا ہے لیکن میر امن کا خاص اسلوب اس سے پہلے اور بعد میں آنے والے تمام چہاردرویشوں سے دلکش ہے۔مصنفہ لکھتی ہیں:

''باغ و بہار جس کے نام سے میرامن مشہور ہوئے اورآج میرامن کا نام اس کے نام کے ساتھ جیسے ہمیشہ کے لئے جوڑ دیا گیا ہے ورنہ یہ قصہ میرامن سے پہلے بھی مشہور رہا ہے اور میرامن کے بعد اس کے کئی نسخے سامنے آئے ہیں۔ یہ کہانی عہد محمد شاہی میں سب سے پہلے مرتب ہوئی تھی جب کہ یہ میر امن کا بیان ہے کہ یہ حضرت امیر خسرو نے حضرت محبوب الٰہی کو اس وقت سنائی تھی جب وہ بیمار تھے اور حضرت نے صحت مند ہونے پر دعا فرمائی تھی کہ جو اس کہانی کو سنے گا صحت یاب ہوگا یہ اچھی کہانی کہ ساتھ اس طرح کہ واقعات جڑے رہتے ہیں اور زمانہ بہ زمانہ اس میں شاخ گل کی طرح نئے پھول کھلتے اور اپنی بہار دکھلاتے رہتے ہیں۔''(۷۲)

مصنفہ نے باغ و بہار کے مآخذ اوران تمام کہانیوں کا حوالہ بھی دیا ہے جو قصہ چہار درویش پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ قصے کا خلاصہ اس کی اہمیت اورفورٹ ولیم کالج میں اس کی شہرت کے حوالے سے بھی لکھا گیا ہے۔''فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں'' کی میری داستان بتیال پچیسی ہے جس کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں:

''بتیال پچیسی فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی ایک طلسمی کہانی ہے اور بنیادی طور پر ہندو میتھلو جی سے ماخوذ ہے۔ ہندوستان میں علم وحکمت کی بہت سی باتیں جانوروں، دیوؤں، اوراسیراؤں سے لی گئی ہیں اوران کی زبانی کہلا دی گئی ہیں۔ بتیال ایک بھوت ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ بھوت ماضی کو بھی کہتے ہیں۔ ہماری تمام یادداشتیں اسی بھوت کے حصے میں آتی ہیں جو آخر شجرِ حیات سے جا کر لٹک جاتا ہے۔'' (۷۳)

کتاب ہٰذا کی چوتھی کہانی ''قصہ گل بکاؤلی'' ہے اس کے بارے میں عام خیال کیا جاتا ہے کہ اسے سب سے پہلے عزت اللہ بنگالی نے فارسی میں رقم کیا تھا جسے بعد میں فورٹ ولیم کالج کے پلیٹ فارم سے نہال چند لاہوری نے ''مذہب عشق'' کے نام سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ گارساں دتاسی میں اس قصے کو قدیم دکنی قصہ کہتے ہیں۔ عزت اللہ بنگالی سے بھی پہلے کا قرار دیا ہے۔ بہر حال یہ قصہ مختلف صورتوں میں ہندوستانیوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ نامور مثنوی نگار دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارِ نسیم'' بھی قصہ گل بکاؤلی ہے جس کا ماخذ نہال چند لاہوری کی مذہب عشق کو کیا جاتا ہے۔ مصنفہ قصہ گل بکاؤلی کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''اور یہ داستان (قصہ گل بکاؤلی) خدا کے فضل و کرم سے سب کو بامراد اور خانہ آباد کرنے کے بعد اختتام کو پہنچی اور آدمی اور پری کے درمیان رشتہ سے آدمی کی عظمت کو پایہ ثبوت تک پہنچایا اور پریوں کی نظر میں حقیر نہ رہنے دیا۔ تہذیب اور معاشرے کی ترجمانی کے ساتھ داستان کو اس انداز سے مختلف مراحل سے گزارا گیا کہ اسکی دلچسپی کسی مرحلے میں کم نہیں ہونے پائی اور داستانی معاشرے کی تصویر آنکھوں میں بھر گئی اور یہ بات ہے کہ اس میں بہت سی کمیاں ہیں۔ اس داستان کا انجام بتاتا ہے کہ داستان نگار روائیتی طور پر اس کا قائل ہے کہ داستان کو المیہ نہیں طربیہ پر ختم ہونا چاہئے۔'' (۷۴)

مصنفہ نے اس کتاب میں چار نثری داستانوں کے پس منظر اور ان کا آغاز و ارتقاء بڑی کامیابی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان چار مصنفین کا بھی تعارف اور ضمن پیش کیا ہے۔ جنہوں نے یہ داستانیں ترجمہ کیں ان کے نام بالترتیب حیدر بخش حیدری، میرامّن، نہال چند لاہوری اور للولال کا توی ہیں یہ چار شخصیات فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں سرفہرست ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مصنفہ نے اس کتاب کی تحقیق میں جو محنت اور لگن کا ثبوت دیا ہے وہ لائق تحسین اور مبارک باد کی حق دار ہے۔

۱۷۔ اُردو واسوخت (شمیم صہبائی متھراوی)

واسوخت اصناف شعر کی ایک قسم ہے جس میں محبوب کی بے وفائی سنگ دلی اور اس کے ظلم و ستم کا ذکر کر کے اسے برا بھلا کہا جاتا ہے تلخ لہجے میں اسے جلی کٹی سنائی جاتی ہیں اور دھمکی دی جاتی ہے کہ وہ اپنے رویے میں تبدیلی لائے۔ واسوخت کی ابتداء فارسی میں ہوئی اور وحشی یزدی کو اس کا موجد بتایا جاتا ہے وحشی کے بارے میں مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ''وحشی یزدی مشہور شاعر ہے۔ عرفی وغیرہ کا معاصر ہے چونکہ وحشی تمام عمر شاہدان بازاری کے عشق میں گرفتار رہا اس لئے اس کو ہوس پرستی کی وارداتیں بہت پیش آئیں اور اس نے وہ سب ادا

کردیں۔ واسوخت بھی اس کی ایجاد ہے اور اسی پر اس کا خاتمہ بھی ہو گیا۔'' (۷۵)

''اُردو واسوخت'' شمیم صبائی متھراوی کی کتاب ہے جسے سیماب اکادمی پاکستان کراچی نے مارچ ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔ کتاب کی وجہ اشاعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جب پاکستان کی عمر ۱۳ یا ۱۴ سال تھی۔ میں مشفق خواجہ صاحب کے پاس سے اٹھ کر سید سرفراز علی رضوی مہتم کتاب خانہ خاص انجمن ترقی اُردو پاکستان کے پاس پہنچا اور ابھی دریافت ہی کر رہا تھا کہ اُردو واسوخت پر کوئی کتاب مل سکتی ہے کہ پیچھے سے آواز آئی شمیم صاحب آپ کو واسوخت پر کچھ نہ ملے گا۔ آپ خود کوئی کتاب کیوں نہیں لکھ لیتے یہ آواز تھی حضرت افسر صدیقی امروہوی کی۔۔۔۔۔ میں افسر صاحب کے پاس پہنچا اور طے پایا کہ ان کی رہ نمائی میں ہر دن تین گھنٹے مجھے واسوخت پر کام کرنے کے لئے نکالنے ہوں گے۔ یوں تین سال کی مدت یعنی ۱۹۶۳ء میں یہ کتاب تیار ہو چکی تھی مگر جس کی اشاعت اب تیس سال کے بعد اللہ کے حکم اور سیماب اکادمی کے تعاون سے ممکن ہو سکی ہے۔'' (۷۶)

کتاب مذکورہ کا دیباچہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے پیش لفظ کے عنوان سے لکھا ہے جس میں انہوں نے کتاب اور مصنف کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ ''حال ہی میں شمیم صاحب نے ''اُردو واسوخت'' کے نام سے زیرِ نظر کتاب لکھی ہے جس میں ۱۷۶ واسوخت گو شعراء کے حالات اور ان کی واسوختوں کو تنقیدی نقطہء نظر سے زمانی تربیت کے ساتھ موضوع بحث بنایا ہے آپ واسوخت گو شعراء تذہ کہہ سکتے ہیں اگر زمانی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس عہد کے دوسرے تمام واسوخت نگار شعراء کا اندازہ حسبِ ذیل نقشہ سے ہو سکتا ہے۔

	پیدائش	وفات
آبرو	۱۱۰۱ھ	۱۱۴۶ھ
حاتم	۱۱۱۱ھ	۱۱۹۷ھ
سودا	۱۱۱۵ھ	۱۱۹۵ھ
تاباں	۱۱۳۵ھ	۱۱۶۵ھ
میر	۱۱۳۵ھ	۱۱۲۱ھ (۷۷)

کتاب کے نام سے تو ظاہر ہوتا ہے ''اُردو واسوخت'' کے معانی و مفاہیم اور آغاز و ارتقاء کے حوالے سے لکھی گئی ہوگی لیکن ایسا نہیں ہے۔ مصنف شمیم صہبائی متھروی نے اس کتاب میں ۷۶ کلاسیکی شعراء کے اُردو واسوخت کے چند نمونے ترتیب دے کر اسے زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ اس طرح سے یہ ایک حوالے سے ان شعراء کا تذکرہ ہے۔ لیکن کلام صرف واسوخت تک ہی محدود ہے۔ جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے پیش لفظ اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مقدمہ

لکھا ہے۔ دو مستند اساتذہ اور محققین کی حوصلہ افزائی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کتاب مذکورہ ایک مستند حیثیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''اُردو کا پہلا واسوخت نگار کون ہے؟ اُردو کے ممتاز واسوخت نگار کون کون سے ہیں؟ ان کی خصوصیات کیا ہیں۔ واسوخت نے کسی خاص عہد میں اور کیوں کر ترقی پائی ہے۔ اُردو شاعری میں اس قدیم صنف سخن کی کیا اہمیت ہے؟ ان کا شافی جواب شمیم صہبائی متھراوئی صاحب نے اپنی کتاب میں دے دیا ہے۔ اس لئے دھرانے کی ضرورت نہیں۔'' (۷۸)

کتاب مذکورہ کا اگر باغور جائزہ لیا جائے تو اس میں تاریخ کے ساتھ ساتھ تشریح کا عنصر بھی نمایاں ہے یعنی کسی استاد کے کلام واسوخت کو پیش کیا ہے۔ تو اس کی تشریح بھی دی گئی ہے۔ جن مشہور اساتذہ کا کلام پیش کیا گیا ہے ان میں شاہ مبارک آبرو، عبدالحیٔ تاباں، شاہ حاتم، مرزا رفیع سودا، میر تقی میر، میر حسن، قائم چاند پوری، قلندر بخش جرأت، نذیر اکبر آبادی، خواجہ حیدر علی آتش، مومن خان مومن، شوق نیموی، امیر صبائی، صغیر بلگرامی، قربان علی بیگ، سالک اور سجاد لکھنوی شامل ہیں۔ فاضل مصنف نے کلام شاعر اور اس کی تشریح کے ساتھ شاعر کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔ آبرو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آبرو کا واسوخت جسے اُردو کا سب سے پہلا واسوخت ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ۱۱۴۴ھ یا اس سے قبل کسی سال میں تصنیف کیا گیا۔ اس میں کل آٹھ بند ہیں کیونکہ اس وقت تک مسدس ایجاد نہیں ہوا تھا لہٰذا عام رائج الوقت قائدہ کے تحت ترکیب بند (مثمن) کے ذریعے واسوخت کے مضامین نظم کئے جاتے تھے۔ آبرو نے بھی یہی راہ اختیار کی۔'' (۷۹)

کتاب مذکورہ کے پہلے تین باب میں تو تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے اور مقدمہ کے فن اسی طرح مصور نے امیر مینائی، مومن خان مومن اور خواجہ حیدر علی آتش کے کلام اور سال تحقیق کے ساتھ ساتھ ان کا اپنا تعارف بھی پیش کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو اس لئے موضوع مقالہ بنایا ہے کہ اس میں تاریخ کے تمام اصول پیش کئے ہیں۔ اس لئے کتاب مذکورہ صنف وار تاریخ نگاری میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔

۱۸۔ اُردو ڈراما (تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ) (پروفیسر سید وقار عظیم)

اُردو ڈراما پروفیسر سید وقار عظیم کی فن ڈراما کی تاریخ پر مستند اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ کتاب کو دو ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا باب ''اُردو ڈرامہ'' فن اور منزلیں ہے جس میں چودہ ذیلی عنوانات ہیں جب کہ دوسرا باب ''چند قدیم ڈرامے'' تعارف اور تجزیہ کے زیرِ عنوان ہے اس میں پندرہ مختلف قدیم ڈراموں کا تعارف اور تجزیہ کر کے ڈرامہ نگاری کی

جزوی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ پہلا باب ڈراما کی ارتقائی مناظر کو پیش کرتا ہے۔ جب کہ دوسرا باب پندرہ قدیم اہم ڈراموں کے تعارف اور فن پر مبنی ہے۔ ڈراما اُردو ادب کی مشکل صنف ہے۔ اس میدان میں چند نامور اور قابل ڈراما نگار آتے ہیں جنھوں نے ڈرامے کی صنف کو سہارا دیا۔ ڈراما اور اس کے فن پر رائے دیتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

''ڈرامے اور اس کے مقابلے میں کہانی کی دوسری قسموں میں سب سے بڑا اور حقیقت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ڈراما کے علاوہ کہانی پر صنف کی تصنیف وتخلیق پڑھنے کے لئے ہوتی ہے اور ڈرامے کے دکھانے (یا عملی صورت میں پیش) کرنے کے لئے اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ڈرامے کہ علاوہ کہانی کی ہر صنف کا تخاطب قاری ہے اور ڈرامے کا ناظر یا سامع سے اور طرزِ تخاطب انداز پیش کش کا یہی فرق ہے جس کی بنا پر مختلف اصناف افسانہ کو فنی اعتبار سے بھی بعض امتیازی خصوصیات حاصل ہوتی ہیں۔'' (۸۰)

مصنف نے پہلے باب میں ڈراما نویسی کہ فن کا تجزیہ کرتے ہوئے یک بابی ڈراما اور اندر سبھا ئی فنی ادبی حیثیت بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ ڈراما انارکلی پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یک بابی ڈرامے پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مختصر افسانے کی فنی تعریف کرتے ہوئے عموماً یہ بات بڑی تاکید کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ مختصر افسانہ ناول کی مختصر شکل ہرگز نہیں۔ مختصر افسانہ ناول سے بالکل مختلف کہانی کی ایک صنف اور قسم ہے اور اپنے تاثر اور فنی خصوصیات کہ اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے بالکل اسی طرح کی احتیاط اور تاکید کی بابی ڈراما کے تعارف سے پہلے ضروری ہے۔ یک بابی ڈرامہ بڑے ڈرامے کی مختصر شکل ہرگز نہیں۔ اس کا فنی مقصد اور منصب بڑے ڈرامے کے مقصد اور منصب سے بالکل مختلف ہے اور اس کے لئے اس کی فنی خصوصیات بڑے ڈرامے کی فنی خصوصیات سے بالکل الگ ہیں۔ انہی خصوصیات کی بناء پر اس کی ایک واضح اور امتیازی فنی حیثیت ہے۔'' (۸۱)

پہلے باب میں مصنف نے ''ڈراما اندر سبھا'' کی تلخیص کے ساتھ ساتھ اس کے موضوع، فن، ادبی حیثیت اور ڈرامے سے متعلق مختلف جھوٹی روایت اور غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کر دیا ہے۔ اس حوالہ سے ایک اقتباس دیکھئے:

''اندر سبھا کا مطالعہ کرنے والا بالکل شروع ہی میں یہ بات آسانی سے محسوس کر لیتا ہے کہ امانت میں دلچسپی، تفریح اور نشاط طبع کا واحد وسیلہ موسیقی کو بنایا ہے اور یہ بات کتاب کا مطالعہ ختم کرتے کرتے پڑھنے والے کے ذہن پر ایک گہرے نقش کی طرح مثبت ہوجاتی ہے کہ اندر سبھا کا بنیادی تصور موسیقی ہے اس کے علاوہ جو کچھ ملتا ہے اس کی حیثیت ضمنی اور ثانوی ہے اندر سبھا کا آغاز سات شعروں کی ایک غزل سے ہوتا ہے۔'' (۸۲)

چونکہ ڈراما نگاری کے آغاز میں ڈراما نگار ایسی نثر لکھتے تھے جو منظوم ہوتی تھی وہ خود بھی شاعر ہوتے تھے امانت کی

اندرسبھا کا آغاز بھی غزل سے ہوتا ہے اس کے کچھ اشعار دیکھئے:

''سبھا میں دوستوں، اندر کی آمد آمد ہے
پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے
دوزانو بیٹھو قرینے کے ساتھ محفل میں
پری کے دیو کے لشکر کی آمد آمد ہے
زمین پہ آئیں گی راجہ کے ساتھ سب پریاں
ستاروں کے مہہ انور کی آمد آمد ہے
غضب کا گانا ہے اور ناچ ہے قیامت کا
بہار فتنہ محشر کی آمد آمد ہے۔'' (۸۳)

اندرسبھا کی ادبی حیثیت اور شہرت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اس ڈراما کی اشاعت اور عملی صورت تکمیل کے مراحل سے گذر چکی تو اودھ، لکھنؤ، دہلی، بمبئی اور دکن تک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ڈراما نویس کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت بہت زوروں پر تھا۔ مصنف نے ڈرامہ نویس کے فن کے ساتھ ساتھ اندرسبھا کی ادبی حیثیت بھی واضح کر دی ہے۔

کتاب کا دوسرا باب بھی اپنی انفرادیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ ڈرامہ نگاری کی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے مصنف نے چند قدیم ڈراموں کا انتخاب کر کے ان کی اہمیت اور خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنف نے جن ڈراموں کا انتخاب کیا ہے ڈراما نویسی کی تاریخ میں وہ سنہری حروف سے لکھے جاتے ہیں۔ ان ڈراموں کی ترتیب وار فہرست یوں ہے:

۱۔ اُردو کا پہلا نثری ڈراما۔ خورشید
۲۔ کریم الدین مراد اور ان کے ڈرامے
۳۔ ایک منفرد ڈراما ۔ گلستانِ خاندانِ ہامان
۴۔ ڈرامائی ادب میں ایک تجزیہء ۔ چترا بکاؤلی
۵۔ غنائیہ اور نثری ڈرامے کی درمیانی کڑی ۔ وادیء دریا
۶۔ ایک قدیم ڈراما۔ فتنہ و نحانم
۷۔ جدت پسندی کی مثال ۔ دورنگی دنیا
۸۔ حافظ عبداللہ اور ان کے ڈرامے
۹۔ ایک مقبول ڈرامہ ۔ لیلیٰ مجنوں

۱۰۔ ایک تمثیلی ناٹک ۔ شکنتلا

۱۱۔ ایک منظوم معاشرتی ڈراما ۔ نگاہِ غفلت

۱۲۔ زندگی سے قریب ایک ڈراما ۔ دلیر دل شیر

۱۳۔ ایک دلچسپ سٹیج ڈرامہ ۔ راجہ گوپی چند

۱۴۔ ایک پرکشش ڈراما۔ گلِ روزینہ

۱۵۔ ایک مقبول تمثیلیہ ۔ فسانہ عجائب (۸۴)

فاضل مصنف نے ہر ڈرامہ کا ایک ایک خوبصورت عنوان دیا ہے جو ڈراموں کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

۱۹۔ اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف اُردو کی منظوم داستانیں، ان کے تحقیقی خدمات کا واضح ثبوت ہے۔اس کے علاوہ ان کی کئی کتب اُردو ادب میں اپنے گہرے نقوش مرتب کر چکی ہیں۔اُردو کی بہترین مثنویاں، اقبال سب کے لئے، ہندی اُردو تنازع اور غالب شناسی کے حوالے سے ان کا کام بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ان کی ادبی خدمات کو ادبی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔اس کے علاوہ ماہنامہ ''نگار'' کو علامہ نیاز فتح پوری کے بعد جس آب و تاب سے آگے بڑھایا وہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادبی خدمات اپنی جگہ لیکن انہوں نے جامعہ کراچی سے جس مقالہ پر ڈی۔لٹ کی ڈگری حاصل کی وہ سب سے اہم ہے اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ان کا ڈی۔لٹ کا مقالہ ہے جسے پہلی بار مجلس ترقی ادب لاہور سے ہے۔۱۹۷۲ء میں شائع کیا گیا (۸۵) اور ۱۹۹۸ء میں انجمن ترقی اُردو کراچی کے زیرِ اہتمام شائع کیا گیا۔ جمیل الدین عالی کی کتاب کی دوسری اشاعت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''انجمن اس کتاب کو چھاپنے پر مجبور بھی ہے اور بہت خوش بھی۔مجبور اس لئے کہ چاروں طرف سے مانگ ہے۔خوش اس لئے کہ یہ بابائے اُردو کی روایت میں ایک توسیع ہے۔لہذا اس لئے بھی کہ خود بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری اسی کام کے معاون کتب خانوں میں اول معاون ''انجمن'' کا کتب خانہ ہی رہا ہے۔'' (۸۶)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی کتاب کی اشاعت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ کتاب پہلی بار ملک کے ممتاز علمی و ادبی ادارے ''مجلس ترقی ادب'' لاہور سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔۔۔۔۔۔۔کتاب کی اس غیر معمولی پذیرائی مقبولیت اور بلند پایہء تحقیقی معیار کے باعث کراچی یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے اس پر مجھے ڈی۔لٹ کی ڈگری دی اور پاکستان رائٹر گلڈ نے داؤد ادبی انعام کا مستحق قرار دیا۔ میں شکر گزار ہوں انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی اور اس کے معزز ارکان کا جن کی توجہ سے یہ کتاب دوبارہ شائع ہو رہی ہے۔اس جگہ یہ بات بھی قابل ذکر اور میرے لئے فخر باعثِ مسرت ہے کہ میرا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ''اُردو کی منظوم داستانیں'' بھی پہلی بار انجمن ہی نے چھاپا تھا اور اب اسے بھی انجمن دوبارہ شائع کر رہی ہے۔'' (۸۷)

''اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ایک تو اُردو تذکروں کی مسلسل تاریخ مرتب کر دی ہے۔ دوسرے یہ کہ تذکرہ نگاری کا آغاز فارسی تذکروں کے زیر سایہ ہوا اس لئے فارسی تذکرہ نویسی کی تاریخ کا بھی سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔بحیثیت طویل دیکھا جائے تو اس کتاب میں فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھے گئے تذکروں کی مکمل تعریف سمائی ہوئی ہے۔فارسی تذکرہ نگاری کہ حوالے سے لکھتے ہیں:

''فارسی تذکرہ نگاری کا آغاز دخلِ اسلام سے بھی کئی سو سال بعد چھٹی صدی ہجری سے ہوتا ہے۔ صاحب راحت الصدور آیۃ السرور کے بیان کے مطابق چھٹی صدی ہجری کے وسط میں طغرل بن ارسلان کی خواہش پر معروف شعراء کے منتخب اشعار جمع کرنے اور شعراء کی تصویروں کے ساتھ ایک مصور تذکرہ ترتیب دینے کا کام شروع ہو تھا لیکن افسوس کہ اس تذکرے کے باوجود اس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔اس لئے فارسی کے قدیم ترین دستیاب تذکرے کی حیثیت سے جس تذکرے کا کام لیا جا سکتا ہے وہ نورالدین محمد عوفی کا لب الالباب ہے جو سرزمین پاک ہی میں بعید ناصرالدین قباچہ والی اوچ لکھا گیا ہے۔'' (۸۸)

تذکرہ نگاری دراصل تاریخ گوئی کا دوسرا نام ہے۔کیونکہ اس میں شعراء کے شب و روز کلام کو یکجا کرتے وقت تذکرہ نویسی تاریخ کو مدنظر رکھتا ہے۔مؤرخین اور اساتذہ فن تذکرہ نگاری کو تاریخ نگاری سے الگ چیز نہیں سمجھتے کیونکہ تذکرہ نویسی میں تاریخ وعہد کے احساس و اظہار کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔مصنف لکھتے ہیں:

''تذکروں کے ذریعے اکثر شعراء کا سالِ وفات، تاریخِ پیدائش، سکونت، ولدیت، شاگردی، استادی مزاج، پسندیدہ مصنف، اندازِ سخن گوئی، طرز ادا اور اس کا شاعرانہ مرتبہ کم و بیش ہمارے سامنے آجاتا ہے۔''تمیم سخن'' اور ''آبِ حیات'' میں تذکرہ نگاری براہِ راست تاریخ کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ان میں ہمیں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو قدیم ادبی تاریخ سے توقع کی جا سکتی ہے۔'' (۸۹)

تذکرہ نویسی میں شرائط کے حالات کے ساتھ ساتھ تحاریک، روایات، محافل، رسم ورواج، اخلاقی قدریں، ماحول، بادشاہوں کے طرز رہن سہن اور دیگر سماجی حالات بھی مل جاتے ہیں جو ہماری ادبی اور سیاسی تاریخ کے عکاسی ہیں۔ فاضل مصنف نے تذکرہ نگاری کے فنی مباحث میں مندرجہ بالا تمام عوامل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔تذکرہ نویسی میں تنقید، تاریخ، سوانح، تہذیبی پہلوؤں اورادبی فضاء یکجاءنظرآتے ہیں۔ بحث کوسمیٹتے ہوئے مصنف کہتے ہیں:

> ''تنقیداورسوانح نگاری یاشخصیت کی عکاسی کے سلسلے میں جوکچھ لکھا گیاہےوہ بطورنمونہ یامثال ہے۔ اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ جن تذکروں کے مندرجات کے حوالے دیئے گئے ہیں صرف وہی کارآمد ہیں۔ایسانہیں ہے۔ہر تذکرے سےاس کےاپنے عہد کی شاعرانہ فضاءابھرتی ہےاورادبی ذوق کی نمائش ہوتی ہے۔ہم نے تذکروں کے سوانحی، تنقیدی اورتہذیبی پہلوؤں پراوپرمفصل گفتگو یوں نہیں کی کہ اگلے صفحات میں ہر تذکرے کی بحث میں الگ الگ ان پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اُردو شعراء کے تذکرے ہماری تاریخ ادبیات کا ایک بیش قیمت حصہ ہیں۔ انہیں نظرانداز کرکے نہ تو ہم اُردو زبان وادب کی ارتقائی منزلوں کا سراغ لگا سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے ماضی وحال اور مستقبل میں کوئی رشتہ قائم کرسکتے ہیں۔'' (۹۰)

''اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' تذکرہ کی صنف، ہیت، تاریخ اور تقاضوں کے علاوہ ارسٹھ تذکروں کا تحقیقی اورتنقیدی جائزہ تاریخی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔اُردو کے اولین تذکرے نکات اشعراء سے لیکر آبِ حیات تک کی اُردو تذکرہ نگاری کو دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔مصنف نے جن تذکروں کو اپنی تصنیف کا موضوع بنایا ہے ان کی تاریخی ترتیب یوں ہے۔

نمبرشمار	عنوان تذکرہ	تذکرہ نگار	سال اشاعت
۱۔	نکات اشعراء	میرتقی میر	۱۷۵۲ء
۲۔	گلشن گفتار	حمیداورنگ آبادی	۱۷۵۲ء
۳۔	تحفتہ الشعراء	فضل بیگ	۱۷۵۲ء
۴۔	تذکرہ ریختہ گویان	فتح علی حسینی	۱۷۵۲ء
۵۔	مخزن نکات	قیام الدین قائم	۱۷۵۴ء
۶۔	ریاض حسنی	عنایت اللہ فتوت	۱۲۵۴ء (۹۱)

مصنف نے مندرجہ بالا تمام تذکروں پر الگ الگ تنقید وتحقیق کی نظر ڈالی ہے۔مختلف تذکروں کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے۔اور کتاب کی مکمل معلومات فراہم کی ہیں۔تذکروں کی اہمیت وافادیت اوراس کی کمی کے موجودہ

رجحانات کوبھی بیان کردیا ہے۔تذکرہ نگاری کی روایت جتنی مضبوط ہےادب میں اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے۔اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹرفرمان فتح پوری کی یہ کتاب بھی تذکرہ نگاری کے تاریخ کے لئے جزولانیفک کا درجہ رکھتی ہے۔بعض جگھوں پرتو یوں محسوس ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسی کوسمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

۲۰۔ اُردومثنویاں (ڈاکٹرگوپی چندنارنگ)

ڈاکٹرگوپی چندنارنگ ہمارے ان بزرگان اُردو میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کواُردوادب کے لئے وقف کردیا ہے۔ان کی بے پناہ ادبی خدمات کواُردوادب میں سنہری حروف سےلکھا جائے گا آپ آج کل اپنی طویل عمر کےآخری دن گزارر ہے ہیں لیکن پھراُردو کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرے رہتے ہیں۔اُردوادب میں مابعد جدیدیت کے اصول اور رجحانات بھی انہوں نے متعارف کروائے جوآج کل تحریک کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

ڈاکٹرگوپی چندنارنگ نے ادبی تاریخ کومرتب کرنے میں اہم کردارادا کیا ہے۔ ''اُردوکی ادبی قارئین'' ان کا اہم کارنامہ ہے۔اسی سلسلے کی ایک اور کتاب ''اُردومثنویاں'' ہے۔جسےقومی کونسل برائے فروخت اُردوزبان، نئی دہلی نے دسمبر ۲۰۰۱ءمیں شائع کیا۔ ۳۶۴ صفحات پرمشتمل اس کتاب کے چارابواب ہیں جن میں مختلف النسل داستانوں کی تفصیلات دی گئی ہیں۔عنوانات ملاحظہ ہوں:

باب اوّل پورانک قصے

باب دوم قدیم لوک کہانیاں

باب سوم نیم تاریخی قصے

باب چہارم ہندایرانی قصے

مصنف موصوف نے ابواب بندی کی ترتیب جس انداز سے پیش کی ہے اسے دیکھ کر قاری کا دل خودبخود کتاب پڑھنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔پہلا باب ''پورانک قصے'' کے زیرِعنوان ہے۔پورانک قصے، مثنویات، اُردونثری نسخے، اُردومنظوم نسخے، مثنوی نل دمن، احمد شیزاوی، مثنوی نل دمن نکہت، مثنوی نل دمن راحت، مثنوی نل دمن کالی پرشادشامل ہیں۔ پورانک قصوں میں طوطی نامہ، پریم پچیسی، پریم چالیسی اورسنگاسن بتی وغیرہ بھی شامل ہیں۔مصنف نے ہرعنوان کے بعدان کا تعارف بھی کروایا ہے تاکہ قاری کوپورانک قصوں کی سمجھ آسکے کہ وہ کیا تھےان کا آغاز وارتقاء کیسے ہوا۔ اس کےمختلف سلسلے کیسے ہوئے وغیرہ وغیرہ مثلاً طوطی نامہ کےسلسلے کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مثنویات طوطی نامہ کا سلسلہ شک سپ تتی ایک سنسکرت کتاب تک پہنچتا ہے جس کے معنی میں توتے کی کہی ہوئی

۷۰ کہانیاں۔سنسکرت میں اس کے دو نسخے موجود ہیں۔'' (۹۲)

اسی طرح سنگھاسن بتی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سنگھاسن بتی ۳۲ کہانیوں کے اس مجموعے کا نام ہے جو راجا بکرماجیت کے جود وسخا اور ہمت و شجاعت کے بارے میں زمانہ قدیم سے مشہور رہی ہیں۔'' (۹۳)

فاضل مصنف نے ''پورانک قصے'' کے عنوان سنسکرت النسل مثنویوں کے مختلف سلسلے پیش کئے ہیں اور ہر سلسلے کا پہلے تعارف کروایا ہے اور پھر بعد میں اس سلسلے کی تمام کہانیوں کا سرسری تعارف پیش کیا ہے اور جہاں جہاں ضرورت پڑی وہاں وہاں تفصیل بھی دی ہے۔اس طرح ہر باب میں یہی طریقہ رکھا ہے جو عام قاری کو بھی بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے:

''اُردو مثنویاں'' کا دوسرا باب، قدیم لوک ادب، کے عنوان سے ہے اس باب میں ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی منہیوال اور دیگر لوک کہانیوں کے علاوہ ملا وجہی کی قطب مشتری کو بھی شامل کیا گیا ہے۔قدیم لوک ادب میں عشق و محبت کی مشہور داستانوں کو بہت سے شعراء نے اپنے اپنے اسلوب میں بیک وقت اتنا لکھا کہ اسکا رواج عام ہوگیا۔لوک داستانوں کے قبول عام کے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں:

ہیر رانجھا کا افسانہ عشق پنجاب کا مشہور و معروف قصہ ہے اور اب تک خاص و عام میں مقبول ہے۔ پنجابی زبان میں اسے سب سے پہلے ''دمودڑا روڑہ'' ساکن قصبہ جھنگ نے لکھا اس نے یہ قصہ راجا رام کھتری عرف گجرال ساکن قصبہ بھیرہ ایک عینی شاہد سے سنا۔دمودڑ اس قصے کو اکبر کے زمانے کا بیان کرتا ہے۔'' (۹۴)

مصنف نے ملا وجہی کی شہرہ آفاق مثنوی ''قطب مشتری'' کو بھی لوک ادب میں شمار کیا ہے حالانکہ دکنی ادب اور شمالی ہند کے لئے الگ الگ باب مختص کیا گیا ہے۔لوک ادب میں جہاں مختلف لوگ کہانیوں پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے وہاں خصوصاً قطب مشتری پر بھی زیادہ تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''وجہی کی مثنوی قطب مشتری اُردو ادبیات میں تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔یہ سلطان محمد قلی قطب (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے زمانے میں ۱۰۱۸ھ میں تصنیف ہوئی اس میں تقریباً ۲۰۰۰ اشعار ہیں جنہیں وجہی نے ۱۲ دن میں کہہ ڈالا۔اس مثنوی کا ایک مخطوطہ انڈیا آفس لندن میں ہے۔'' (۹۵)

مصنف نے ہر کہانی کے ساتھ ساتھ اس کی ساخت اور وجیہہ تخلیق بھی بیان کردی ہے تاکہ قاری کی معلومات میں اضافہ ہو اور ادب کی تاریخ بھی مستند ہو۔سسی پنوں کے قصے کے بارے میں جو معلومات دی ہیں وہ دیدنی ہیں مثلاً:

''سسی پنوں کے قصے کو شمالی مغربی ہندوستان میں وہی اہمیت حاصل ہے جو ڈھولا ماڑ و کو راجستھان میں یا مادھولعل اور کام کنڈلا کو بہار میں۔سندھ کچھ بلوچستان اور پنجاب میں یہ قصہ بچے بچے کی زبان

پر ہے۔ سندھی عوام میں تو سسی اور پنوں کو اولیا کا مرتبہ حاصل ہے لیکن سندھ کی نسبت پنجاب
میں اسے جو حسن قبول ملا، بیان سے باہر ہے پنجاب میں بعض مقامات پر لوہری کے دن اب بھی سسی
پنوں کا سوانگ رچایا جاتا ہے اور عوام ہاشم کی پنجابی سسی گاتے ہیں۔'' (۹۶)

مصنف نے چند ایسی مثنویوں کی نشان دہی بھی کی ہے جو کسی خاص علاقے یا چھوٹے چھوٹے قصبوں کی حد تک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سینہ بہ سینہ موجود ہیں۔ اس حوالے سے اُردو منظوم نسخوں میں سے محبت خان کی مثنوی اسرار محبت ۱۱۹۷ھ بلند ادبی مرتبہ رکھتی ہے۔ (۹۷)

آخری دو ابواب میں ہم تاریخی قصے اور ہند ایرانی قصے کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیم تاریخی قصے سے مراد وہ مثنویاں جو دکن میں پرو دیتے تھے۔ جبکہ ہند ایرانی قصے میں مثنوی پھول بن سحر البیان اور گلزار نسیم کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں ان کا موازنہ بھی پیش کیا ہے جو تاریخ کے ساتھ ساتھ نقد کی عکاسی کرتا ہے مثنوی پھول بن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مثنوی پھول بن دکھنی شاعر ابن نشاطی کا زندہ جاوید کارنامہ ہے ایسے مجلس اشاعت دکنی مخطوطات
نے پروفیسر عبدالقادر سروری نے مرتب کرا کے شائع کر دیا ہے۔ دکھنی ادبیات میں ایسی مثنویوں کی
کمی نہیں جو مقامی قصوں سے ماخوذ ہیں یا عوامی بنیاد کی روایات پر لکھی گئی ہیں۔ لیکن ہندوؤں اور
مسلمانوں کے اشتراک سے جو مخلوط معاشرت پیدا ہوئی تھی اس کا جو اثر اپنے زمانے کے قصوں پر پڑا
دکھنی مثنویوں میں اس کی بھرپور کامیابی نمائندگی مثنوی پھول بن ہی کرتی ہے ۔۔۔۔۔ پروفیسر
عبدالقادر سروری نے صحیح کہا ہے کہ پھول بن کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ شاعر نے قصے کو اپنے
زمانے اور ماحول کے چوکھٹے میں بٹھایا اور اس میں اپنے گرد و پیش کے مخلوط معاشرتی کوائف کی جیتی
جاگتی تصویر پیش کی ہیں۔'' (۹۸)

دیا شنکر نسیم (۱۸۱۱ء تا ۱۸۴۷ء) کی مثنوی ''گلزار نسیم'' گل بکاؤلی کے مشہور قصے پر مبنی ہے اس قصے کی اصل کے بارے فاضل مصنف کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کے پردے میں ہلکی پھلکی تنقید بھی کی ہے اور جس فن پارے کی اہمیت زیادہ ہے اس کو تسلیم بھی کیا ہے۔ ادبی تاریخ میں شرر اور چکبست کا ادبی معرکہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے شرد نے سحر البیان جبکہ چکست نے گلزار نسیم کی حمایت میں نعرہ لگایا تو ہندوستان بھر کے ادباء و شعراء اس معاملے پر دو گروہوں میں بٹ گئے۔ آخری باب میں چونکہ میر حسن اور دیا شنکر نسیم کی مثنویوں کا ذکر ہے۔ اس لئے مصنف نے بھی دونوں کا سیر حاصل تجزیہ کیا ہے۔ مصنف کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی سحر البیان کو گلزار نسیم پر ترجیح دیتے ہیں۔ ذیل میں سحر البیان اور گلزار نسیم کے حوالے سے مصنف کے دو اقتباسات ملاحظہ کریں:

''میر حسن کی یہ مثنوی ''سحر البیان'' اُردو ادب کا لافانی شاہکار ہے۔ میر حسن نے یوں تو کئی
مثنویاں لکھی لیکن جو قبول عام سحر البیان کو نصیب ہوا اور کسی مثنوی کے حصے میں نہ آیا۔ بہ قول میر حسن

انہوں نے اس کہانی میں اپنی عمر صرف کر دی تب کہیں جا کے بڑھاپے میں یہ مثنوی لکھی گئی۔'' (۹۹)

''دیا شنکر نسیم (۱۸۱۱ء تا ۱۸۴۴ء) کی مثنوی ''گلزار نسیم'' گل بکاؤلی کے مشہور قصے پر مبنی ہے۔اس قصے کی اصل کے بارے میں بہت کم معلوم ہے۔گلزار نسیم کے ماخذ ریحان کی اُردو مثنوی اور رفعت کی فارسی مثنوی ہیں۔'' (۱۰۰)

مذکورہ اقتباسات پر غور کریں تو مصنف نے سحر البیان کو ادب کا لافانی شاہکار کہا ہے جبکہ گلزار نسیم کے ماخذ گنوانا شروع کر دیتے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سحر البیان نسیم کی گلزار نسیم سے قدرے بہتر مثنوی ہے۔

مثنوی کی تاریخ پر اور بھی بہت سی کتب موجود ہیں اور تمام کی تمام اُردو ادب کی چند خاص مثنوی کو ہی پیش کرتی ہیں لیکن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا انداز ہ منفرد ہے۔انہوں نے بجائے مثنویوں کے نام کی سرخیاں درج کرنے کے مختلف اصل مثنویوں پر مشتمل چار ابواب بنا کے صنف مثنوی کو موتیوں کی لڑی میں خوبصورت انداز سے پرو دیا ہے۔

۲۱۔ اُردو ادب کی فنی تاریخ (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اُردو ادب کی فنی تاریخ'' اُردو نثر کے اصناف اور فنی اسالیب کا احاطہ کرتی ہے اگر چہ یہ کتاب پاک و ہند سے کئی بار شائع ہوئی پھر بھی اس کی طلب و مقبولیت میں کمی نہیں آئی ایک عرصے سے کمیاب و نایاب ہے اس لئے الوقار پبلی کیشنز لاہور کی معرفت ہے ۲۰۰۳ء میں تازہ رنگ و روپ کے ساتھ منظر عام پر آئی۔کتاب کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

''میرے مطالعے کے حد تک اُردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں اُردو نثر کی ساری شاخوں یعنی داستان، افسانہ، ناول، تمثیل، تنقید، ڈرامہ، انشائیہ، تذکرہ نگاری، سوانح، خاکہ نویسی، رپورتاژ، مکتوب اور آپ بیتی پر بیک وقت مفصل اور معتبر بحث کی گئی ہے اور اس کی اسی انفرادیت کی اساس پر اپنے منظر عام پر لا یا جا رہا ہے۔'' (۱۰۱)

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب کی کمی کو کافی حد تک محسوس کیا اور اُردو نثر کی ساری شاخوں کو مندرجہ ذیل مختلف عنوانات کے تحت بیان کر دیا ہے مثلاً کتاب سے پہلے:

۱۔ افسانہ

۲۔ ناول

۳۔ داستان

۴۔ ڈرامہ

۵۔ تمثیل نگاری

۶۔ انشائیہ

۷۔ تنقید

۸۔ تذکرہ نگاری

۹۔ سوانح نگاری

۱۰۔ خاکہ نگاری

۱۱۔ خطوط نگاری

۱۲۔ رپورتاژ

۱۳۔ غزل

۱۴۔ نظم

۱۵۔ مثنوی

۱۶۔ قصیدہ

۱۷۔ مرثیہ

۱۸۔ رباعی

۱۹۔ واسوخت

۲۰۔ ریختی

۲۱۔ قطعہ

۲۲۔ گیت

۲۳۔ شہرِ آشوب

۲۴۔ منظوم ڈرامہ

۲۵۔ سانٹ

۲۶۔ دوہا

۲۷۔ پیروڈی

۲۸۔ ہائیکو وغیرہ

ان عنوانات کے تحت مصنف نے مفصل اور معتبر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مصنف ''داستان اور داستانیں'' کے

عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''داستان کا لفظ بڑا ہمہ گیر ہے اور ادبی داستانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کے اس میں قصے کے تمام اقسام شامل ہیں۔ اُردو فارسی میں تو خیر کہانی قصہ، افسانہ اور داستان بالعموم ایک ہی ہے معنوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔۔۔۔۔

داستان کی بناء خلا میں نہیں رکھی گئی ہے۔ وہ انسانی ذہن کی تخلیق ہونے کی حیثیت سے ہمیں زمانہ قدیم و بعید کے انسان کی یاد دلاتی ہیں ان کے اعتقادات و میلانات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ انکے انداز غور وفکر سے آشنا کرتی ہیں ان کی سادہ لوحی، بے چارگی، مردانگی، معصومیت، خداترسی، قوت تسخیر، فتح و کامرانی کے قصے سناتی ہیں ان کے ذوق وشوق، مشاغل ومعمولات اور خیر وشر کے لمحات ہمارا دل بہلاتی ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے ہمیں دنیا کے خرخشوں سے نجات دلاتی ہیں۔ ایسی صورت میں داستانوں کو ادبی یا تاریخی لحاظ سے کم مایہ خیال کرنا کوتاہ نظری ہوگی۔'' (۱۰۲)

اسی طرح مصنف ''تذکرہ نگاری کا فن'' کے عنوان کے تحت کہتے ہیں:

''اُردو میں ''تذکرہ نگاری'' کا آغاز فارسی کے زیرِ اثر ہوا ہے اور اس فن کو بنیادی طور پر بیاض نگاری کے شوق نے جنم دیا ہے۔ قدما کا دستور تھا کہ وہ اپنی پسند کے مطابق اشعار کا انتخاب کر لیا کرتے تھے یہ انتخابات، ذاتی لطف اندوزی کے لئے بھی تھے اور دوسروں سے حسن انتخاب کی داد لینے کے لئے بھی۔۔۔۔۔'' اس کتاب میں متقدمین نے اشعار کے انتخاب کا طریقہ بیان کیا ہے کہ کس طرح لوگ اچھے اشعار بیاضوں کی صورت میں جمع کرتے تھے کچھ لوگ مختلف اصناف کے منتخبات سے اپنی بیاض مزین کرتے تھے بعض ادنیٰ و اعلیٰ ہر قسم کے شاعر کے پسندیدہ اشعار جمع کرتے تھے اور بعض صرف مشاہیر سخن کے کلام کے انتخاب ہی کو کافی سمجھتے تھے غرض یہ کہ قدما میں منتخب اشعار کی بیاض رکھنے کا رواج عام تھا۔'' (۱۰۳)

اس کتاب میں متقدمیں نے اشعار کے انتخاب کا طریقہ بیان کیا ہے کہ کس طرح لوگ اچھے اشعار بیاضوں کی صورت میں جمع کرتے تھے۔ اس کتاب میں ''اُردو میں ہائیکو'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''اُردو زبان اور اس کی شعری روایت روزِ ازل سے ہم قدم و ہم سفر رہی ہیں اور دونوں کا رنگ و روپ ایک جیسا رہا ہے جس طرح اُردو نے اصوات والفاظ کے باب میں دوسری زبانوں سے غیر معمولی استفادہ کیا ہے اسی طرح اس کی شعری روایت بھی دنیا کی مختلف زبانوں کی اہم شعری روایات واصناف سے مستفیض رہی ہے۔ چناچہ اُردو کی اصناف سخن پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ:

۱۔ قصیدہ، رباعی، مثنوی، غزل، قطعہ، دوبیتی، مسمط اوران کی اقسام کوعربی اورفارسی کے زیرِ اثر اُردو میں جگہ ملی ہے۔

۲۔ دوہا، بارہ ماسا گیت اورانکی اقسام، مقامی زبانوں کی وساطت سے اُردو میں داخل ہوتی ہیں۔

۳۔ نظم معرا ی، نظم آزاد، مختصرنظم، سانٹ، ترائیلے لمرک وغیرفرانسیسی اورانگریزی زبانوں کا عطیہ ہیں۔

''ہائیکو'' جس کا یہ پچھلے بیس پچیس سال سے اُردو میں خاصا چرچا ہے جاپان کا تحفہ ہے اس کا شمار جاپان کی مقبول ترین اصنافِ سخن میں ہوتا ہے۔'' (۱۰۴)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مختلف اصناف کے ارتقاء کو بیان کیا خصوصاً ہائیکو پر روشنی دالی ہے کہ یہ صنف خالصاً جاپانی صنف سے ماخوذ ہے۔ مذکورہ اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اُردو نثر کے فنی ارتقاء کی جانب خوب توجہ مبذول کرائی ہے۔ انہوں نے نثر کے جملہ اسالیب واصناف کا فنی وتاریخی جائزہ لے کر اسے مستقل حوالے اور مطالعے کی دستاویز بنا دیا۔ ''اُردوادب کی فنی تاریخ'' ایک اہم کتاب ہے جس میں اُردو نثر کی ساری شاخوں پر بیک وقت مفصل اور معتبر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۲۔ اُردو کی بہترین مثنویاں (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کامیاب استاد، محقق، نقاد اور مدیر ہیں ان کی ادبی خدمات سے عصرِ حاضر کے طلبہ، محقق اور مؤرخ استفادہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے ''اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' اُردو کی منظوم داستانیں اُردو کی بہترین مثنویاں، ''اُردو افسانہ اور افسانہ نگار'' اُردو ادب کی فنی تاریخ اور دیگر کئی کتب تصنیف کی ہیں۔ ماہنامہ ''نگار'' کراچی میں کئی اہم خاص نمبرز بھی شائع کئے جوان کے اُردوادب سے خاص عقیدت کی واضح مثالیں ہیں۔ ''اُردو کی بہترین مثنویاں'' بھی مثنوی کے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔ انہوں نے اُردوادب کی تین بہترین مثنویاں سحرالبیان، گلزارِنسیم اور زہرِعشق کا انتخاب کیا ہے۔ مثنویوں کے عہد اور فن پر محققانہ رائے دی ہے۔ ۱۹۸ صفحات پر مشتمل ۲۰۰۷ء میں اسے الاعجاز پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ (۱۰۵)

اُردو ادب میں مثنوی کی صنف غزل کے ساتھ ساتھ موجود رہی ہے۔ غزل اور مثنوی اُردو ادب کی مقبول ترین اصناف ہیں۔ مثنوی لکھنے کی وجوہات کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

''مثنوی کی صنف بہ اعتبار ہیت دوسری اصناف شعری کے مقابلے میں یوں آسان ہے کہ اس کا قافیائی نظام سخت اور تنگ نہیں ہے۔ ہر شعر کا قافیہ دوسرے شعر سے الگ ہوتا ہے۔ اس لئے شاعر جو

کچھ کہنا چاہتا ہے اسے اپنے پسند کے قافیوں میں آسانی سے کہہ لیتا ہے موضوع کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ ہر قسم کے داخلی و خارجی موضوع پر مثنوی کہی جاسکتی ہے۔ نہ مثنوی کے اشعار کی تعداد مقرر ہے اور نہ بحر و وزن کی کوئی تخصیص۔ مختصر سے اور طویل سے طویل مثنوی۔ جس بحر و وزن میں چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ یہی آزادی و آسانی ہے جس نے اُردو میں اچھی بڑی مثنویوں کا ایک انبار لگا دیا ہے۔'' (۱۰۶)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس کتاب سے پہلے بھی اُردو مثنویوں پر ایک ضخیم مجموعہ ''اُردو کی منظوم داستانیں'' جو ان کے ڈاکٹریٹ کا موضوع تھا تصنیف کر چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کا انتخاب تین شہرہ آفاق مثنویوں کے قبولِ عام اور بقائے دوام کی وجوہات کو بروئے کار لانے کے لئے کیا گیا ہے۔ سحر البیان، گلزارِ نسیم، زہرِ عشق دبستانِ لکھنؤ کی شہرہ آفاق منظوم داستانیں ہیں، مؤرخین نے ان مثنویوں کی دل کھول کر داد دی ہے۔

مصنف نے مثنوی کی تاریخ، خلاصہ اور ان پر ناقدانہ تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ مثنوی نگاروں کے ذاتی حالات، ان کا عہد اور ان کی دیگر مثنویوں کا حوالہ بھی پیش کیا ہے۔ گویا کتاب مذکورہ میر حسن، دیا شنکر نسیم اور نواب مرزا شوق کی دیگر مثنویوں کو بھی پیش کرتی ہے۔ سب سے اہم اور مفید پہلو یہ ہے کہ سحر البیان اور گلزارِ نسیم کا تقابلی مطالعہ بھی اس میں مل جاتا ہے۔ عبدالحلیم شرر اور پنڈت برج نرائن چکبست کی معاصرانہ چشمک بھی سحر البیان اور گلزارِ نسیم کی وجہ سے ہوئی تھی۔ شرر نے سحر البیان کی حمایت میں لکھا جب کہ چکبست گلزارِ نسیم کا دفاع کرتے رہے۔ اس اثناء میں ادب میں دو گروہ طویل عرصہ تک مضامین و مقالات لکھنے میں مصروف رہے۔ مصنف ان دونوں مثنویوں کی اپنی اپنی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سحر البیان اور گلزارِ نسیم'' دونوں الگ الگ محاسن کی حامل ہیں۔ ان کے معاشرتی اور تہذیبی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ دونوں کے متعلق ایک ہی حکم لگانا یا ذاتی پسندیدگی کی بناء پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا اصولِ تنقید کے منافی ہے۔ دونوں اُردو کی بہترین طویل نظمیں ہیں۔ اور دونوں نے عام و خاص کو یکساں طور پر متاثر کیا ہے۔ ان مثنویوں میں صرف دو قصوں کا اختلاف نہیں بلکہ دو مکتبہءِ فکر، دو شخصیتوں اور دو فنی دبستانوں کا اختلاف ہے۔ اس لئے ان کے حسن و قبح پر کسی ایک اصول کے ماتحت حکم لگانا مفید و مناسب نہیں ہے۔'' (۱۰۷)

مصنف نے میر حسن اور دیا شنکر نسیم کے فنِ مثنوی نگاری کے بعد نواب مرزا شوق کی مثنوی زہرِ عشق کو بھی کتاب کا موضوع بنایا ہے۔ نواب مرزا شوق، اُردو شاعری کے عہدِ زریں سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالبؔ، ذوقؔ، شاہ نصیرؔ، مومنؔ، ظفرؔ، واجد علی اخترؔ، آتشؔ، صبا وزیرؔ، دبیرؔ اور انیسؔ وغیرہ ان کے ہم عصروں میں تھے۔ ان میں سے بعض نے غزل گوئی میں، بعض نے مرثیہ نگاری میں اور بعض نے عشقیہ نظم بصورتِ مثنوی میں کمالِ فن کا مظاہرہ کیا۔ مرزا شوق صرف بحیثیت مثنوی نگار شہرت رکھتے ہیں اور مثنوی ''زہرِ عشق'' کے سبب ایک باکمال و منفرد اسلوب کے خیال کئے جاتے ہیں۔'' (۱۰۸)

مصنف اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''سحر البیان اور گلزارِ نسیم کے بعد اُردو مثنویات کی تاریخ میں نواب مرزا شوق لکھنوی نے پھر ایک جادو جگایا۔ میر حسن اور دیا شنکر نسیم کی مثنویوں میں جگ بیتی قصے تھے۔ سنی سنائی داستانیں تھیں، نواب مرزا شوق کی مثنویوں میں آپ بیتی اور حقیقت نگاری کا رنگ جھلک اٹھا۔ اس نوع کی مثنویوں کے بناء میر اور سودا کے زمانے ہی میں پڑ گئی تھی۔ میر تقی میر نے خاص طور پر اپنے معاملاتِ محبت کو منظوم کر کے اُردو مثنوی کو بالکل ایک نیا رخ دے دیا تھا۔ لیکن ذاتی واقعات کے بیان اس قسم کی جرائت اظہار سب میں نہیں ہوتی عام طور پر لوگ واحد متکلم کی بجائے صیغہء واحد غائب ہی میں اپنے عشقیہ افسانے بیان کرتے ہیں۔'' (۱۰۹)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے تین مثنویوں کا تقابلی مطالعہ اس کتاب میں پیش کر دیا ہے۔ بحیثیت مجموعی کتاب مذکورہ سحر البیان، گلزارِ نسیم اور زہرِ عشق کے فکر و فن کی مکمل طور پر عکاسی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ میر حسنؔ، دیا شنکر نسیمؔ اور نواب مرزا شوقؔ کے ذاتی حالات اور ان کے فن کو پیش کرتی ہے۔ اختصار سے کہا جائے تو ڈاکٹر موصوف کی کتاب فن مثنوی نگاری پر ایک مستند اور جامع کتاب ہے۔ اس کے مطالعے سے نہ صرف مثنوی کے فن کے لوازمات سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ دیا شنکر نسیمؔ، میر حسنؔ اور نواب مرزا شوقؔ کے فن پر روشنی پڑتی ہے۔

۲۳۔ ہماری داستانیں (پروفیسر سید وقار عظیم)

پروفیسر سید وقار عظیم نے اپنی کتاب ''ہماری داستانیں'' میں صنف داستان نگاری پر اپنے فاضلانہ تجربہ سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر سید وقار عظیم کے وہ مضامین شامل ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً لکھتے رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہماری داستانیں'' میرے ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو اُردو نثر کی سب سے عجیب وغریب اور بعض حیثیتوں سے سب سے دلکش اور سب سے اہم صنف کے مطالعے کے بعد میں مختلف وقتوں میں لکھتا رہا ہوں۔ نثر کی اس صنف کو سب سے عجیب وغریب اور سب سے دلکش کہتے وقت مجھے یقین ہے کہ جن صاحبان نے داستانوں کا مقابلہ کیا ہے وہ انہیں عجیب وغریب اور دلکش کہنے میں میرے ہمنوا ہوں گے لیکن میں نے اس صنف کو نثر کی سب سے اہم صنف کہا ہے۔ اس بات میں میری تائید اور ہمنوائی کرنے والوں کی تعداد شائد کم ہو اس لئے اس سلسلے میں میں اپنے خیال اور اپنے نقطہ نظر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ اُردو کی داستانوں کو مجموعی حیثیت سے اپنی نثر کی سب سے اہم صنف کہنے کا میرے پاس وہی جواز ہے جو غزل کو شاعری کی سب سے اہم صنف

سمجھنے کا جس طرح غزل ہمارے مشرقی مزاج اور اس مزاج کے اکثر نازک اور پیچیدہ پہلوں کا عکس ہے اسی طرح داستانیں ہماری تہذیبی زندگی اور اس کے بے شمار گوشوں کی مصورو ترجمان ہیں۔'' (۱۱۰)

پروفیسر سید وقار عظیم کے نزدیک داستان ایک اہم صنف نثر ہے بالکل غزل کی طرح۔ اس لئے پروفیسر موصوف نے اس صنف پر زیادہ سے زیادہ مضامین تحریر کئے ہیں۔ اس میں پندرہ مضامین شامل ہیں اور ایک اضافہ بھی جو بعد میں شامل کیا گیا۔ جو ''باغ و بہار اور اس کے مصنف'' کے عنوان سے شامل ہے۔ پہلا مضمون ہماری داستانیں اور آخری مضمون سرشار کی الف لیلیٰ ہے۔ مصنف اپنے مضموں میں لکھتے ہیں:

''داستانیں اپنی طوالت، اپنی غیر موزونیت، اپنے عدم توازن واعتدال، اپنے غیر فطری عناصر، اپنے کج رواور بے راہ روتخیل کے باوجود دلچسپ ضرور ہے اور اس طرح فن کا ایک اہم، سب سے اہم، ایک بڑا، سب سے بڑا تقاضاء پورا کرتی ہیں۔'' (۱۱۱)

اپنے آخری مضمون سرشار کی الف لیلیٰ میں لکھتے ہیں:

''الف لیلیٰ بلاشبہ دنیا بھر میں کہانیوں کا سب سے معروف اور بعض حیثیتوں سے سب سے مقبول مجموعہ ہے اور اس کے متعدد نسخے عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، روسی، یونانی، ہسپانوی اور مغرب کی بعض دوسری زبانوں میں موجود ہیں۔ دیسی زبانوں میں مراٹھی، گجراتی، بنگالی اور ہندی میں اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ اُردو میں بھی ۱۸۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک اسے مختلف مؤلفین نے مرتب اور کئی شاعروں نے نظم بھی کیا ہے۔ اُردو کے بعض نامور صاحب طرز ادیبوں نے بھی اس کی طرف توجہ کی ہے۔ ان نامور ادیبوں اور انشاء پردازوں میں مرزا رجب علی بیگ سرور پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مرزا حیرت کے نام خاص طور پر اہم ہیں۔ سرشار نے بعض ادیبوں کی طرح اپنی تالیف کا کوئی خاص نام نہیں رکھا اسے الف لیلیٰ ہی کہا ہے۔ البتہ کتاب کے ناشروں نے جب اور جہاں اس کتاب کا اشتہار دیا ہے اس کے ساتھ بطرزِ ناول کے ٹکڑے کا اضافہ کیا ہے۔ اور اسی لئے پڑھنے والا اس الف لیلیٰ کو اسی جدت کی کشش کی وجہ سے پڑھنے کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ گو سرشار کے نام کی کشش ہی بجائے خود اتنی بڑی ہے کہ کتاب کو کسی دوسری سفارش اور وسیلے کی ضرورت نہیں۔'' (۱۱۲)

الف لیلیٰ متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوئی اور بہت سے لوگوں نے اسے لکھا مگر سرشار نے جس انداز سے لکھا وہ منفرد بھی ہے اور اہم بھی۔ پروفیسر سید وقار عظیم نے اس پر جامع اور مضبوط رائے کا اظہار کیا ہے اس اعتبار سے بھی یہ کتاب بہت اہم ہے کے اس میں باغ و بہار پر چار مضامین شامل ہیں اور رانی کیتکی کی کہانی داستان امیر حمزہ، آرائش محفل اور حاتم کی

مہمیں ، بتیال پچیسی ، مہجور کی نورتن ، کچھ فسانہ عجائب کے بارے میں شرارِ عشق ،شگوفہ محبت ،گل صنوبر وغیرہ پر بھی بہت اہم مضامین شامل ہیں جن کے مطالعے کے لئے داستانوں کی روایت فن اور تاریخ سے آگاہی ہو جاتی ہے۔

جن کتب تاریخ کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اصناف کی تاریخ نگاری میں تحقیق وتنقید سب اہمیت کی حامل ہے کیونکہ ڈرامے کی تاریخ ڈرامے کی اہمیت وافادیت اور موضوع وفن کو بیان کرتے ہیں۔اسی طرح کسی بھی صنف کی تاریخ نگاری سے صنف کا سیاق وسباق سامنے آجاتا ہے۔ان کتب کا مطالعہ اصناف نگاری کی تاریخ میں ایک اضافہ ہوگا۔اور ایک جامع انداز سے مستقبل کے محققین اور ناقدین کے لئے رہنمائی کا باعث ہوگا۔

۲۴۔ اُردو افسانہ اور افسانہ نگار (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادبی خدمات ادبی حلقوں میں مسلمہ ہیں۔ جہاں جہاں ان کا قلم پہنچا وہاں وہاں ادبی معلومات ہم تک پہنچتی ہیں۔تذکرے،مثنویاں،منظوم داستانوں کی ادبی تاریخ مرتب کرنے کے بعد انہوں نے اُردو افسانے کی بھی تاریخ مرتب کی ہے۔کتاب مذکورہ میں پچیس مختلف افسانہ نگاروں کے کوائف، ادبی کارنامے، فنِ افسانہ نگاری کا جائزہ اور ہر ایک کا پہلا افسانہ تحریر کیا گیا ہے۔ جہاں تک پہلے افسانے کا تعلق ہے یہ ایک اچھا عمل ہے کیونکہ اکثر اوقات محقق اور طلباء نامور ادیبوں کی پہلی تحریر کے بارے میں معلومات درکار ہوتی ہیں جو یہ کتاب بخوبی دے رہی ہے۔مصنف اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اگلے صفحات میں اُردو افسانے کی اَسّی سالہ تاریخ کی روشنی میں پچیس اہم اور نمائندہ افسانہ نگاروں کا سوانحی خاکہ، ادبی وتخلیقی سرگرمیوں کا تذکرہ، فکری وفنی خصوصیات، اُردو افسانے کی سمت و رفتار پر مبنی جائزہ،اور پہلا افسانہ آپ کی نظر سے گزرے گا لیکن یہ کام صرف پچیس افسانہ نگاروں تک محدود نہ رہے گا،آگے بڑھے گا۔کوشش اور پروگرام یہ ہے کہ سارے افسانہ نگاروں پر اسی طرح کام کیا جائے اور ان کی ایسی قاموس مرتب کی جائے جسے حقیقی معنوں میں اُردو افسانہ نگاروں کی مکمل سوانحی لغت یا انتھالوجی کہا جا سکے۔'' (۱۱۳)

مصنف نے یہ کام دو جلدوں میں جمع کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن نامعلوم وجوہات کی بناء پر دوسری جلد اشاعت پذیر نہ ہوسکی۔اس کتاب میں افسانہ نگاروں کی تاریخ مرتب کرنے سے پہلے اُردو افسانے کے چار ادوار متعین کئے ہیں جو افسانہ نگاری کی تاریخ کو واضح کرتے ہیں۔پہلا دور ۱۹۰۰ء تا ۱۹۳۰ء دوسرا دور ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۳ء تیسرا دور تقسیم ہند سے ۱۹۶۰ء اور دور چہارم ۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۰ء تک ہے۔یہ اُردو مصنف کے خود تیار کردہ ہیں جسے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

مصنف نے جن پچیس افسانہ نگاروں کے فن اور شخصیت کو مرتب کیا ہے وہ بالترتیب نیاز فتح پوری، حلیم احمد شجاع، پطرس بخاری، مجنوں گورکھ پوری، ممتاز مفتی غلام عباس، احمد علی، سعادت حسن منٹو، حجاب امتیاز علی، ڈاکٹر اختر حسین، رائے پوری، عزیز احمد، شوکت تھانوی، مرزا ادیب، احمد ندیم قاسمی، سید انور، ممتاز شیریں، اشفاق احمد، ابراہیم جلیس، انتظار حسین، انور عنایت اللہ، بانو قدسیہ، حمید کاشمیری، امراؤ طارق، منیر احمد شیخ اور احمد ہمیش شامل ہیں۔ان میں چند افسانہ نگاروں کے فن اور شخصیت پر مبنی اقتباسات دیکھیے، پطرس بخاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پطرس نے اُردو میں بہت مختصر سا اثاثہ یادگار چھوڑا ہے۔ پھر بھی اس میں دورائیں نہیں کہ اُردو کے مزاحیہ ادب میں ان کا مقام خاصا بلند ہے انہوں نے تخیلی پرواز کی مدد سے چھوٹے چھوٹے تقریباً ایک درجن مضامین لکھے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔پطرس نے اپنا پہلا افسانہ ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' ۱۹۲۵ء میں لکھا تھا اور یہ اسی وقت شائع ہو گیا تھا۔'' (۱۱۴)

احمد ندیم قاسمی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی افسانہ نگار ہیں۔ شاعر ہیں۔ مدیر ہیں اور کالم نویس ہیں۔ ہر شعبے میں ان کا ایک منفرد وممتاز مقام ہے۔ زندگی کی حیثیت قدروں کے محافظ ہیں اور پاکستانی قومی شعور کے داعی کی حیثیت میں بھی ہماری ادبیات میں ان کا کردار بہت نمایاں ہے وہ آج سے نہیں کم وبیش چوالیس پینتالیس سال سے برابر لکھ رہے ہیں اور میرے زاویہ نظر سے وہ اپنے ہم عمروں میں تنہا ادیب ہیں جن کے فکر وفن میں ضعف واضمحلال کے آثار اب تک پیدا نہیں ہوئے۔'' (۱۱۵)

احمد ندیم قاسمی کی شعری، افسانوی، کالم نویسی اور ادارتی خوبیوں کو مصنف نے جس انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ نہایت اچھا ہے۔غلام عباس کا تعارف یوں کراتے ہیں:

> ''غلام عباس طبعاً کم آمیز، کم سخن، گوشہ گیر اور تنہائی پسند ہیں ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ وہ شروع ہی سے مسائل پر غور کرنے، انسان اور کائنات کے رشتوں کو سمجھنے، سماجی زندگی کی تبدیلیوں پر سوچنے اور تہذیبی اقدار کی شکست وریخت کے اسباب پر توجہ دینے کے قائل اور عادی ہیں۔'' (۱۱۶)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تمام افسانہ نگاروں کا مفصل تعارف، پہلا افسانہ نگاری میں ان کا مقام واضح کیا ہے۔تمام کام ترتیب وتفہیم کے ساتھ سرانجام دیا گیا ہے۔ افسانوی ادب کے سنجیدہ قارئین، اساتذہ اور تحقیق کے طلباء کے لئے کتاب ہٰذا مصنف کی طرف سے انمول تحفہ ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت قاری مصنف کو داد وتحسین دینے سے نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایک محقق اور نقاد کی حیثیت سے مصروف ہیں ان کی ان حشیات پر غور کریں تو مذکورہ کتاب اس کا ثبوت بن کر سامنے آجاتی ہے۔ یعنی ان کی محققانہ بصیرت اور تنقیدی شعور کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالحی ،مولانہ حکیم، گلِ رعنا، عشرت پبلیشنگ ہاؤس، ہسپتال روڈ، انارکلی، طبع اوّل ۱۹۶۴ء، ص ۹
۲۔ ایضاً، ص ۱۰
۳۔ ایضاً، ص ۷۵
۴۔ ایضاً، ص ۱۰۹
۵۔ ایضاً، ص‌ص ۲۷۸، ۲۷۹
۶۔ محمد باقر، آغا، تاریخ نظم ونثر اُردو، آزاد بک ڈپو، امرتسر، آزاد بھارت میں باریونین پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۳۲ء، ص ۲۵
۷۔ ایضاً، ص ۳۹
۸۔ ایضاً، ص ۴۶
۹۔ ایضاً، ص‌ص ۲۰۸، ۲۰۹
۱۰۔ ایضاً، ص ۲۶۷
۱۱۔ ایضاً، ص ۳۲۸
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۵۱
۱۳۔ بادشاہ حسین، سید، (حیدرآبادی) اُردو میں ڈرامہ نگاری، تاج بکڈپو، اُردو بازار، لاہور ۱۹۶۲ء ص ۶
۱۴۔ ایضاً، ص ۶
۱۵۔ ایضاً، ص‌ص ۶، ۷
۱۶۔ ایضاً، ص ۶
۱۷۔ ایضاً، ص‌ص ۹، ۱۰
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۹
۱۹۔ ایضاً، ص ۲۳۷
۲۰۔ سروری، عبدالقادر، جدید اُردو شاعری، مطبوعہ عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور، طبع سوم ۱۹۴۵ء ص‌ص ۲، ۳
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۰
۲۲۔ ایضاً، ص ۲۵

۲۳۔ ایضاً، ص۔۷۷

۲۴۔ ایضاً، ص ۳۴۲

۲۵۔ محمد شہاب الدین، اُردو میں حج کے سفرنامے، یونی ورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، س۔ن، ص ۴۱۶

۲۶۔ گیان چند، ڈاکٹر، اُردو کی نثری داستانیں (اضافہ شدہ ایڈیشن) ۱۹۶۹ء ، ص ۲۰

۲۷۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو کی منظوم داستانیں، انجمن ترقی اُردو پاکستان، گلشن اقبال، کراچی، طبع دوم ۲۰۰۲ء، ص ۷

۲۸۔ گیان چند، ڈاکٹر، اُردو کی نثری داستانیں (اضافہ شدہ ایڈیشن) ص ص ۱۹، ۲۰

۲۹۔ ایضاً، ص ۴۳

۳۰۔ ایضاً، ص ص ۱۳۵، ۱۳۶

۳۱۔ ایضاً، ص ۵۶۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۶۲۳

۳۳۔ اسمٰعیل امروہوی، اُردو کی دو قدیم مثنویاں، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اوّل، جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۴۳

۳۴۔ ایضاً، ص ۵۱

۳۵۔ ایضاً، ص ص ۱۰۳، ۱۰۴

۳۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو کی منظوم داستانیں، ص ۸۷

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۳

۳۸۔ ایضاً، ص ص ۳۶، ۳۷

۳۹۔ ایضاً، ص ص ۹۹، ۱۰۰

۴۰۔ حنیف نقوی، ڈاکٹر، شعرائے اُردو کے تذکرے، نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ، طبع اوّل، جون ۱۹۷۶ء ص ص (الف، ب)

۴۱۔ ایضاً، ص ص (ہ، و)

۴۲۔ ایضاً، ص ص۔(ر، ح)

۴۳۔ ایضاً، ص ص۔(۸۵۹)

۴۴۔ اے بی اشرف، اُردو سٹیج ڈرامہ (رادھا کنہیا سے انارکلی تک اُردو سٹیج ڈرامے کی مکمل تاریخ)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اوّل دسمبر ۱۹۸۶ء، ص ۳

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۳

۴۶۔ ایضاً، ص ۳۵

۴۷۔ ایضاً، ص ۷۶

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۴۹۔ ایضاً، ص ۲۳۹

۵۰۔ مسعود رضا خاکی، ڈاکٹر، اُردو افسانے کا ارتقاء، مکتبۂ خیال لاہور، اگست ۱۹۸۷ء ص ۲

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۲

۵۲۔ ایضاً، ص ص ۳۹، ۴۰

۵۳۔ ایضاً، ص ۲۹۱

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۶

۵۵۔ آرزو چودھری، داستان کی داستان، عظیم اکیڈمی اُردو بازار لاہور، ۱۹۸۸ء ص ۱۲

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۴۹

۵۷۔ آغا سہیل، ڈاکٹر، دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، طبع اوّل، دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ص ۵، ۸

۵۸۔ ایضاً، ص ۳۱

۵۹۔ ایضاً، ص ص ۳۲، ۳۳

۶۰۔ ایضاً، ص ۴۶

۶۱۔ ایضاً، ص ۲۶۱

۶۲۔ ایضاً، ص ص ۲۶۵، ۲۶۶

۶۳۔ ارم سلیم، ڈاکٹر، اُردو میں مقدمہ نگاری کی روایت، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۸۲

۶۴۔ ایضاً، ص ۲۳۲

۶۵۔ ریاض مجید، ڈاکٹر، اُردو میں نعت گوئی، اقبال اکادمی پاکستان، میکلوروڈ لاہور، طبع اوّل، ۱۹۹۰ء، ص ۱۸۶

۶۶۔ ایضاً

۶۷۔ عفت زریں، ڈاکٹر، فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں، ۱۹۹۲ء، مکتبہ جامع دہلی، ص ۵

۶۸۔ ایضاً، ص ۹

۶۹۔ ایضاً، ص ۱۶

۷۰۔ ایضاً، ص ۳۵

۷۱۔ ایضاً، ص ۴۷

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۶۳

۷۳۔ ایضاً، ص ۲۲۱

۷۴۔ ایضاً، ص ۳۹۴

۷۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو کی فنی تاریخ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان، طابع گنج شکر پریس، لاہور، سال اشاعت ۲۰۰۳ء، ص ص ۳۴۰۔۳۴۱

۷۶۔ شمیم صہبائی متھراوی، اُردو و اسوخت، سیماب اکیڈمی پاکستان، کراچی ۱۹۹۳ء، ص ۵

۷۷۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو کی فنی تاریخ، ص ۳۴۴

۷۸۔ شمیم صہبائی متھراوی، اُردو و اسوخت، ص ۲۶

۷۹۔ ایضاً، ص ۳۶

۸۰۔ وقار عظیم، پروفیسر سید، اُردو ڈرامہ (تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ) سالِ اشاعت ۱۹۹۶ء، ص ۵۴، ۵۵

۸۱۔ ایضاً، ص ۹۲

۸۲۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۸۳۔ ایضاً، ص ص ۱۵۴، ۱۵۵

۸۴۔ ایضاً، ص ۳۲۳

۸۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، انجمن ترقی اُردو، کراچی پاکستان، ۱۹۹۸ء ص۔ ہ

۸۶۔ ایضاً ص الف

۸۷۔ ایضاً ص ز

۸۸۔ ایضاً ص ۱۵

۸۹۔ ایضاً ص ۹۱

۹۰۔ ایضاً ص ص ۹۲،۹۳

۹۱۔ ایضاً ص ص ۴۲۷، ۴۲۸

۹۲۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اُردو مثنویاں (ہندوستانی قصوں سے ماخوذ)، فروغ اُردو زبان دہلی، دسمبر ۲۰۰۱ء،

ص ۷۶

۹۳۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۹۴۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۹۵۔ ایضاً، ص ۲۵۱

۹۶۔ ایضاً، ص‌ص ۱۹۱، ۱۹۲

۹۷۔ ایضاً، ص ۲۰۰

۹۸۔ ایضاً، ص‌ص ۳۰۳، ۳۱۱

۹۹۔ ایضاً، ص ۳۱۱

۱۰۰۔ ایضاً، ص‌ص ۳۱۹، ۳۲۳

۱۰۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی فنی تاریخ، الوقار پبلی کیشنز، سال اشاعت ۲۰۰۳ء ، ص ۱۱

۱۰۲۔ ایضاً، ص‌ص ۱۴۴، ۱۵۵

۱۰۳۔ ایضاً، ص ۲۸۶

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۵۳۶

۱۰۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو کی بہترین مثنویاں، الاعجاز پبلی کیشنز، سال اشاعت ۲۰۰۷ء ، ص ۲

۱۰۶۔ ایضاً، ص ۷

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۱۰۹۔ ایضاً، ص۱۴۵

۱۱۰۔ وقار عظیم، پروفیسر سید، ہماری داستانیں، الوقار پبلی کیشنز، طابع گنج شکر پریس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰

۱۱۱۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۱۲۔ ایضاً، ص ۴۵۱

۱۱۳۔ فتح پوری، ڈاکٹر فرمان، اُردو افسانہ اور افسانہ نگار، الوقار پبلی کیشنز، سال اشاعت ۲۰۱۳ء، ص۶

۱۱۴۔ ایضاً، ص ص۵۱،۵۳

۱۱۵۔ ایضاً، ص ۲۳۹

۱۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۹

باب چہارم: علاقہ وار تاریخ نگاری

علاقہ وار تاریخ نگاری میں زیادہ تر دو رجحانات پر تاریخی کتب تالیف کی گئیں۔ایک لسانیاتی تاریخ نویسی کا رجحان ہے جس میں مختلف مؤرخین نے اُردو زبان و ادب کو مختلف علاقوں سے منسوب کرنے کی کوشش میں ادبی تاریخیں لکھیں۔جن سب کی اہمیت اپنی اپنی جگہ پر بہت ہے۔مؤرخین جن علاقوں کا ذکر کیا ان میں پنجاب، سندھ، دکن، دہلی، لکھنؤ، بنگال، آسام، گجرات، میسور، پوٹھوار اور دیگر علاقوں کی مناسبت سے زبان و ادب کے آغاز کے سلسلے میں اپنے اپنے نظریات قابل ذکر ہیں۔ان تمام مباحث میں مؤرخین نے اپنے اپنے طور پر مدلل نظریات پیش کر کے کہیں نہ کہیں جا کر مہر صدق لگوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ (۱) دوسرا کامیاب رجحان دبستانوں کی تاریخ نگاری پر مشتمل ہے۔اس موضوع پر بھی مختلف ادوار میں متعدد کتب تاریخ ادب کا حصہ بنتی رہیں۔اس سلسلے میں دہلی کا دبستان شاعری اور لکھنؤ کا دبستان شاعری اپنی نوعیت کی شہرہ آفاق کتب ہیں (۲) اس کے علاوہ برصغیر کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے گروپوں کو دبستانوں کی شکل دیتے ہوئے مختلف مصنفین یہ کارنامہ سرانجام دیتے رہے۔لکھنؤ، لاہور اور دیگر کئی علاقوں کے دبستان بھی اس حوالے سے اہم ہیں۔علاقہ وار تاریخ نگاری کے ذیل میں لسانیاتی تاریخ نگاری اور دبستانوں کی تواریخ دونوں اس باب کا حصہ ہوں گی۔لسانیاتی تاریخ میں پنجاب میں اُردو، دکن میں اُردو اور سندھ میں اُردو جیسی کتب سرفہرست ہوں گی۔علاقائی تواریخ نگاری کے ساتھ ساتھ زبان و ادب پر مشتمل دبستانوں کی تاریخ کا جائزہ بھی مفصل پیش ہوگا۔

۱۔ دکن میں اُردو (نصیرالدین ہاشمی)

نصیرالدین ہاشمی کی کتاب ''دکن میں اُردو'' جس نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی اور جس نے انہیں شہرت عام اور بقائے دوام بخشا پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔(۳) اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔تقسیم ہند کے دونوں ملکوں کے کئی پبلشرز نے اسے شائع کیا۔کتاب مذکورہ کے شائع ہونے کا کام ابھی تک جاری ہے۔تحقیق وتصنیف کے حوالے سے مختلف محققین اور اسکالرز نے اس کے ہزاروں حوالے دیئے ہیں۔ترمیم و اضافہ کے ساتھ اس کتاب کو ۲۰۱۴ء میں بک ٹاک، لاہور نے بھی شائع کیا۔(۴) یوں یہ شہرآفاق کتاب دکنی ادب کا ایک عظیم سرمایہ قرار پائی۔یہ کتاب اس لحاظ سے بھی اہمیت و افادیت کی حامل ہے کیونکہ اس سے اُردو دان طبقہ دکنی کلچر، علم و ادب اور ممتاز اکابرین سے روشناس ہوا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ ترقی یافتہ ایڈیشن میں مصنف نے دکن میں اُردو میں ۱۳۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک اُردو نظم ونثر کی ابتداء اوراس کی ترقی کے مراحل کا جائزہ لیا ہے اور اسے سات ادوار میں منقسم کیا ہے۔(۵) پہلا دور بہمنی (۷۴۷ھ تا ۹۰۰ھ) دورِحکومت میں ہونے والی اُردو کی ادبی خدمات کے حوالے سے ہے جسے تاریخِ اُردو ادب میں ''اُردوادب کا بہمنی دور'' کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔اس باب میں بہمنی دور کے ساتھ ادبی شخصیات کی اُردوخدمات کا جائزہ لیا گیا ہے جو بالترتیب سیدمحمد حسینی گیسودراز، سیدمحمد اکبر حسینی نظامی، صدرالدین، عبداللہ حسینی اور آزری وغیرہ ہیں۔ مصنف عبداللہ الحسینی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس دور کے ایک اور مصنف سیدعبداللہ الحسینی ہیں، آپ خواجہ بندہ نواز سیدمحمد حسینی کے پوتے تھے۔ اپنے دادا کی طرح ارشاد اور ہدایت آپ کا مشغلہ تھا۔ احمد شاہ ثانی بہمنی کے زمانہ میں موجود تھے۔۔۔آپ نے مریدوں کی ہدایت کے لئے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی تصنیف ''نشاط العشق'' کا قدیم اُردوترجمہ دکھنی میں فرمایا تھا''۔(۶)

فاضل مؤرخ نے اس دور میں تمام شخصیات کی اُردوخدمات کا مفصل جائزہ پیش کیا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب یہ کتاب لکھی جارہی تھی اس وقت جو پنجاب میں اُردو، سندھ میں اُردواوراُردوئے قدیم کے نظریات کا آغاز ہو چکا تھا۔ انہی رجحانات کے پیشِ نظر مصنف نے ایک ایک نکتے کو باریک بینی اور وسعت نظری سے دیکھا ہے۔تمام شخصیات کا تعارف اور کارنامے تفصیل سے بیان کئے ہیں۔اسی لئے تاریخ کے محقق کے لئے آسانیاں بھی پیدا ہوگئیں۔کتاب کی ترتیب اور واقعات کی ترتیب بتاتی ہے کہ مصنف کے دل میں تاریخی محققین کا زبردست خیال موجودتھا۔

''دکن میں اُردو'' کا دوسرا دور ۹۰۰ھ تا ۱۱۰۰ھ تک محیط ہے۔یہ ایک طویل دوراور کارآمد دور ہے۔اس لئے اس کو مزید پانچ فصلوں میں تقسیم کر کے جزئیات نگاری سے کام لیا گیا ہے۔پہلی فصل معلومات افزا ہے اس میں تقریباً تیس سے زیادہ شعراء اور قطب شاہی نثر کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔قابل ذکر شعراء اور ادیب میں قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، تانا شاہ، فیروز شاہ محمود خیالی، وجہی، غواصی، احمد، قطبی، سلطان، بلاقی، جنیدی، ابن نشاطی، غلام علی، سیوک، فائز، لطیف، افضل، خدانما، عبداللہ عابد شاہ اور میراں یعقوب وغیرہ کی زبان سے وابستگی اور تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف قلی قطب شاہ کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''محمد قلی قطب شاہ، سلطان اُردو کا ایک بلند پایہ شاعر گزرا ہے۔اس کے کلیّات جس کو اس کے بھتیجے اور داماد محمد قطب شاہ نے مرتب کیا ہے اس کا بہترین نسخہ حضور نظام میر عثمان علی خاں کے ذاتی کتب خانہ میں تھا''۔(۷)

مصنف نے شاعر کے تعارف کے ساتھ ساتھ نمونہ کلام بھی پیش کیا ہے۔ جہاں جہاں ضرورت پڑی تشریح وتوضیح

سے بھی کام لیا ہے۔اسی طرح ایک لسانی مؤرخ نے وہ کام کر دیا جو محققین اور نقادوں کا ہے۔دوسرے دور کی دوسری فصل میں عادل شاہی حکومت کے ادبی کارناموں کو تفصیلاً درج کیا ہے۔سلاطین اور رعایا کی اُردو خدمات کا تذکرہ بھی خوب کیا ہے۔ عادل شاہی حکومت کے آغاز و ارتقاء اور سلطان ابراہیم عادل شاہی کی اُردو دوستی کا نقشہ کھینچا ہے۔ابراہیم عادل شاہی خود بھی شاعر تھا اس کے علاوہ شعراء اور نثر نگاروں کی نادر تحریروں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔جانم کی نثر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاہ برہان الدین جانم کی نظم کا نمونہ پیش کر دیا گیا ہے۔آپ نے بعض رسالے نثر میں بھی مرتب فرمائے ہیں۔ایک کا نام ''معرفت القلوب'' اور دوسرے کا نام ''ہشت مسائل'' ہے۔ یہ دونوں رسالے تصوف میں ہیں اور اس کے مخطوطات آقا حسن حیدر صاحب کے پاس موجود ہے''۔(۸)

پہلی اور دوسری فصلیں قدرے طویل ہیں۔مصنف نے عادل شاہی اور قطب شاہی عہد کے سلاطین اور عوام کی ادبی خدمات کو جذبات کی فراوانی سے پیش کر دیا ہے۔اس کے برعکس تیسری اور چوتھی فصل نظام شاہی اور برید شاہی عہد کے حوالے سے ہیں۔ یہ دونوں فصلیں بہت مختصر ہیں۔ چیدہ چیدہ معلومات تک اکتفا کیا گیا ہے۔ چوتھے دور میں دکنی مرثیہ گو شعراء کے عہد و ارتقاء کی عکاسی کی گئی ہے۔قابل ذکر شعراء اشرفؔ، وجہیؔ، غواصیؔ، لطیفؔ، کاظمؔ، افضلؔ، شاہیؔ، مرزاؔ، نوریؔ، اور ہاشمیؔ ہیں۔کتاب کا دوسرا دور ہی حاصل کتاب ہے۔جس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔مؤرخین نے قطب شاہی اور عادل شاہی ادبی دور کو اُردو دکنی دور بیان کیا گیا ہے۔تیسرے دور میں ۱۱۰۱ھ تا ۱۱۳۶ھ تک کے عہد کو اُردو دکنی دور بیان کیا گیا ہے اس دور کا مرکز و محور ولی دکنی ہے۔تاہم وجدیؔ، راجیؔ، محبوب عالم، ذوقی اشرفؔ اور ندیم کی شاعری کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔اس باب میں ولی دکنی کی شخصیت اور شاعری پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔مصنف لکھتے ہیں:

''ولی کا صحیح نام ولی محمد تھا دکن کے رہنے والے تھے۔ پیدائش کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہے۔تحصیل علم گجرات میں کیا اور ایک مدت تک وہاں اقامت اختیار کی۔ نہ صرف علوم ظاہری کا اکتساب کیا بلکہ حضرت شاہ وجیہہ الدین گجراتی سے فیض باطنی بھی پایا۔پہلی مرتبہ عالمگیر کے زمانہ میں دہلی گئے اور اپنی شاعری کے باعث مشہور ہوئے۔ وہاں کے شعراء نے ان کی پیروی کی اور فارسی کو خیر آباد کہہ کر اُردو میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ دوسری مرتبہ پھر شاہ محمد کے زمانہ میں دہلی کا سفر کیا۔شاہ ابوالمعالی بھی ساتھ رہے۔ دیوان بھی ساتھ تھا''۔(۹)

چوتھا، پانچواں اور چھٹا باب اپنی ضخامت اور جسامت کے لحاظ سے جدا ضرور ہیں لیکن تینوں ادوار میں سلطنت آصفیہ کی شاعری اور نثر کا مجموعی تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ ادوار ۱۱۳۶ھ تا ۱۳۳۶ھ تک محیط ہیں۔حوالہ جات اور مستند تجزیے مصنف کے وسعتِ مطالعہ اور تاریخی ذوق کی داد دے رہے ہیں۔سلطنت آصفیہ کی تدوین و ترتیب کی مکمل داستان بھی انہی ابواب میں ہیں۔سلطنت آصفیہ کے دور کی ادبی خدمات اور مغل بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کی وفات اور ہندوستان کی خانہ جنگی

کی مکمل تفصیل اسی باب میں خوب بیان کی گئی ہے۔اس کے علاوہ فرخ سیر اور آصف جاہ اوّل کے دور کا دکنی ادب کا نمونہ کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔آصف جاہ ثانی کے علمی و ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں نہ صرف اورنگ آباد ہی علم و فضل کا مرکز تھا۔ یہاں گولکنڈہ و بیجاپور کے اہل کمال کے ساتھ دہلی کے اہل کمال بھی موجود تھے بلکہ برہان پور اور حیدرآباد بھی شعر وسخن کے مرکز بن گئے تھے۔ خصوصاً آصف شاہ ثانی کے زمانہ میں جب حیدرآباد سلطنت آصفیہ کا دارلسلطنت قرار پایا تو اب دکن کے اہل کمال حیدرآباد ہی میں جمع ہوگئے اور ایک زمانہ آیا کہ برہان پور اور اورنگ آباد کی جگہ حیدرآباد ہی نے لے لی''۔(۱۰)

آصف جاہ اوّل سے لے کر آصف جاہ پنجم تک کے عہد کو مصنف نے بہ خوبی اور بطریق احسن پیش کیا ہے۔مصنف نے ان بادشاہوں کا اصل نام کنیت اور لقب کی تفصیل بھی پیش کی ہے۔میر عالم اور مہاراجہ چندولعل جیسے ذی علم وزراء کا تذکرہ بھی خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔

دکن میں اُردو کی خصوصیات یہ ہے کہ اس میں بیجاپور اور گولکنڈہ کے سرخیل بادشاہوں اور سلاطین کو تادمِ اُردو تاریخ میں مرقوم کر دیا گیا ہے۔عادل شاہی اور قطب شاہی دور، سلطنت آصفیہ کی تاریخ اور دیگر ادبی ادوار کو ایک جلد میں محفوظ کر کے مصنف نے اعلیٰ اور ارفع کام کر دکھایا ہے۔ان کی خصوصیت تاریخ نگاری کی روشن مثال ہے۔

دکن میں اُردو کے ساتویں دور میں آخری دور ۱۳۳۶ھ تا ۱۳۷۵ھ میں دکنی ادبی دور کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس میں ایک طرف سینکڑوں شعراء و ادباء کا ذکر ملتا ہے۔دوسری طرف جامعہ عثمانیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عصرِ گزشتہ میں دکن نے اُردو کی ترقی کے لئے اپنے ذہنی قویٰ جس سرگرمی سے کام میں لائے اور مال و دولت کے بے دریغ طریقہ سے صرف کیا وہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔اس دور میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کی وجہ سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا جس کا اختتام ۱۳۶۹ھ یا ۱۹۵۰ء میں ہوگیا''۔(۱۱)

یہ دور جنگ عظیم اول کا تھا۔اس میں برطانوی ہند میں علم و ادب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ نئے خیالات اور رجحانات نے اقبالؔ، جوشؔ، اکبرؔ، چکبستؔ، جگرؔ، اصغرؔ، فانی، شاداور مجاز لکھنوی سے لے کر ۱۹۶۰ء کے پاکستانی دور کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اس دور میں تحاریک اور ادبی انجمنوں کی بنیاد پڑی وہ بھی اس باب کا حصہ ہیں۔مصنف نے ترمیم و اضافے کے بعد جو کتاب پیش کی تھی ۹۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔آج اس کتاب کو''دکن میں اُردو'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔کتاب کا نام لیتے ہی نصیرالدین ہاشمی کا نام بے اختیار دل و دماغ میں آجاتا ہے۔

۲۔ پنجاب میں اُردو (حافظ محمود شیرانی)

حافظ محمود شیرانی نے اُردو زبان کے آغاز وارتقاء کے سلسلے کو علاقائی بنیادوں پر ثابت کرنے کی پہلی کوشش کی۔انہوں نے ''پنجاب میں اُردو'' کے ذریعے علاقائی تاریخ نویسی کی ابتداء کر کے مؤرخین کے لئے ایک نیا راستہ ہموار کیا جس کی بدولت ہندوستان کے مختلف علاقوں سے زبان کا ابتدائی تعلق ثابت کرنے کی عام کوششیں کی جانے لگی۔حافظ محمود شیرانی سے پہلے محمد حسین آزاد نے اُردو کو برج بھاشا کی ترقی یافتہ شکل کہا تھا لیکن شیرانی صاحب نے زبان کے آغاز کا سہرا پنجاب کے سر رکھ کر لسانیاتی تحقیق کی نئی بحث چھیڑ دی۔''پنجاب میں اُردو'' ۱۹۲۳ء میں تصنیف ہوئی۔اس کی اشاعت کے بعد سندھ، دکن، لاہور، دہلی، لکھنؤ اور دیگر علاقوں کے حوالے سے اُردو کے آغاز کی باتیں ہونے لگی۔ مؤرخین نے مختلف علاقوں کی مناسبت کو ثابت کرنے کے لئے سینکڑوں مضامین و مقالات اور کتب تالیف کیں۔یہ سلسلہ تقسیم ہند تک برقرار چلتا رہا۔اس طرح زبان اُردو کے آغاز وارتقاء کے نظریات تاریخ نویسی میں سب پر واضح ہوئے۔حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' ۱۹۲۸ء میں طبع ہوئی۔پاکستان بننے کے بعد دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔اس کا تیسرا مصدقہ ایڈیشن ڈاکٹر وحید قریشی کے حواشی اور ترتیب کے ساتھ پہلی بار ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔(۱۲)

کتاب کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر بعد میں اسے بہت سے اداروں نے شائع کیا۔یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔اسلامیہ کالج لاہور، انجمن ترقی اُردو کراچی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد اور دیگر پبلشنگ ادارے اسے خاص اہتمام کے ساتھ شائع کرتے رہتے ہیں۔اشاعت کے سیکڑوں ایڈیشن سے گزر کر اب یہ کتاب عالمی شہرت یافتہ بن چکی ہے۔ مؤرخین زبان وادب اسے لسانیاتی تحقیق کی پہلی کڑی سمجھتے ہیں۔

حافظ محمود شیرانی نے اسے مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے جس کے عنوان بالترتیب پنجابی اور اُردو، قدیم اُردو پر پنجاب کا اثر، برج بھاشا اور برج بھاشا کی خصوصیات، مسلمان اور ہندی زبانیں اور پنجاب میں اُردو ہیں۔اصل بات ''پنجاب میں اُردو'' کے باب میں کی گئی ہے۔کتاب کی پہلی اشاعت سے شیرانی صاحب مطمئن نہ تھے۔اس لئے اسے ضروری ترمیم و اضافے کے ساتھ اسلامیہ کالج لاہور سے طباعت کروایا اس ایڈیشن کے حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر شیرانی مرحوم جن دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں اُردو کے لیکچرار تھے۔علامہ عبداللہ یوسف علی (پرنسپل) کی خواہش پر انہوں نے ''پنجاب میں اُردو'' تحریر کی۔یہ کتاب اسلامیہ کالج لاہور کی انجمن ترقی اُردو سے پہلی دفعہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔حافظ صاحب اس کی اولین اشاعت سے مطمئن نہ تھے اور اسے از سرِ نو لکھنا چاہتے تھے۔چنانچہ پہلے ایڈیشن کے بعد بھی وہ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر کام کرتے رہے۔بعض مباحث پر انہوں نے الگ الگ مقامات کی صورت میں تفصیل

سے لکھا بھی اور اپنی کتاب کے بعض بیانات میں ترمیم و تنسیخ کر دی''۔(۱۳)

کتاب مذکورہ مختلف اوقات میں شائع ہوتی رہی۔ طویل عرصہ کے بعد مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے اساتذہ، محققین، طلباء اور ماہرین لسانیات کی سہولت کے لئے اس کتاب کو از سرِ نو ترتیب دے کر شائع کیا جسے بے حد سراہا گیا۔ یہ ایڈیشن ۳۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی بنیاد حافظ صاحب کے ذاتی نسخے پر رکھی گئی ہے۔ مقتدرہ قومی زبان سے پہلی دفعہ اسے ڈاکٹر وحید قریشی نے شائع کیا جو اب تک متعدد بار چھپ چکی ہے۔(۱۴)

علاقائی تناظر میں اُردو زبان کے آغاز کے نظریات ''دکن میں اُردو'' کے حوالے سے بھی سامنے آ چکے تھے لیکن شیرانی صاحب مرحوم کی کتاب سامنے آئی تو یہ رجحان مزید آگے بڑھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''برّصغیر میں مسلمانوں کی آمد کا عہد آفریں واقعہ ہوا تو کون سے خطے میں زبانوں کا پہلا انضمام عمل میں آیا اور اس خطے کی مقامی زبان کیا تھی؟ اس مسئلے نے اُردو زبان و ادب کی علاقائی حد بندی کی ضرورت کا احساس پیدا کیا اور اس کا آغاز نصیر الدین ہاشمی کی کتاب ''دکن میں اُردو'' سے ہوا جو ۱۹۲۳ء کی تالیف ہے۔ ۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' شائع ہوئی جس میں تاریخی عوامل، لسانی تجربے اور داخلی شواہد کی اساس پر بحث کی گئی۔''(۱۵)

شیرانی صاحب نے اُردو کے آغاز کو سرزمین پنجاب سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب مذکورہ میں انہوں نے شیخ فرید الدین گنج شکر سے لے کر جنگ آزادی تک کے مختلف شعراء و ادباء، ماہرین لسانیات اور ترقی اُردو کے دیگر کا عوامل کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اپنی تمام بحث میں انہوں نے قدیم پنجاب اور اُردو پر پنجاب کے اثرات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اُردو پر قدیم زمانوں سے پنجابی لہجہ غالب تھا اس کا ثبوت دنیا موجودہ حالات میں بہت دشوار ہے۔ اس لئے کہ ان ابتدائی زمانوں کے جب کے مسلمان ہجرت کر کے دہلی میں آباد ہوئے ہیں۔ نیز اس کے بعد کی تین صدیوں تک کے کوئی کتابی نمونے ہم کو نہیں ملتے۔ نہ ہم کو یہ علم ہے کہ اس عہد کی برج اور پنجابی میں کیا فرق تھا۔ بہرحال یہ زبان برج اور اس کی ہمسائیگی میں ایک عرصہ دراز تک رہنے سہنے کے باعث بدلنی شروع ہوئی ہے''۔(۱۶)

ڈاکٹر سید عبداللہ ''پنجاب میں اُردو'' کی حمایت کرتے ہوئے حافظ محمود شیرانی کے نظریے کی تائید میں لکھتے ہیں:

> ''دنیا میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی سیرت اور شخصیت میں قدرت بے شمار ایسے اوصاف و فضائل جمع کر دیتی ہے کہ ان میں سے ہر صفت تنہا بھی قبول عام و عظمت کی ضامن ہو سکتی ہے۔ پروفیسر شیرانی بھی انہی افراد میں سے تھے۔ استاد مرحوم کے کن کن کمالات اور خوبیوں کا شمار کیا جائے تو وہ بے نظیر استاد اور بے مثل مدرس تھے۔ بے عدیل محقق، اعلیٰ پائے کے مؤرخ اور عالی مرتبہ

نقاد۔۔۔۔غرض بہت سی قابلیتیں ان میں ایسی پائی جاتی تھیں جن میں ہر ایک پر الگ الگ مقالہ تیار ہوسکتا ہے۔'' (۱۷)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''اُردو زبان کا پہلا مایہ خمیر پنجاب میں تیار ہوا۔اس کا کھڑی بولی یا برج بھاشا والے نظریے سے کوئی تصادم نہیں۔ نہ دکن میں اُردو یا گجرات میں آغازِ تصنیف والے نظریے سے کوئی تصادم یا ٹکراؤ ہے''۔(۱۸)

حافظ محمود شیرانی کی تصنیف ''پنجاب میں اُردو'' ۱۹۲۸ء میں پہلی بار چھپ کر منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب انہوں نے اسلامیہ کالج کے پرنسپل ''علامہ عبداللہ یوسف علی'' کی فہمائش پر لکھی اور انتساب اپنے دیرینہ دوست سر شیخ عبدالقادر کے نام کیا۔(۱۹) مولوی عبدالحق کا مخالفانہ تبصرہ بھی ان کے رسالے سہ ماہی ''اُردو'' میں ۱۹۲۸ء کو شائع ہوا تھا۔شیرانی صاحب نے مولوی عبدالحق کے تبصرے پر سخت مایوسی کا اظہار کیا۔وہ ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء کو ڈاکٹر محی الدین قادری زور کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''پنجاب میں اُردو کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ان کے لئے آپ میرا شکریہ قبول فرمایئے۔عبدالحق صاحب کے تبصرے نے تو مجھے سخت مایوس کیا ہے۔ بلکہ میں اس کو بے داد سمجھتا ہوں''۔(۲۰)

پنجاب میں اُردو کی بحث بہت طویل عرصہ تک چلتی رہی۔مؤرخین نے اس بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ڈاکٹر سید عبداللہ، محمد اکرام چغتائی، محمد افضل جھنجانوی، علامہ محمد اقبال اور دیگر ادباء وشعراء نے بھی اس کی حمایت کی جبکہ محی الدین قادری زورؔ، سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق اور دیگر چند ادیبوں نے اس کی مخالفت کی۔حافظ محمود شیرانی نے ابواب بندی میں ان شعراء کی ایک طویل فہرست درج کی ہے جو براہ راست یا بالواسطہ پنجاب سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے زبان اُردو کی تعمیر وتشکیل میں حصہ لیا۔مثال کے طور پر ناصر علی سرہندی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پنجاب میں ناصر علی سرہندی کی غزلیں ایک وقت میں بہت مقبول تھیں اور اب بھی پرانی بیاضوں میں مل جاتی ہیں۔علی کا کلام فارسی ترکیبوں کی بناء پر محمد شاہی عہد کے شعراء کے کلام سے ممیّز ہے۔ بگر دروی ساجنؔ آں شوخ، بے پروا، بت فرنگی بقتل ہمنا، چوچشم نرگس اور چوتیر ناوک ایسی بندشیں ہیں جو قدیم شعرائے دہلی کے ہاں کمیاب ہیں۔ برخلاف اس کے پنجاب کے شاعر ایسی ترکیبیں لانے کے عادی ہیں۔'' (۲۱)

اسی طرح مشہور شاعر خوشدل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''نام محمد ابراہیم ہے اور لاہور کے مشہور اہل علم خاندان چشتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے والد قاضی

ضیاء الحق مع اپنے نامور بزرگوار مولانا نظام الدین و برادر خود بہاء الحق ایران سے ہندوستان آئے اور لاہور میں متصل گڑھی شاہو سکونت اختیار کی اور نواب خاں بہادر نے اپنے فرزند یحییٰ خان کا اتالیق مقرر کردیا۔۔۔چشتی خاندان تقریباً دو صدی سے اپنے علم وفضل کے لئے مشہور چلا آرہا ہے۔ رنجیت سنگھ کے عہد کا سب سے ضخیم روز نامچہ جو بیس بائیس جلدوں میں ہے۔اسی خاندان کا کارنامہ ہے''۔(۲۲)

اُردو کو کسی ایک علاقے سے منسوب کرنے کا کام حافظ محمود شیرانی کے نظریے کے بعد زیادہ تر اچھالا گیا۔ بہت سے مؤرخین اور محققین نے اپنے اپنے نظریات کھل کر بیان کئے۔کسی نے سندھ میں اُردو کا نظریہ پیش کیا تو کسی نے دکن میں اُردو کا۔اس طرح ایک طویل بحث چل پڑی اور محققین نے زبان کے نام پر تحقیق میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اسی طرح ادبی حلقے اپنی اپنی نسبت اور تحقیق کے مطابق مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔

حافظ محمود شیرانی کی تصنیف کی اہمیت اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود بھی بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ کتاب تاریخ کے ساتھ ساتھ تذکرہ نویسی کے تقاضے بھی پورے کرتی ہے۔مصنف موصوف نے کمال دانش مندی سے لسانی مباحث کے ذریعے سرزمین پنجاب کے شعراء کا مختلف تعارف،سوانحی حالات اور نمونہ کلام بھی درج کیا ہے۔آج یہ کتاب اساتذہ،طلباء،محققین، مؤرخین اور لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے معلومات کا مفید ذریعہ بنی ہوئی ہے۔

۳۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی شہرہ آفاق تصنیف ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' کا پہلا ایڈیشن مطبوعات ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں شائع ہوا۔ (۲۳) تقسیمِ ہند تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔اشاعت کے مراحل سے مسلسل گزرتے ہوئے کتاب کی اہمیت اور مانگ بڑھتی گئی۔متعدد اشاعتوں کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

''بھارت اور پاکستان میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے اور خاص طور پر بھارت میں چونکہ کسی اجازت کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ناشر کو مصنف کو کچھ ادا کرنے کی ضرورت تھی۔یہ رفتار زیادہ ہی تیز رہی۔چنانچہ ۱۹۸۵ء میں ہی اس کے دو ایڈیشن بھارت میں شائع ہوئے۔پاکستان میں ۱۹۶۵ء کے بعد نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع نہ ہوسکا جس کا بڑا سبب میری دوسری مصروفیات تھا۔تقاضوں اور نئے ایڈیشن کی اشاعت کی ضرورت کے احساس کے باوجود ۱۹۸۷ء سے پہلے یہ ممکن نہ ہوسکا۔(۲۴)

پاکستان میں اسے غضنفر اکیڈمی کراچی نے شائع کیا۔نظر ثانی شدہ مکمل تصنیف ۱۹۸۷ء کو شائع ہوگئی۔۲ جنوری

۱۹۸۷ء کومصنف نے اس کا دیباچہ طبع (جدید) کے عنوان سے تحریر کیا جس میں اشاعت اول سے لے کر ۱۹۸۷ء تک تقریباً نصف صدی کے قصے کو نشیب وفراز سے بیان کیا ہے۔ کتاب مذکورہ انتساب ریحان کے نام ہے۔(۲۵)

کتاب مذکورہ دس مختلف ابواب پر مشتمل ہے۔اس کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ لکھنوی تہذیب وتمدن، کلاسیکی شاعری، اصلاح زبان اور نکھار کے عوامل کی مکمل تفصیل دستاویز کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔کم وبیش لکھنوی دبستان کے دوسالہ دورِ شاعری کو تاریخ کے آئینے میں دکھایا گیا ہے۔آتش وناسخ کے دور سے لے کر داغ وامیر مینائی تک کے تمام شعراء کا مکمل تعارف، کلام اور کارنامے درج کر کے تاریخ میں ایک اہم موڑ کا اضافہ کیا گیا ہے۔۹۸۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی اہمیت وافادیت ہر قاری، نقاد، مؤرخ، محقق، مصنف اور مؤلف بخوبی جانتا ہے۔تواریخِ ادبیاتِ اُردو میں اپنی منفرد نوعیت کی وجہ سے اس کی خاص اہمیت ہے۔تصنیف تک لکھنے کے سبب کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''اس مقالہ کا عنوان ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' ہے اس میں کم وبیش دوسو سال کی اُردو شاعری کی تاریخ کو بیان اور اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔اس موضوع پر اب تک یکجا تفصیلی، تاریخی اور تنقیدی نظر نہیں ڈالی گئی۔۔۔۔۔۔اہم بات یہ ہے کہ اس عہد کے متعلق بہت سے امور اب تک صرف قلمی نسخوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔جن کو حسب امکان وضرورت یہاں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''(۲۶)

کتاب مذکورہ کا پہلا باب سیاسی اور تہذیبی پس منظر کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔لکھنوی تہذیب کے آغاز وارتقاء کے بارے میں تفصیل کے ساتھ معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ریاست ''اودھ'' کے فرماں رواؤں اور لکھنؤ کے باہمی روابط کو تاریخی حوالے سے ثابت کیا گیا ہے۔جہاں جہاں ضرورت پڑی وہاں حوالہ جات بھی درج کئے گئے ہیں۔

لکھنوی تمدن اور ایرانی تہذیب کے باہمی اشتراک کو اگلے باب میں پیش کیا گیا ہے۔ایرانی تہذیب کے اس خطے پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ مثالوں کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔تیسرے باب میں لکھنویت کیا ہے؟ اور اس کا خاص مزاج اور خطے کی شاعری کو مصنف نے تفصیلاً پیش کیا ہے وہاں کے شعراء اور عوام کے اس مخصوص لب ولہجہ کو اس باب میں بیان کیا گیا ہے۔ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے بھی اس کتاب کی طرح اپنی کتاب ''دہلی کا دبستان شاعری'' میں دہلوی شعراء کا مخصوص رنگ اور لب ولہجہ پیش کیا ہے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے کتاب مذکورہ میں لکھنوی شعراء اور لکھنوی تہذیب کا مخصوص رنگ پیش کیا ہے۔خصوصاً معاملہ بندی، تشبیہات، استعارات اور دلی سے آئے ہوئے شعراء کا منفرد شعری رنگ مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔

باب چہارم ''اودھ حکمرانوں کی شاعری'' کے عنوان سے ہے۔شجاع الدولہ، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ اور اختر کی شاعری، ادب نوازی اور اُردو دوستی کی تصویر دکھائی گئی ہے۔واجد علی شاہ کے ڈراموں پر خصوصی تبصرہ کیا گیا ہے جو منفرد

اورعمدہ ہے۔مصنف نے ریاست اودھ کے نشیب وفراز اور شام اودھ کے بجھتے ہوئے چراغوں کی مانند پڑنے والی روشنی بھی دکھائی ہے۔اس ضمن میں اودھ کی تاریخی وادبی اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

''مہاجرین شعرائے دہلی'' کے عنوان سے پانچواں باب تحریر کیا گیا ہے۔اس باب میں ان شعراء کا تذکرہ ہے جو دہلی کے اجڑنے سے سرزمین لکھنؤ کی طرف ہجرت کر کے آ گئے تھے۔ یہ مغل بادشاہوں کا دورِ انتشار تھا۔اس باب میں میرؔ، سوداؔ، میر حسن، میر مستحسن، میر قمرالدین، میر نظام الدین، مرزا جعفر علی حسرت، سید محمد میر سوزؔ، جراتؔ، انشاءؔ، مصحفیؔ، رنگینؔ اور نسیمؔ دہلوی کے حالات زندگی، نمونہ کلام، تنقیدی جائزہ اور منفرد خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔نمونہِ کلام خوبصورت اور کلاسیکیت کا شاہکار ہے۔باب ہذا کتاب کا طویل ترین باب ہے کیونکہ اس میں متذکرہ بالا شعراء کا مکمل تعارف درج کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ دہلوی رنگ جو لکھنؤ میں آ کر نئی سمت کی طرف چلا، اس پر بھی تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے۔

دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شعراء آتشؔ، ناسخؔ اور پھر مصحفیؔ کے لئے الگ الگ باب مختص کئے گئے ہیں۔جن کے مطالعے سے کتاب متذکرہ بالا کے نام صحیح معنوں میں واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ تینوں ابواب مصنف کی لکھنوی شاعری میں دلچسپی کا پتا دیتے ہیں۔شیخ امام بخش ناسخ اوران کا سلسلہِ دبستان لکھنؤ کے حوالے سے الگ باب میں ناسخ کے دس شاگردوں کے حالات و کوائف بھی اور نمونہ کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ناسخ اوران کے شاگردوں پر تحسین وآفریں کی عمدہ تحریر فاضل مصنف کے اعلیٰ شعری ذوق کا پتا دیتی ہے۔تاریخ کا تعارف کراتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> ''ناسخؔ کو اساتذہ لکھنؤ میں بڑا مرتبہ دیا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے ہی سب سے پہلے دلّی اور لکھنؤ کے دبستان شاعری کو مستقل حیثیت سے علیحدہ کیا اور لکھنؤ کی زبان وشاعری کو قواعد وضوابط کی سند دی۔ انہوں نے شاعری میں مجوزّہ اصولوں کو حتی الوسع ملحوظ رکھنے کی کوشش بھی کی۔زبان کی حک واصلاح میں ان کا بڑا درجہ ہے''۔(۲۷)

مصنف نے ناسخ کا جو نمونہ کلام پیش کیا ہے وہ کڑا انتخاب ہے۔قاری کو یہ گماں نہیں ہوتا کہ فلاں شعر بے محل ہے۔ کسی قسم کی تشویش ذہن میں نہیں آئی۔ناسخ کی غزل کے تین اشعار مثال کے مندرج ہیں:

لایا وہ ساتھ غیر کو میرے جنازہ پر
شُعلہ سا ایک جیبِ کفن سے نکل گیا
ساقی بغیر شب جو پیا آبِ آتشیں
شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا
سنسان مثل وادی غربت ہے لکھنؤ
شائد یہ کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا (۲۸)

شیخ امام بخش ناسخ نے اصلاحِ زبان کے حوالے سے جو کارنامے انجام دیے تھے ان کو عہد بہ عہد مثالوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایسے سینکڑوں الفاظ درج کئے ہیں جو میر وسودا کے دور میں تھے اور ترقی کر کے کیا ہو گئے۔ الفاظ کی مکمل تفصیل صفحہ نمبر ۴۳۶ تا ۴۴۳ پر درج ہے۔ ناسخ کے ایک ممتاز شاگرد خواجہ محمد وزیر کو فہرست میں اولیت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تلمیذانِ ناسخ کی اصلاحی کاوشوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

شیخ امام بخش ناسخ کے لئے الگ باب کا اہتمام کر کے مصنف نے آتش اور ناسخ کو ہم پلہ کر کے دکھایا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ادبی حلقے آتش اور ناسخ کا نام اکٹھا لیتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے، کیونکہ اگلے باب صرف حیدر علی آتش کی شخصیت اور شاعری کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ مصنف نے آتش کے شاگردوں کی جماعت کا تعارف بھی بخوبی کرایا ہے۔ دیا شنکر نسیم، سید محمد جان رند اور وزیر علی صبا کا تفصیلی تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ آتش کی شاعری اور شخصیت کو مستند حوالوں سے پیش کیا ہے۔ آتش کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آتش کا سرمایۂ شاعری ان کی غزلوں کے دو دیوان ہیں جن میں سب سے نمایاں موضوع عشق و محبت ہے۔ جس میں عشقِ حقیقی اور محبوب مطلق کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے''۔ (۲۹)

آتش کا نمونہ کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے ناسخ اور آتش کے نمونۂ کلام میں ایک دوسرے کے ہم پلہ اشعار مندرج کئے ہیں۔ ناسخ کے چند اشعار دئے جا چکے ہیں جبکہ آتش کے اشعار دیکھئے:

ہوا ہے عشق ہم کو اس کے حُسنِ پاک سے پیدا
کیا ہے نُور کے بُتوں کو جس نے خاک سے پیدا

خواہاں ترے ہر رنگ میں اے یار ہمیں تھے
یُوسف تھا اگر تو تو خریدار ہمیں تھے

دریا میں غسل کے لئے اترا جو وہ صنم
ناقوس مچھلیوں نے بجایا حباب کا (۳۰)

آتش کے بعد مصحفی کے باب میں مصنف نے غلام ہمدانی مصحفی کے تلمیذانِ ادب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ مصحفی کا تذکرہ پہلے دے کر اس باب میں صرف اس کے شاگردوں کی شاعرانہ صلاحیتوں کا احاطہ کیا ہے۔ مصحفی کے شاگردوں میں مظفر علی خان اسیر، امیر مینائی، احمد علی شوق قدوائی، ریاض خیر آبادی، مضطر خیر آبادی اور جلیل حسن جلیل کی شخصیت اور شاعری کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ مصنف نے سابقہ ابواب کی طرح اس باب میں بھی شعراء کا مکمل تعارف اور کلام کی تفصیل پیش کی ہے۔ لکھنوی شعراء کے سلسلے میں مصحفی کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے۔ بعض نام ایسے بھی ہیں جن سے لکھنوی رنگ کا سلسلہ آگے چلتا رہا۔

لکھنوی تہذیب کی تاریخ میں مرثیہ گوئی کی ترقی کی مثال کسی بھی دور میں نہیں ملتی۔ مصنف نے اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے باب نہم کو''لکھنؤ کی مرثیہ گوئی'' کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں مرثیہ کے آغاز وارتقاء کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ میر انیسؔ، اور مرزا دبیرؔ کی مرثیہ گوئی کو موضوعِ خاص بنایا گیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے انیسؔ و دبیرؔ کی شاعری اور شخصیت کا موازنہ بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''انیسؔ اور دبیرؔ ایک ہی زمانے اور ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں کا موضوع ایک ہے۔۔۔۔۔۔ ان کی بحث کو مولانا آزادؔ نے ایک دلچسپ مکالمہ کی صورت میں لکھا ہے لیکن وہ کسی کے حق میں فیصلہ نہ کر سکے اور نہ کسی کو ترجیح دے سکے۔ مولانا شبلی نعمانی نے ''موازنہ انیسؔ و دبیرؔ'' میں انیسؔ کو دبیرؔ پر ترجیح دی ہے''۔ (۳۱)

مرثیے کی تاریخ اور لکھنوی تہذیب میں مرثیے کا مقام ایک تاریخی دستاویز ہے جسے مصنف نے بڑے خوبصورت انداز میں زیبِ قرطاس کیا ہے۔ اس میں جرأت اور قابلیت کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا ہے۔ ہر بات ڈنکے کی چوٹ پر کہی گئی ہے۔ اس طرح ایک مکمل عہد کو اس باب میں رقم کر کے مصنف نے کمال جرات مندی اور دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔

آخری باب آخر دور کے لکھنوی شاعروں پر مشتمل ہے۔ امیر اللہ تسلیم، حسرتؔ موہانی، نظم طباطبائیؔ، صفی لکھنوی، ذاکر حسین ثاقبؔ، عزیز لکھنوی اور یگانہ چنگیزی اس باب میں شامل ہیں۔ آخر میں لکھنؤ کی تمام داستان کا مکمل اور جامع خلاصہ پیش کر کے مصنف نے تاریخ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ دبستانوں کی تاریخ نگاری میں اس کتاب سے ضخیم مجموعہ اور کوئی نہیں ہے۔ لکھنوی شعراء کے ساتھ ساتھ رسوم ورواج اور غالب رجحانات کی نشاندہی اچھے طریقے سے کی گئی ہے۔ تاریخ نویسی میں اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

۴۔ دہلی کا دبستان شاعری (ڈاکٹر نورالحسن نقوی)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے دبستانوں کی تاریخ نگاری کے حوالے سے جو طرح ڈالی اسے بعد میں بہت سے مؤرخین نے قبول کیا ور اپنی اپنی کتاب اس نوعیت کے عنوان کے تحت لکھیں۔ اس لئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی شہرہ آفاق تصنیف ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' دبستانوں کی تاریخ کی پہلی کڑی ہے۔ اس کی پیروی میں متعدد کتب شائع ہوئیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لاہور اور دوسرے بڑے مراکز کے دبستان شعر کی تاریخ نگاری اب تک ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی کی کتاب ''دہلی کا دبستان شاعری'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی نے کراچی سے شائع کی تھی۔ اگر چہ اس کا مسودہ شروع ۱۹۴۶ء ہی میں انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی کو دے دیا گیا تھا

لیکن اس وقت کے سیاسی حالات بہت ابتر تھے۔(۳۲) مصنف کی خوش قسمتی یہ تھی کہ مولوی عبدالحق ہندوستان سے جو بچا کھچا سرمایہ کراچی میں لائے تو اس میں یہ کتاب بھی شامل تھی۔مصنف کتاب کے دیباچہ (طبع دوم) میں اس صورت حال کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مولوی عبدالحق صاحب مرحوم دوسری کتابوں کے ساتھ اس کتاب کی لکھی ہوئی کا پیاں بھی کسی نہ کسی طرح پاکستان لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسے وہاں سے شائع کیا۔۔۔۔اب اس ایڈیشن میں آخری باب جو پہلے ادھورا شائع ہوا تھا اسے مکمل صورت میں پیش کیا جارہاہے''۔(۳۳)

مصنف نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اس مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس لئے اس کا انتساب بھی علی گڑھ کے نام ہے۔ مقالے میں مصنف نے تصدیق کی ہے کہ یہ کتاب شعرائے دلی کا تذکرہ یا سوانح نہیں بلکہ زبان و ادب اور تاریخ کے اصولوں پر لکھی گئی ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''یہ مقالہ دلی کے شعراء کا تذکرہ نہیں ہے اس لئے اس نظر سے نہ دیکھا جائے۔اس میں صرف اس بات کو واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ دہلویت کیا ہے؟ اور اسی سوال کے جواب میں ضمناً وہاں کے شعراء، وہاں کے تہذیبی ماحول اور وہاں کی زبان وادب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ان ضمنی مسائل کو اصلی موضوع کا فروغ سمجھنا چاہئے اصل نہیں۔''(۳۴)

مقالہ ہٰذا کتابی صورت میں شائع ہو کر سات ابواب میں تقسیم ہے۔جن میں دہلی کی سیاسی، معاشی،سخن دانی، موضوعات،شعری لبستی،اور دہلویت کی زبان پر گفتگو کی ہے۔دہلی کی مختصر تاریخ کے آئینے میں اُردو شاعری جس طرح پروان چڑھی وہ تقریباً ۱۵۰ سال کے عرصے پر محیط ہے۔مصنف نے اس عرصے کو بیمار کے ڈراؤنے خوابوں سے تعبیر کیا ہے۔اس کے علاوہ پریشانیاں، بدنظمی،فسادات،انتشار اور ہر چیز اتھل پتھل ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔دلی میں شعروشاعری کا جو چرچا تھا مصنف نے اسے مخصوص باب میں پیش کر کے دلی کی شاعری،تصوف،مشاعرے اور قوالیوں کے حوالے سے اہم ناموں کا تفصیلی ذکر کر دیا ہے۔اس کے علاوہ ان مخصوص الفاظ کی فہرست بھی دی ہے جسے اہلِ دلی بطور تشبیہات و استعارات استعمال کرتے تھے۔اہم الفاظ چشمہ،آب رواں،سبز سراب،صرصر،بادِ صموم،نخل،مجنوں،وحشت،رقص،سماع،ساقی،صبوحی،نغمہ، فغاں،تمنا،حسرت اور حرماں وغیرہ ہیں۔مصنف نے الفاظ کی طویل فہرست پیش کی ہے۔اس کے علاوہ دلی اور لکھنؤ کے شاعرانہ مزاج،رجحانات اور اصلاح زبان کے سلسلے میں ہونے والی ترقی کا موازنہ بھی کیا ہے۔اس حوالے سے کہتے ہیں:

> ''دہلویت نام ہے ایک نقطہ نظر،ایک افتاد ذہنی،ایک مزاجِ شعری کا جسے سمجھنے کے لئے لکھنؤیت سے قدم قدم پر مقابلہ کرنا ہوگا۔یہ اختلاف دراصل آصف الدولہ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے جبکہ دہلی بگڑ چکی تھی اور دیگر فن کاروں کی طرح شعرا بھی اپنا ملجا و ماوا دوسرے مقامات میں تلاش کر رہے

تھے۔'' (۳۵)

میرؔ، دردؔ، سوداؔ اور معاصرین کے شب وروز، مشاعروں کا حال اور ادبی رجحانات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ولی دکنی اور ریختہ کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ ایہام گوئی کی تحریک کے نشیب وفراز کے تذکرہ کی تفصیل ہے اس کے بعد متاخرین غالبؔ، ذوقؔ، ظفرؔ، داغؔ اور امیرؔ مینائی کے ادوار کی بھی بھرپور انداز سے عکاسی کی گئی ہے۔ شعراء کے ادبی معرکوں خصوصاً انشاء مصحفی اور آتش و ناسخ کے عہد ساز معرکوں کو ندرت اور لطافت کے ساتھ پیش کر کے دہلی اور لکھنؤ کی مجموعی فضا کا آئینہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی طرح دہلی کی مجموعی فضا کو دستاویزی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس طرح آج ادبی تاریخ میں دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ادبی مؤرخ جب موجودہ دور میں تاریخ نویسی پر قلم اٹھائے گا تو دہلی اور لکھنؤ کی ادبی فضاء کو سنہری حروف میں لکھے گا، جس کا سہرا ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے سر ہے۔ کتاب مذکورہ کو سات ابواب میں بڑے سلیقے سے تقسیم کر کے مختلف جہات کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ آخری باب ''دہلی کی زبان'' کے عنوان سے ہے۔ اصلاح زبان کے سلسلے میں جن پانچ ادوار کا اکثر اوقات ذکر کیا جاتا ہے مصنف نے انہیں آخری باب میں بیان کیا ہے۔ ریختہ کی دو تحریکیں، ولی دکنی کا دور، میر وسودا کا دور اور دبستانِ لکھنؤ کے دور تک اُردو ادب اصلاحِ زبان کے پانچ مراحل سے گزر کر ایک مکمل اور جامع ادب کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس ساری تفصیل کو آخری باب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ آخری دو ادوار کے حوالے سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے مزاج کا خوب موازنہ کیا گیا ہے۔ الفاظ کی فہرست، کتابیات اور شعرائے دہلی کا اشاریہ بھی بنایا ہے۔ ۵۰۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس کے متعدد ایڈیشنز سے لگایا جا سکتا ہے۔ شمالی ہند کے شعری ادب کی مستند تاریخ کتاب مذکور سے بہتر کوئی نہیں۔ گزشتہ چھ دہائیوں میں محققین، ادباء اور مؤرخین کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی اس کتاب کو ملکی و بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔

۵۔ اُردوئے قدیم (دکن اور پنجاب میں) ڈاکٹر محمد باقر

ڈاکٹر محمد باقر کی ادبی تاریخ ''اُردوئے قدیم'' (دکن اور پنجاب میں) کا تاریخی انداز روایتی تاریخ نگاری سے مختلف ہے۔ انہوں نے دکن اور پنجاب میں اُردو زبان کی ابتدائی نشونما کے حوالے سے مختلف نوعیت کے مضامین ومقالات لکھ کر ان کو ترتیب دیا ہے۔ مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار اگست ۱۹۷۲ء میں مجلسِ ترقی ادب لاہور (اشاعتی ادارے) سے شائع ہوا۔ (۳۶) اس کتاب کی ابواب بندی نہیں تھی جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے اس لئے مصنف نے مضامین کی ترتیب پر اکتفا کیا ہے۔ گیارہ مضامین کو بجائے ابواب بندی میں تقسیم کرنے کے نام کے ساتھ فہرست میں شامل کیا

گیا۔مضامین میں زیادہ تر ادبی، سماجی، تاریخی اور لسانی حوالوں سے بحث کی گئی ہے۔ پہلے دو مقالے زبان کی تاریخی اہمیت کو سمیٹتے ہوئے ہیں۔اس لئے انہیں لسانی مباحث کا نام درج کیا گیا ہے۔ باقی مضامین کو''کمیاب متون'' کے نام لکھا گیا ہے۔

پہلے دو مقالے لسانی مباحث کے عنوان سے ہیں جن میں اُردو، ہندوستانی، ہندی یا ہیتہ ہندوئی اور قدیم فارسی فرہنگوں میں پیش آزآریائی کلمات شامل ہیں۔ باقی مضامین کمیاب متون کے عنوان سے ہیں جن میں اُردوئے قدیم کے متعلق چند تصریحات، احسن القصہ (یوسف زلیخا) سید یوسف علی خاں یوسف کی ہندو تصانیف، مجموعہ بارہ قصہ، جرمن شاعر فراسو کا قصہ عشق افزا، مثنوی زہرہ و بہرام، مثنوی نیرنگ مملکت چین یا قصہ دلارام، قصہ مہتاب شاہ و شہزادہ صف شکن، مرادالمحبین وغیرہ شامل ہیں۔ (۳۷)

کتاب مذکورہ میں شامل تمام مضامین کو مصنف نے جب یکجا کر دیا تو ان کی تاریخی حیثیت مسلمہ ہوگئی۔ کہیں کہیں مختلف مؤرخین کے بیانات کے جوابات بھی دیے گئے ہیں۔ایک جگہ پر ڈاکٹر نذیر احمد کے مضمون کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر نذیر احمد نے مجلّہ اُردو میں قدیم فارسی فرہنگوں کے سلسلے میں لسانی اعتبار سے ایک نہایت اہم بحث چھیڑی ہے اور ان فرہنگوں میں ''اُردو عناصر'' کی نشاندہی کرنے کا ادعا کیا ہے۔لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مضامین میں قدیم فارسی فرہنگوں میں ''اُردو عناصر'' کا عنوان قائم کرنے کے بعد اس زبان کو اُردو کہنے سے خائف ہو گئے ہیں''۔(۳۸)

مصنف نے زبان اُردو کو ایک طویل بحث کے بعد پنجابی زبان سے منسلک کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ضمن میں فارسی اور پنجابی کے ملتے جلتے اور مشترکہ الفاظ کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں مختلف نوعیت کے نو مضامین و مقالات شامل ہیں۔اہم ترین مضمون ''مجموعہ بارہ قصہ'' کا تذکرہ کیا ہے۔جس میں اُردوئے قدیم کی چند مثنویوں کی نشان دہی کی گئی ہے مصنف نے اس مضمون میں آٹھ قصوں کا تذکرہ کیا ہے۔جس میں عہد اور سال تصنیف کی تفصیل درج کر کے تاریخ کو ایک نئے باب سے روشناس کرایا ہے۔ ہر قصے کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔جس سے قاری کی دلچسپی کا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ادبی تاریخ میں ایسا کم ہوا ہے کہ مؤرخ نے چند اصل مخطوطوں کی نشاندہی کی ہو اور انہیں مضامین کی شکل دے کر قارئین ادب کے لئے تسکین کا سامان پیدا کیا ہو۔ کتاب کے منظر عام آنے سے ایک تو منفرد نوعیت کی تاریخ میں اضافہ ہوا ہے دوسرا یہ کہ ادبی تاریخ کی ابتدائی معلومات بیان کر کے قدیم ادبی تاریخ میں روشن باب کا اضافہ کیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کتاب کی اہمیت بڑھتی گئی اور آج تحقیقی اور ادبی سکالر اس کتب کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔

آخر میں کتابیات کا اہتمام کر کے مصنف نے اپنے محققانہ اسلوب اور تحقیقی سوچ کا ثبوت دیا ہے۔حوالہ جات ہر صفحہ کے آخر میں درج کئے گئے ہیں۔ یہ طریقہ اس دور میں مروج تھا۔آج کل حوالہ جات و حواشی باب کے آخر میں دئے

جاتے ہیں۔قدیم دکنی اور پنجاب کے ان مقامات کا اشاریہ بھی مرتب کیا گیا ہے۔جن کا ذکر مضامین میں آیا ہے۔اس کے علاوہ ناموں کا اشاریہ بھی مختصر تعارف کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے جو کتاب کی اہمیت کو مزید واضح کر دیتا ہے۔

۶۔ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد اوّل)

پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ''تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' کا باقاعدہ شعبہ تشکیل دے کر اس میں برصغیر پاکستان و ہند کی تمام علاقائی زبانوں کی تاریخ اور ارتقاء کے لئے تحقیق کا آغاز کیا۔اس سلسلے میں زبان اُردو کے آغاز وارتقاء کی مکمل داستان کو بھی ایک خاص منصوبہ بندی سے محفوظ کرنے کا کام شروع کیا۔اس سلسلے میں آغاز سے لے کر تقسیم ہند تک پانچ جلدیں تالیف کی گئیں۔یہ منصوبہ ۱۹۷۲ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔(۳۹)

جولائی ۲۰۰۸ء میں جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران کے دور میں جملہ پانچ جلدوں پر نظر ثانی کا کام شروع کیا گیا جس کی سربراہی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے سپرد ہوئی۔۳۱ مئی ۲۰۰۹ء کو یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔جس کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران وائس چانسلر جامعہ پنجاب رقمطراز ہیں:

> ''تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند پنجاب یونیورسٹی کا اہم شعبہ تھا جس نے برصغیر میں عربی، فارسی، اُردو بنگالی اور معروف علاقائی زبانوں کی ادبی اور تہذیبی تاریخ نویسی کا کام چودہ جلدوں میں بخوبی انجام دیا تھا۔اس منصوبے کی تکمیل کو اب تقریباً چار دہائیاں گزر چکی ہیں اس لئے میری خواہش تھی کہ اس شعبے کو ازسرِ نو زندہ کیا جائے تاکہ اشاعتِ اول کی تمام جلدیں نظر ثانی کے مراحل سے گزرنے کے بعد پھر سے طبع کرائی جاسکیں۔چنانچہ اس منصوبے کی سربراہی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے سپرد کی گئی ہے جو اس کام کے لئے موزوں ترین شخص ہیں۔جولائی ۲۰۰۸ء سے اس شعبے نے دوبارہ کام کا آغاز کیا ہے۔ترجیح اوّل کے طور پر اُردو ادب کی پانچ جلدوں پر نظر ثانی کا کام شروع کیا گیا ہے۔مقامِ مسرت ہے کہ جلد اوّل ترمیم و تنسیخ و تصحیح کے جملہ مراحل سے گزر کر اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔مجھے امید ہے کہ جملہ قارئین اسے پہلے سے زیادہ مفید پائیں گے''۔(۴۰)

پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران تدریس کے ساتھ تحقیقی منصوبوں میں اضافے اور ان کے معیار کی بہتری کے لئے کوشاں ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند کی جلدوں کی نظر ثانی کے مراحل سے گزرنے کے بعد پھر سے طبع کرائی جاسکیں تاکہ قارئین پہلے سے زیادہ مستفید ہوسکیں۔

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند کی پہلی جلد آغاز سے معاصرین ولی تک کی اُردو زبان و ادب کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔۳۷۰ صفحات پر مشتمل اس جلد کی قیمت ۵۰۰ روپے رکھی گئی ہے۔کتاب مذکورہ گیارہ ابواب پر مشتمل ہے جو

بالترتیب سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر، اُردو کی پیدائش وارتقاء اصنافِ سخن، اُردو زبان وادب کے ابتدائی نمونے مشائخ اور دوسرے مصنفین، دکنی اور گجراتی ادب، ادبیاتِ گجرات، ادبیاتِ گولکنڈہ، ادبیاتِ بیجاپور، ولی اور ولی کے معاصرین پر مشتمل ہے۔ ہر کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔(۴۱)

تمام جلدیں کسی مصنف یا ادیب کی کاوش نہیں بلکہ برصغیر پاک و ہند کے مختلف اساتذہ، محققین، مؤرخین اور اسکالرز نے اس میں حصہ لیا ہے۔ عموماً ہر باب کسی ایک شخص سے لکھوایا گیا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ترتیب وتدوین کا مرحلہ بخوبی انجام دیا ہے۔ تاریخ ادبیاتِ اُردو پر مختلف اربابِ قلم نے اچھی خاصی ضخیم کتابیں لکھی ہیں جن کا معیار اور نوعیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے۔(۴۲) اس سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی کا یہ کارنامہ باقی تمام تواریخ سے بازی لے گیا ہے۔ تمام تر بیانات مکمل چھان بین کے بعد دئے گئے ہیں جو عام مؤرخین کی کتب کے مقابلے میں مستند ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اُردو زبان کی پیدائش اور ارتقاء کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''زبان کی پیدائش کے بارے میں کوئی قطعی اور مُسکِت بات کہنا اس لئے مشکل ہے کہ یہ کسی وقت معینہ پر پیدا نہیں ہوئی بلکہ سماجی ضرورت کے تحت ایک طویل عمل سے وجود میں آتی ہے اور سماجی تقاضوں کے سبب اس میں تغیر وتبدّل کا عمل شعوری اور غیر شعوری دونوں سطحوں پر جاری رہتا ہے۔ اس لئے محققینِ لسانیات کے نزدیک جب کسی خاص زمانے میں کسی زبان کی شکل کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا کہ اس زمانے میں زبان ارتقاء کی کس منزل پر تھی۔ بڑے بڑے سیاسی اور سماجی انقلابات اس ارتقائی عمل کی شدت کو متاثر کرتے ہیں اور ان سے گزرنے کے بعد زبان میں جو نکھار آتا ہے اسے ارتقاء کی کسی نئی منزل سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُردو کی پیدائش اور ارتقاء کے مسئلے کو بھی لسانیات کے اسی بنیادی اصول کے تحت دیکھنا چاہیئے''۔(۴۳)

اس طرح جلد اول کے گیارہ ابواب مختلف مؤرخین، محققین اور اساتذہ نے لکھے ہیں۔ تمام حوالے اور ماخذ ایک خاص ترتیب سے دئے گئے ہیں۔ اسی طرح ادبیاتِ گولکنڈہ کا تعارف دیتے ہوئے حمید الدین شاہد اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری رقمطراز ہیں:

> ''گولکنڈہ کی تہذیب دکن کی دوسری مسلمان ریاستوں سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اس لیے کہ چودھویں صدی کے شروع سے تمام علاقے میں مسلمانوں کا عمل دخل شروع ہو گیا تھا اور سلطان محمد تغلق کی وفات (۱۳۵۱ء) کے بعد جب بہمنی سلطنت کی بنیاد پڑی تو اسلامی روایات کی تجدید ہی نہیں ہوئی بلکہ ان کا استحکام بھی ہوا۔ یہ عمل کوئی ڈیڑھ سو سال تک جاری رہا۔ چنانچہ جب گولکنڈہ اور دوسری اسلامی ریاستیں یعنی احمد نگر، بیجاپور وغیرہ قائم ہوئی تو اسلامی شعائرِ زندگی کو شمالی دکن میں رائج ہوئے کوئی دو سو سال ہو چکے تھے بہرحال سلاطین گولکنڈہ نے نہ صرف مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے

ساتھ بلکہ ہندوؤں کے ساتھ بھی مساوی سلوک کیا۔ انہیں ہر قسم کی سیاسی، ثقافتی اور مذہبی آزادی دی۔'' (۴۴)

زبان و ادب کی تحقیق میں پنجاب یونیورسٹی کی خدمات کتاب مذکورہ اور باقی جلدوں کے علاوہ اور بھی بہت زیادہ ہیں۔ مثال کے طور پر آغاز سے لے کر آج تک یہ یونیورسٹی ستر سے زائد اسکالرز کو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دے چکی ہے اور یہ کام جاری ہے۔ سید معین الرحمٰن پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقی اور تاریخی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سب سے زیادہ تحقیقی کام پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ہوا جہاں ستر سے زیادہ سکالرز کو اُردو میں پی ایچ ڈی کی اسناد تفویض ہو چکی ہیں۔ تحقیقی کام کی جو آسانیاں اور قدیم و باثروت کتب خانوں کی جیسی سہولتیں لاہور میں میسر ہیں اس کے پیشِ نظر کام کی یہ رفتار اور زیادہ بہتر اور اطمینان بخش ہو سکتی تھی، اگر ماضی میں مجاز رویے مثبت ہوتے اور نو آموز واردانِ تحقیق کی حوصلہ شکنی نہ ہوتی''۔ (۴۵)

پنجاب یونیورسٹی نے تاریخ نویسی کے اس کام کو یکجا کرنے کا جو کام کیا وہ لائق ستائش ہے۔ یہ ایسا کام ہے جس کی تکمیل میں سینکڑوں مشکلات در آتی ہیں لیکن تاریخِ ادبیات کے مؤلفین نے کمال جرات مندی سے یہ کام مکمل کر کے تاریخ نویسی کی روشن مثال قائم کی۔ پہلی جلد کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ اس میں تاریخ زبان اُردو کے ابتدائی نقوش اور نشو و نما پر تفصیلی مباحث کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زبان کو مولد وہی ہوتا ہے جہاں وہ بلا شرکتِ غیرے بولی جائے۔ پنجاب، اودھ، دکن، بہار، گجرات، بمبئی، وسط ہند جہاں کہیں اُردو کا سکہ چلتا ہے اُردو کے پہلو بہ پہلو دوسری زبانیں بھی ہیں۔ کہیں اُردو تہذیبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ بول چال کی زبانیں اور ہیں۔ کہیں اُردو کے ساتھ دوسری زبانیں بھی بولی جاتی ہیں کہیں شہر کی زبان اُردو ہے اور دیہات کے باشندے مقامی زبان بولتے ہیں لیکن یوپی کے مغربی اضلاع میں اُردو کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں۔ صرف اُردو ہے جو شہروں اور دیہاتوں میں عام طور پر بولی جاتی ہے۔ یوپی کے مغربی اضلاع میں ہندو مسلمان سب اُردو بولتے ہیں''۔ (۴۶)

''تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' کی پہلی جلد اس حوالے سے اہم ہے کہ اس میں اُردو زبان و ادب کے تشکیلی اور اصلاحی دور کی مکمل تفصیل درج کی گئی ہے۔ تاریخ کے قارئین اور طلباء کی رہنمائی کے لئے یہ جلد بہت ہی مفید اور کارآمد ہے۔

۷۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد دوم)

تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند کی دوسری جلد میں اٹھارویں صدی عیسوی کے ادبی، فکر، سیاسی اور سماجی حالات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ یہ جلد بھی مشاہیرِ ادب، محققین اور مؤرخین کی باہمی مساعی کا نتیجہ ہے۔ اس میں ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۸۰۳ء کے تمام ادبی رجحانات اور ترقی اُردو کی داستان پیش کی گئی ہے۔

مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ ۱۷۰۷ء کو ختم ہوا تھا اس لئے پہلے باب میں مغل حکومت کے سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اورنگزیب عالمگیر کے بعد مغل حکومت دورِ انتشار شروع ہوا تھا اس لئے یہ تمام داستان پہلے باب میں درج کی گئی ہے۔ مغل حکومت کے زوال کا سب سے بڑا سبب اقتصادی بدحالی تھا جس کے نتیجے میں انگریزوں کی برصغیر میں آمد ہوئی۔ بادشاہ اور شہزادے مفلسی کا شکار ہوئے۔ رہی سہی کسر نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر کے پوری کر دی۔ مغل بادشاہوں کی مجبوری اور بے حسی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں:

> ''نادر شاہ نے دہلی میں قتلِ عام ہونے کے بعد جب اپنے منجھلے بیٹے کی شادی محمد شاہ رنگیلے کی بیٹی سے رچائی تو گھر گھر طبلے کھڑکنے لگے۔ ناچ، رنگ، جلسے، دعوتیں، جہاں دیکھو محفلِ رقص و سرور برپا ہے۔ بھانڈ اپنے ہی سپاہیوں اور سرداروں کی نقلیں دکھا رہے ہیں، تماشائی شرمانے کی بجائے قہقہے لگا رہے ہیں۔'' (۴۷)

مذکورہ جلد میں برصغیر کی اٹھارویں صدی کے ادبی دور کو تیرہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کی ترتیب میں سیاسی پس منظر، ادبی منظر، ایہام گو اور دیگر شعراء، مرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر، خواجہ میر درد، دیگر دہلوی شعراء، نظیر اکبر آبادی، اُردو شاعری میں لکھنؤ نمبر (۱)، اُردو شاعری میں لکھنؤ نمبر (۲)، لکھنوی شاعری کی دو منتخب اصناف، شاعری کے بیشتر مراکز اور نثر نگاری جیسے عنوانات دیئے گئے ہیں۔ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی فکری، شعری، لسانی اور ادبی جہات کو زیرِ نظر جلد میں سمویا گیا ہے۔ ایہام گوئی تحریک اور مغل حکومت کے دورِ زوال کو بھی ادبی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ایہام گو اور دیگر شعراء کا باب ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا تحریر کردہ ہے۔ وہ ایہام گو شعراء کا تعارف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایہام گوئی کے رجحان کی ابتداء محمد شاہی عہد کے آغاز کے ساتھ ہوئی اور معنی یابی و تلاشِ لفظ کے اس رجحان نے اُردو شاعری کی شعریت اور تغزل سے بہت حد تک عاری کر دیا۔ اس رجحان کے خلاف ردِ عمل بھی محمد شاہ بادشاہ ہی کے آخرِ دورِ حکومت میں شروع ہو گیا۔'' (۴۸)

مذکورہ جلد میں اُردو شاعری کے زریں دور پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ سودا، میر درد، نظیر اور دیگر دہلوی شعراء کے لئے الگ الگ باب مختص کئے گئے ہیں۔ عام تاریخوں میں ان شخصیات کو ایک باب میں ضم کر دیا جاتا ہے لیکن اس جلد میں تفصیلی

معلومات کے ہر اہم شاعر و ادیب کے لئے الگ باب مختص کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ میر تقی میر کی شخصیت اور شاعری کا نقشہ کھینچتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''میر تقی میر حد درجہ نازک مزاج آدمی تھے۔ ذاتی زندگی کے حوادث اور اجتماعی درد و غم نے ان کی دل شکستگی کو غم پسندی بلکہ ایذا پسندی کی شکل دے دی تھی۔۔۔۔۔ انہوں نے غزل کو شدید شخصی احساسات کا ترجمان بنایا۔اس کے لیے فطری زبان استعمال کی۔ ایسے اشارے وضع کئے جو خاص و عام کے لئے قابلِ فہم بھی تھے اور خیال انگیز بھی۔ انہوں نے غزل میں ذاتی غم کے ساتھ ساتھ اجتماعی غم کو بھی جذب کیا۔عوام الناس کے لہجے میں باتیں کیں مگر غزل میں وہ رنگ بھی اُبھارے جو خواص پسند تھے۔''(۴۹)

کتاب مذکورہ کی اہمیت و افادیت اس لئے بھی مسلم ہے کہ اس کی تیاری میں مختلف شخصیات نے حصہ لیا ہے اس لئے یہ پسند و ناپسند کے عناصر سے پاک و صاف ہے۔ مرزا محمد رفیع سوؔدا کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے کیا ہے لکھتے ہیں:

''سودا کے ہم عصر تذکرہ نگار سب اس بات پر متفق ہیں کہ وہ خوش خلق، خوش خو، یار باش، شگفتہ رو اور ظریف طبع و حریف وضع واقع ہوئے تھے۔ ایسا شخص اگر ساتھ ہی قادر الکلام شاعر بھی ہو جیسے کہ سودا تھے تو لازماً عوام اور خواص دونوں میں یکساں مقبول ہوگا۔''(۵۰)

پنجاب یونیورسٹی کی ان تمام جلدوں میں مضامین نگاروں نے تحقیق کے تمام طریقوں سے استفادہ کر کے اپنے اپنے مقالوں مین مآخذات اور حوالہ جات کا خاص اہتمام کیا ہے۔ تمام واقعات باقاعدہ تحقیق و ترتیب کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ تمام مضامین و مقالہ جات کا انداز پی ایچ ڈی کی سطح کے مقالہ جات جیسا رکھا گیا ہے۔ ایک ایک واقعہ کو مختلف حوالوں سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ بیان میں مبالغہ آمیزی شامل نہ ہو مثال کے طور پر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے قائم چاندی پوری کی شخصیت اور شاعری کا تعین کرتے ہوئے بیسیوں حوالے دیئے ہیں۔ اس طرح ہر محقق نے یہی روش اختیار کی ہے۔ قائم چاند پوری کا تعارف، مقام و مرتبہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف لکھتے ہیں:

''قائم کے بارے میں قدیم تذکرہ نگاروں کے بیانات مختلف ہیں اور یہ مسئلہ اب تک متنازعہ فیہ ہے۔ معاصر تذکرہ نگاروں میں میر تقی میر، سید فتح علی گردیزی اور میر حسن نے ان کا نام محمد قائم لکھا ہے۔ مصحفی اپنے پہلے تذکرے عقدِ ثریا میں ان کا نام محمد قائم اور تذکرہ ہندی میں قیام الدین علی بتاتے ہیں۔ مخزنِ نکات میں خود قائم کا بیان بھی اختلافِ نسخ کی وجہ سے مشکوک ہے کیونکہ مخطوطہ ''مخزنِ نکات'' مخزونہ انڈیا آفس لائبریری میں قیام الدین علی اور انجمن ترقیِ اُردو کے مطبوعہ نسخے میں قیام الدین درج ہے۔ تعینِ نام کی بحث میں جن محققوں نے حصہ لیا ہے ان میں سے مولوی

عبدالحق، ابومنعم سعیدی اور ڈاکٹر اقتدا حسن اس امر پر متفق ہیں کہ ان کا نام محمد قیام الدین تھا۔ مولانا
امتیاز علی عرشی اور اثر رام پوری نے یہ رائے قائم کی ہے کہ خاندانی ناموں کی رعایت سے ان کا نام محمد
قائم ہونا چاہیئے۔''(۵۱)

مندرجہ بالا اقتباس میں صرف نام کے تعین کی بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد کی تحریر میں قائم چاند پوری کے حسب نسب، پیدائش اور علاقے کے حوالے سے معلومات دی گئی ہے۔ آفرین اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ مقالہ نگار نے صرف مندرجہ بالا اقتباس جو صرف نام کا تعین کرتا ہے اس میں ۱۲ حوالوں کا انتظام کیا ہے جو ان کی قابلیت اور پنجاب یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی اس طرف توجہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

تمام جلدوں میں محققین نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے جو نو واردانِ علم و ادب اور تحقیق کے لئے معلومات کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق آٹھویں باب میں نظیر اکبر آبادی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہماری شاعری کا بیش تر خمیر حسن و عشق سے ہے اور ان کا بیان نظیر کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی نظموں میں روایتی مضامین بہت کم ہیں دوسرے ان کے احساسِ حسن میں تصوّریت کا عنصر بہت کم ہے اور اس میں جسمانیت اور ارضیت کا پہلو نمایاں ہے۔ ظاہر ہے کہ نظیر اکبر آبادی دنیا و مافیہا کو جمالیاتی نقطہء نظر سے دیکھتے ہیں۔ مثلاً بازارِ حسن کی طوائف کی چمک دمک، اس کا حسن و جمال، اس کے خد و خال، اس کی عشوہ طرازیاں، غمزہ و ادا، ملبوسات اور زیورات کی دلفریبیاں ان کے لئے بہت جاذبِ نظر ہیں اور وہ انہیں بڑے شوق سے بیان کرتے ہیں مگر اس بیان میں داخلی احساسات کا عنصر بہت کم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے طوائف کی سج دھج اور زیبائش اور جاذبیت کو معاشرے کے ایک دستور کے طور پر پیش کیا ہے۔''(۵۲)

دبستانِ لکھنؤ کے حوالے سے تین ابواب مختص کئے گئے ہیں۔ باب نہم میں اُردو شاعری لکھنؤ میں جس میں مہاجر شعراء میر حسنؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، جعفر علی حسرتؔ اور سعادت یار خاں رنگینؔ کے کلام، فن اور حیات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ دسواں باب آتشؔ و ناسخؔ اور ان کے تلامذہ کی معلومات سمیٹے ہوئے ہے۔ لکھنوی مرثیہ اور ریختی کی شاعری گیارہویں باب میں پیش کی گئی ہے۔ عہد لکھنؤ کو بیان کرنے کے لئے ڈاکٹر ابواللیث کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ ان ابواب میں ان کے چار مقالے شامل ہیں جو ان کی کتاب لکھنؤ کا دبستانِ شاعری سے ماخوذ ہیں۔ شاعری کے دیگر مراکز میں پنجاب، سندھ، بہار اور بنگال میں اُردو کی تخلیقی اور ادبی خدمات کو اٹھارویں صدی کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ امام بخش ناسخؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ کی شاعرانہ خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی رقمطراز ہیں:

''شیخ امام بخش ناسخؔ کو دبستان لکھنؤ کا بانی، لکھنوی رنگِ سخن کا موجد، لکھنوی اُردو زبان کا ممتاز،

زباں دان اور زباں شناس کہا گیا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ شاعری بالخصوص غزل کا جو رنگ ناسخ نے اختیار کیا۔ ناقدین کے نزدیک اس میں حقیقی شاعری کا اثر کم۔ مشاقی اور قافیہ پیمائی کا انداز زیادہ نمایاں ہے اور ان کی اصلاحِ زبان کے باب میں بھی بعض حضرات کا خیال ہے کہ اُردو میں سے قدیم پراکرتی عناصر کو شعوری طور پر خارج کرنے کی جو تحریک ناسخ نے شروع کی تھی وہ ایک منفی لسانی تحریک تھی۔'' (۵۳)

اس طرح آتش لکھنوی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''دبستانِ لکھنؤ میں خواجہ حیدر علی آتش کو ناسخ کے ساتھ اس دبستان کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بعض نقاد خالص شاعری کے نقطہء نظر سے آتش کو ناسخ پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ناسخ نے زبانِ اُردو کی اصلاح میں بے شک بڑا اہتمام کیا لیکن ان کی شاعری صرف الفاظ کی شعبدہ کاری ہے جس میں اکثر وبیش تر مضامین یا تو محض خیالی ہیں یا ان کی بنیاد خارجی موضوعات ومتعلقات اور لوازماتِ حسن پر ہے۔'' (۵۴)

کتاب مذکورہ کے بارہویں باب میں شاعری کے دیگر مراکز خصوصاً پنجاب، سندھ، بہار، اور بنگال کے ان شعراء و ادباء کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے جو انہوں نے اٹھارویں صدی میں سرانجام دی گئیں۔ پنجاب نے جن شعراء وادبا کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں ابومحمد فاضل الدین بٹالوی، شیخ محمد نور، موسیٰ، حضرت غلام قادر، حضرت مراد شاہ لاہور، شاہ مراد خان پور، نصیر الحق، محمد ابراہیم خوش دل، سکندر شاہ امداد اور فدوی لاہوری کی اُردو خدمات کی تفصیل شامل ہے۔ اسی طرح اس دور کے سندھ، بہار اور بنگال میں تخلیق ہونے والے اُردو ادب اور ادباء کی مکمل اور جامع معلومات اس باب میں پیش کی گئی ہیں۔ اس باب کی تفصیل محمد زبیر منگلوری اور ساجد صدیق نظامی نے تحریر کی ہیں۔ آخری باب نثر نگاری کے زیرِ عنوان ہے جس میں اس عہد کے دیگر نثر نگاروں کی مختلف کتب کا حوالہ دیا گیا ہے۔ کتاب مذکورہ زوال مغلیہ اور برصغیر میں اٹھارویں صدی عیسویں کے سیاسی، سماجی، ادبی، فکری اور تہذیبی رجحانات کی عکاس ہے اور ادبی تواریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

۸۔ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد سوم)

برصغیر کی ادبی تاریخ نویسی کے سلسلے کی تیسری جلد میں ۱۸۰۳ء سے لے کر جنگِ آزادی تک کی ادبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جلد مارچ ۲۰۱۰ء میں طبع ہوئی جو پنجاب یونیورسٹی کا ایک اور کارنامہ ہے۔ (۵۵)

کتاب گیارہ مختلف ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دو ابواب سیاسی اور ادبی منظرنامے کے عکاس ہیں جبکہ تیسرا باب

فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کی اُردو خدمات پر مبنی ہے۔ چوتھا باب نثری داستانوں، دکنی نثر اور رجب علی بیگ سمیت اس عہد کی دیگر دستانوی تصانیف پر مشتمل ہے۔

باب پنجم تا ہشتم دبستان دہلی کے متاخرین کی ادبی خدمات پر شامل ہیں۔ شاہ نصیرؔ دہلوی، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، مرزا اسداللہ خان غالب، حکیم مومن خاں مومن، مصطفیٰ خاں شیفتہ، داغؔ دہلوی اور غالبؔ و ذوقؔ کے معاصرین شعراء کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ راحت افزاء بخاری، شیخ محمد ابراہیم ذوق کی شاعری اور شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''شاعری کے میدان میں انہوں نے مختلف معرکوں میں صبر وتحمل، اپنی بہترین قوتِ برداشت، قناعت و استغناء کے مسلک کو اپنائے رکھا۔ اسی لئے ان کی شخصیت کے توازن واعتدال نے ان کی شاعری میں بھی یہی خوبی پیدا کر دی۔''

''ذوق کی غزل زبان و بیان کے لحاظ سے دبستانِ دہلی میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی غزل میں اُردو زبان کے صحیح استعمال نے الفاظ کی اہمیت واضح کی ہے۔ نیز ذوق کی زبان نے دہلی کی محفلوں اور عوام کے روزمرہ اور قلعۂ معلیٰ کی فضاء میں تربیت پائی تھی اس لئے ان کی زبان کو مستند قرار دینے میں ہمیں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے۔'' (۵۶)

جلد ہٰذا میں شعراء کا موازنہ اور ان کے مقام و مرتبہ کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ غالب و ذوق، امیر و داغ، انیس و دبیر، شعرائے اُردو کے تذکرے، لکھنؤ کی مرثیہ گوئی کے حالات اور دیگر شعراء کی معاصرانہ چشمک کا حال بھی کہیں کہیں دیکھا گیا ہے۔ ذوق اور شاہ نصیر کی معاصرانہ چشمک کی ایک جھلک دیکھئے:

''شاہ نصیرؔ سے اصلاح لینے کی وجہ سے ذوقؔ کی طبیعت میں تیزی پیدا ہوگئی۔ اسی اثناء میں شاہ نصیر کے بیٹے وجیہہ الدین منیرؔ سے ذوقؔ کی ان بن ہوگئی۔ مشکل زمینوں پر طبع آزمائی کے لیے مقابلے شروع ہوئے اور ایک جگہ بیٹھ کر غزلیں لکھنے کی شرطیں بھی بندھی جانے لگیں۔'' (۵۷)

کتاب مذکورہ میں مرزا غالبؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور لکھنؤ کے دیگر مرثیہ گو شعراء کے حالات زندگی، نمونہ کلام، فکر وفن اور مقام و مرتبہ تحقیقی اصولوں پر پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی انیسؔ و دبیرؔ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لکھنؤ اس زمانے میں اپنی خوش باشی، خوش وضعی اور اہلِ شہر کی نکتہ سنجی کی بدولت علوم وفنون بالخصوص مرثیہ گوئی کا مرکز بن گیا تھا۔ انیسؔ کے سخن فہموں میں کوئی تصویر کاری، فصاحت و بلاغت اور لطفِ زبان کی تعریف کرتا تو کوئی مرزا دبیرؔ کے شوکتِ الفاظ، مضمون آفرینی اور صنائع بدائع پر جھومتا۔ اسی وجہ سے انیسیے اور دبیریے دو گروہ بن گئے تھے۔ میر صاحب اور مرزا صاحب نے تو کبھی ایک دوسرے

سے الجھنے کا خیال تک نہیں کیا لیکن ان کے ہواہ خواہ بڑی گرما گرم بحثیں کیا کرتے تھے۔'' (۵۸)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے دسواں باب ''اُردو کی ابتدائی صحافت'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے جس میں نجی قلمی اخبارات، اُردو کا پہلا اخبار، اُردو صحافت کا باقاعدہ آغاز، دہلی اُردو اخبار، سیدالاخبار، صادق الاخبار، گل رعنا مجلّاتی صحافت، دیگر اخبارات اور مسلمانوں پر صحافت کی پابندی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اُردو کے اخبار کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''مؤرخینِ صحافت عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ ۱۸۲۲ء میں فارسی کا پہلا اخبار ''جامِ جہاں نما'' کلکتے سے جاری ہوا۔ اگلے سال اس کا اُردو ضمیمہ جاری ہوا جو پانچ سال بعد بند ہو گیا۔ اُردو کا پہلا مکمل اخبار ''دہلی اُردو اخبار'' تھا جو ۱۸۳۶ء میں دہلی سے نکلا لیکن نئی تحقیق کی روشنی میں یہ بیان نادرست ثابت ہو چکا ہے۔ جامِ جہاں نما' فارسی کا نہیں اُردو کا پہلا اخبار تھا۔ چند ہفتے بعد اس کی زبان فارسی ہو گئی۔ ایک سال بعد اس کا اُردو ضمیمہ نکلا۔ پس ''دہلی اُردو اخبار'' اُردو کا پہلا نہیں دوسرا اخبار تھا۔'' (۵۹)

تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند کی تمام جلدیں اپنی نوعیت، انفرادیت اور عہد کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ہر جلد میں معلومات کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ جو قارئین کے لئے معلومات کا بہترین ذریعہ ہے۔

۹۔ تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد چہارم)

تاریخ نگاری کے سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی کی کاوشوں کی چوتھی جلد کا زمانہ جنگِ آزادی سے شروع ہو کر پہلی جنگِ عظیم کے آغاز تک ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا پیش لفظ میں اس کی اشاعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (اُردو ادب) کی چوتھی جلد بھی نظرِ ثانی کے مراحل سے گزر کر قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ اشاعتِ دوم کے اس منصوبے کا آغاز جولائی ۲۰۰۸ء میں ہوا تھا۔ اور تقریباً دو سال کی مدت میں اس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔'' (۶۰)

جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد اُردو ادب ایک نئے راستے پر گامزن ہوا۔ پرانی روایات دم توڑنے لگیں۔ سرسید احمد خان کی مقصدیت پسندی اور جدید ادب کے رجحانات نے کلاسیکی روایات کو پیچھے دھکیل کر اصنافِ ادب کی نئی قسمیں متعارف کروائیں۔ مضمون، ناول، نظم، گیت اور قومی ملی شاعری کا وجود قائم ہوا۔ کتاب ہٰذا کے ابتدائی گیارہ ابواب میں علی گڑھ تحریک کے ادبی کارناموں کو پیش کیا گیا ہے۔ سرسید احمد خان، الطاف حسین حاؔلی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاؔد، نذیر احمد، رتن ناتھ، سرشار، عبدالحلیم شرؔر، مرزا ہادی رسوؔا اور دیگر ناول نگار کے عنوانات سے الگ الگ باب تشکیل دیئے گئے ہیں:

داغ دہلوی اور امیر مینائی کی شخصیت، فن اور شاعری کے لئے ایک الگ باب ترتیب دیا گیا ہے جس میں دونوں اساتذہ کے فن کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔مثلاً:

''ایک چیز جو امیرؔ و داغؔ کے کلام میں مشترک ہے وہ زبان کی صفائی اور سلاست ہے۔اس کی وجہ پوچھی جائے تو کہنا چاہیے کہ یہ شاعر اس زمانے کے ہیں جب اُردو زبان ڈھائی سو سال کی مشق اور منجھائی کے بعد صاف اور فصیح ہو چکی تھی۔''(۶۱)

علی گڑھ تحریک کی ادبی خدمات اور داغؔ و میرؔ کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ساتھ اس جلد میں اکبرالہٰ آبادی، غیر افسانوی نثر، ڈرامانگاری، صحافت کی تفصیل، مناظراتی ادب اور اُردو زبان کی عمومی ترقی کا جائزہ بھی تفصیلاً پیش کر کے کتاب کی ضخامت کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔پنجاب یونیورسٹی کے اس کارنامے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔تاریخِ ادبیات کے سلسلے میں ان کی پہلی اشاعت ۱۹۷۱ء میں ہوئی تھی۔اس کے بعد اُردو ادب کی جتنی بھی تاریخیں شائع ہوئیں ان میں ان جلدوں کا ذکر ضرور کیا گیا ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ ان کتب کی اہمیت بڑھتی گئی اور آج یہ تمام جلدیں حوالہ جاتی کتب بن چکی ہیں۔مختلف مؤرخین نے ان جلدوں کے حوالے متعدد جگہوں پر دیئے۔ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

''تواریخ ادب میں تین بڑے کام ہوئے ہیں۔علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو (جلد اوّل) ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔رشید حسن خان نے تفصیل سے اس کی خامیاں آشکار کیں مگر پھر دکنی ادب کی تاریخ کے لئے اس میں تفصیلی مواد ملتا ہے۔دوسری بڑی تاریخِ ادب پنجاب یونیورسٹی لاہور کی تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند ہے جو ۱۶ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔اس کی چھٹی جلد سے دسویں جلد اُردو ادب کی تاریخ ہیں جو ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئیں۔تیسری تاریخ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ادب اُردو ہے۔''(۶۲)

ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک تواریخ ادب کتب کے حوالے سے جو تین بڑے کام ہوئے ہیں۔یہ اپنی نوعیت، انفرادیت اور عہد کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس کارنامے کی دادیوں دیتے ہیں:

''۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہء ''تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' میں کام کر رہا تھا۔اس وقت شعبہء نیا نیا بنا تھا۔تاریخ ادبِ اُردو کے ابتدائی خاکے میں نے اور میرے فاضل دوست محمد اکرام چغتائی نے تیار کئے تھے۔۔۔۔۔پنجاب یونیورسٹی کی تاریخِ ادب کے منصوبے کی کسی ایک جلد کو اٹھا کر دیکھ لیں اگر اس میں دس مقالے ہیں تو تنقید اور تحقیق کے اعتبار سے تمام کے تمام ایک دوسرے سے مختلف معیار کے حامل ہیں۔''(۶۳)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے نزدیک پنجاب یونیورسٹی کی تاریخِ ادب کے منصوبے کی ایک جلد کو بھی دیکھ لیں تمام مقالے تنقید اور تحقیق کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف معیار اور انفرادیت کے حامل ہیں۔اُردو زبان و ادب کے مؤرخین نے

زیادہ تر روایتی ادبی تاریخ نویسی سے کام لیا ہے۔اسے محض تاریخِ ادب کی داستان تک محدود رکھنا اس کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔پنجاب یونیورسٹی کا کمال یہ ہے کہ اس کے پلیٹ فارم سے جس تاریخ نویسی کو مکمل کیا گیا ہے اس میں روایت کے ساتھ ساتھ اس کی وسعت کا خیال رکھا گیا ہے۔تنقید، تحسین، تخلیق، تحقیق اوراعلیٰ نثر کا جو مظاہرہ ان جلدوں میں کیا گیا ہے اس کی مثال کسی اورادارے نے اب تک پیش نہیں کی۔

۱۰۔ تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد پنجم)

تاریخ نگاری کے سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی کی کاوشوں کی پانچویں جلد کا زمانہ (۱۹۱۴ء - ۱۹۷۲ء) تک ہے اس کی طبع اوّل ۱۹۷۲ء میں ہوئی۔ پروفیسر محمد علاؤالدین صدّیقی مدیراعلیٰ کتاب کے حوالے سے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ان فکری عوامل اور شعائر زندگی کی نشاندہی کی جائے جس سے اس برصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی زندگی اور معاشرتی اقدار کی تعمیر ہوئی۔ادب سے مراد یہاں ان خیالات وجذبات عالیہ کا مؤثر اظہار ہے جن سے قلب ونظر کی جلا ہوتی ہے اور جن سے انسانی زندگی بامعنی بنتی ہے۔۔۔۔۔۔اور ہمارے لمحات بامراد۔ادب میں مذہب، تصوف، فلسفہ، اخلاقیات، تاریخ، لسانیات، شاعری، افسانے، انشائیات، مکتوبات ہر چیز شامل ہے۔''(۶۴)

مذکورہ اقتباس میں تاریخِ ادبیات کا مقصد ادب کو معاشرے کے تقاضے کے طور پر پیش کیا جائے تا کہ زندگی کے ہر رخ، قلب انسانی کی ہر کیفیت، روح کائنات کے پرتو میں ہم آہنگی نظر آئے۔

مرتب نے کتاب میں حصہّ اول اور حصہّ دوم دو حصّے بیان کئے ہیں۔حصہّ اول (۱) گیارہ ابواب پر مشتمل ہے جو بالترتیب سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پسِ منظر، (۲) ادبی منظر (۳) اقبال (۴) دیگر شعراء (۵) اس دور کے غزل گو شعراء (۶) اُردو ناول اور افسانہء (۷) تحقیق وتنقید (۸) ڈراما (۹) صحافت (۱۰) مزاح نگاری (۱۱) دینی ادب پر مشتمل ہے۔حصّہ اول کا آغاز سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر سے کرتے ہیں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ملک میں سیاسی شعور کے بیدار ہوجانے سے جہاں سیاسی سرگرمیوں میں اضافہ ہوگیا وہاں ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ شعروادب میں سیاسی موضوعات دخیل ہوگئے اور سیاسی پلیٹ فارم پر شعروشاعری صفی لکھنوی، اکبرالہٰ آبادی، ظفر علی خان، چکبست، اقبال، آغا حشر، ظریف لکھنوی وغیرہ نے شعراء میں سیاست کا پیوند لگایا اور اپنے اپنے انداز میں سیاسی شعور اور سیاسی بیداری پیدا کرنے لگے۔''(۶۵)

کتاب مذکورہ میں سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ اگر ملک میں سیاسی شعور بیدار ہو جائے تو سیاسی سرگرمیاں پروان چڑھتی ہیں اس ضمن میں شعراء سیاسی شعور اور بیداری کو اُجاگر کرتے ہیں۔ گیارھواں باب دینی ادب سے شروع ہوتا ہے دینی ادب میں اُردو کے حوالے سے تحریر ہے:

''اُردو اگر ایک طرف برصغیر پاک و ہند کے لسانی اور ثقافتی ذخیرہ پر مسلمانوں کے فکر اور ان کے تہذیب و تمدن کے عمل اور تعامل کی پیداوار ہے تو دوسری طرف یہ زبان اور اس کا ادب عصرِ جدید میں روحِ اسلام کے اظہار کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ عربی کے بعد اسلام کے دینی ادب کا سب سے بڑا خزانہ اسی زبان میں ہے۔ انیسویں صدی کے وسط سے مسلمانانِ پاکستان و ہند کے افکار و نظریات کا اصل اظہار اُردو ہی کے ذریعہ ہوا ہے گو اس زمانہ میں فارسی اور انگریزی کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل رہی۔۔۔اس دور کی دینی فکر کا مطالعہ صرف اُردو نثر ہی کے ذریعے ممکن ہے۔'' (٦٦)

کتاب مذکورہ میں جہاں حصہّ اوّل انفرادیت کا حامل ہے وہاں حصّہ دوم کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حصہّ دوم دس ابواب پر مشتمل ہے جس میں معاشرتی اور ادبی پسِ منظر، شعراء، افسانہ نگار اور ناول نگار، تحقیق و تنقید، ڈراما، صحافت، اور سفر نامے شامل ہیں زبان اور مطالعہ زبان کے حوالے سے تحریر ہے:

''انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں جن سیاسی، سماجی، تہذیبی، علمی اور ادبی تحریکوں نے جنم لیا اور ۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب اور انگریزی حکومت کے استحکام کے نتیجہ کے طور پر جو میلانات اور رجحانات برصغیر میں رونماء ہوئے ان کا اثر قدرتی طور پر شعر و ادب اور زبان و بیان پر بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً ادبی تحریکات میں سرسید کی ہمہ جہتی تحریک کے زیرِ اثر سرسید اور ان کے رفقاء کی تحریروں میں انگریزی الفاظ کی کثرت سے قطع نظر اصناف ادب، اسالیب اور اندازِ تحریر میں انگریزی کا سایہ صاف نظر آتا ہے اُردو زبان کو ترقی دینے اور اسے دنیا کی جدید زبانوں کے مقابلے کے لائق بنانے کے لئے یہ بالکل ناگزیر تھا کہ انگریزی زبان سے پورا فائدہ اٹھایا جائے انگریزی صرف حکمرانوں کی زبان نہ تھی بلکہ جدید علوم و فنون اور عالمی تجارت و تہذیبی تعلقات کی بھی زبان تھی۔'' (٦٧)

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں جب بھی سیاسی انقلابات اور تحریکیں جنم لیتی ہے تو شعر و ادب اور زبان و بیان بھی متاثر ہوتے ہیں۔ تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند کی پانچوں جلدیں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ہر جلد میں قارئین کے معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔ پنجاب یونیورسٹی نے پانچوں جلدوں میں تاریخ نویسی کو مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں روایت اور وسعت کا خیال بھی رکھا ہے۔ تنقید، تحقیق، اور اعلیٰ نثر کا جو مظاہرہ ان جلدوں میں کیا گیا ہے اس کی مثال کسی اور ادارے نے اب تک پیش نہیں کی۔

۱۱۔ سندھ میں اُردو (ڈاکٹر شاہدہ بیگم)

ڈاکٹر شاہدہ بیگم ''سندھ میں اُردو'' کے زیرِ عنوان کتاب تحریر کر کے تحقیق و تاریخ کی دنیا میں ایک نیا اضافہ کیا کتاب مذکورہ ''اُردو اکیڈمی سندھ'' نے ۱۹۸۰ء میں شائع کی ۔ یہ کتاب ڈاکٹر شاہدہ بیگم کا پی ایچ ۔ڈی مقالہ ہے جو انہوں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نگرانی میں مکمل کر کے جامعہ کراچی سے پی ایچ ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ (۶۸) یہ امر ضروری ہے کہ جب ایک محقق تاریخ نویسی کے موضوع پر قلم اٹھائے گا تو مستند حوالوں کے ذریعے بات کرے گا جب یہ مقالہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا تو اس کی اہمیت وافادیت بڑھ گئی۔ادبی حلقے اسے تاریخ نویسی کے میدان میں ایک اچھا اضافہ سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اور صلاح الدین احمد نے کتاب کے ابتدائیے میں مفصل معلومات اور تجاویز پیش کی ہیں۔مصنفہ نے ''سفر نامہ'' کے عنوان سے خود بھی اپنی کاوش کی سختیوں اور ابتدائی معلومات کو بیان کیا ہے۔صلاح الدین احمد مصنفہ کی تحقیقی اور مؤرخانہ قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر شاہدہ نے بڑے سلیقہ سے وادیٔ مہران میں اُردو کے ارتقاء کا جائزہ لیا ہے۔بڑی محنت اور لگن سے سندھ کے ریگ زاروں میں چھپے ہوئے جواہر پاروں کو کھوج کر نکالا ہے اور اسے سائنٹیفک انداز میں تحقیق کے اصولوں پر پرکھ کر یکجا کیا ہے۔عہدِ قدیم سے دورِ حاضر تک وادیٔ مہران کے ثقافتی، علمی، ادبی اور تمدنی ہر گوشہ پر گہری نظر ڈالی ہے۔'' (۶۹)
>
> ''انتساب'' ''آغا حسن عابدی'' کے نام ہے۔کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔سندھ کی تاریخ، تہذیبی ولسانی پس منظر اور عربوں کی آمد کو پہلے حصے میں جس تفصیل سے بیان کیا ہے لائقِ ستائش ہے۔محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والے مجاہدوں میں اکثریت عربوں کی تھی لیکن ایک تعداد وہ بھی تھی جو فارس نژاد تھے۔'' (۷۰)

سندھ میں اُردو زبان کے آغاز وارتقاء اور ابتدائی نقوش وآثار کے بارے میں تفصیلی معلومات دوسرے باب میں مندرج ہیں۔شواہد اور حواشی کا اہتمام مشہور تاریخی کتب کے ذریعے کیا گیا ہے اس لئے مصنفہ کی کسی بات کو رد کرنا ناممکن ہے۔کتاب کا مطالعہ اور ضخامت اس کی تحقیق کنندہ کی محنت اور لگن کی داد دے رہے ہیں۔زبان کی لسانی ہم آہنگی سندھ کے ساتھ حوالہ جات کے ذریعے بتائی گئی ہے۔مثال دیکھئے:

> ''یہ ہم آہنگی سندھی کے بیس بائیس ہزار الفاظ میں سے پندرہ سولہ ہزار میں ضرور پائی جاتی ہے کیونکہ بھیرومل مرچنداڈوانی کے اندازے کے مطابق سندھی میں تین ہزار فارسی، ڈھائی ہزار عربی، ڈھائی ہزار دیسی اور بارہ ہزار پراکرتی لفظ شامل ہیں۔'' (۷۱)

تیسرے باب میں سندھ کے ان خاندانوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے اُردو کی تعمیر وترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

قابلِ ذکر خاندانوں میں سومرہ خاندان، مغل کلہوڑے، خانوادۂ تال پور، صوفیاء، مدارس اور تدریسی بساط اہم ہیں۔ صوفیاء کرام نے اُردو کی ترقی کے لئے جو کام کیا اسے دیکھئے:

''بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اُردو کے حقیقی سرپرست اربابِ اقتدار اور اہلِ دُوَل سے زائد وہ افراد اور وہ مراکز تھے جہاں صرف محبت اور انسانیت کے درس دیے جاتے تھے جہاں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہ تھا جہاں پیر و مرید سب دلق پوش اور بوریہ نشین ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ شروع سے آخر تک عوامی زبان کے شاعروں کی اکثریت فقراء اور صوفیاء کے مابین نظر آتی ہے''۔ (۷۲)

چوتھے باب میں اندرونِ سندھ کے علمی و ادبی ذخائر و رسائل اور مختلف کتب خانوں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ سندھ کی صحافت اور پریس کے تار و پود بیان کر کے سندھ کو زبانِ اُردو کا ماٰخذ کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ روزنامچے ہفت روزہ اخبارات اور دیگر صحافی امور کے سلسلے میں معمولی معمولی باتوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس علاقے کی سندھی تہذیب، مشاعرے، اجتماعات اور دیگر ادبی سرگرمیوں کی تفصیل بیان بھی ہے۔ ادبی محفلوں کے عروج و زوال کی داستانیں اور مشاعروں کی تفصیل بھی سندھ میں اُردو کے ابتدائی اور ارتقائی ادوار کی عکاسی کرتی ہے۔ حیدرآباد کی ادبی محفلوں اور ادبی خدمات کو جو فروغ ملا اس کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں:

''میروں کے دور میں اُردو کو جو فروغ حاصل ہوا وہ بھی اسی شہر سندھ میں اور انگریزی عہد میں میر عبدالحسین سانگی نے سندھی مشاعروں کی جو شمع روشن کی وہ بھی اسی شہر میں اور اس سلسلے میں اُردو کو جو مقام میسر آیا اس میں اس شہر کا بڑا دخل ہے۔'' (۷۳)

چوتھے باب کے بعد سندھ میں اُردو شاعری کے آغاز و ارتقاء پر تحقیق کی گئی ہے۔ آغاز سے لے کر قیامِ پاکستان تک اور اس کے بعد پاکستانی ادب میں سندھ کے کردار کے حوالے سے بھی تفصیلی تبصرہ مصنفہ کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے اندرونِ سندھ اور کراچی کے مشاعروں کی روداد مع تواریخ نظم و نثر اور تراجم کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے:

''سندھ میں اُردو شاعری اور نثر کی روایت بہت پرانی ہے۔ تقسیم کے بعد یہ سلسلہ بہت سی حدوں کو عبور کر گیا۔ تقسیم سے قبل سندھ میں اُردو کا نثری سرمایہ بہت مختصر تھا جس کے مبینہ اسباب تھے۔ حالانکہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے یہ زبان شمالی ہند اور دکن کی طرح سندھ کے خانقاہی حلقے میں ہمیشہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔'' (۷۴)

قیامِ پاکستان کے بعد سندھ میں نثری ادب نے بہت ترقی کی اس سلسلے میں مصنفہ نے ادباء شعراء کی طویل فہرست اور ان کے کارنامے بتائے ہیں۔ جن شخصیات کو موضوعِ خاص بنایا گیا ہے وہ علی محمد مجروح، تاج بلوچ، یوسف شاہین، نگہت پروین، امر جلیل، شہزادہ گلفام، سراج الحق، غلام احمد بدوی، ظفر حسن شاہ، منصور ویراگی، احسان بدوی، محمد صالح شاہ، مرزا عباس علی بیگ، محمودہ رضویہ اور دیگر ادیب شامل ہیں۔

آخری باب ''سندھ میں اُردو کا ماضی حال اور مستقبل'' کے عنوان سے ہے۔مصنفہ نے تخلیقی انداز میں متذکرہ بالا موضوع کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔انہوں نے باقی علاقوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ اگر چہ اُردو زبان وادب کے مراکز دہلی، لکھنؤ، دکن اور لاہور تھے۔لیکن سندھ کی ادبی خدمات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔تین سو ستانوے صفحات پر مشتمل اس کتاب کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اس میں اُردو کا مآخذ سندھ کو قرار دینے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

سندھ میں اُردو کا نظریہ سب سے پہلے سید سلیمان ندوی نے پیش کیا تھا۔اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی اپنی تصنیف ''نقوشِ سلیمانی'' میں رقمطراز ہیں:

> ''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اُردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔'' (۷۵)

کتاب مذکورہ میں سید سلیمان ندوی کے رہنما اصولوں اور تجاویز وآراء کی روشنی میں تحقیقی اصولوں پر بات کی گئی ہے۔مؤرخ جب اُردو زبان کے آغاز وارتقاء کی تفصیلی تاریخ مرتب کرے گا تو سندھ کا نام خارج از بحث نہیں ہوگا۔مصنفہ کی کتاب تحقیق وتاریخ کی دنیا میں ایک نیا اضافہ ہے انہوں نے اس کتاب کی تحقیق میں جو محنت اور لگن کا ثبوت دیا ہے وہ لائق تحسین اور مبارک باد کی حقدار ہیں۔

۱۲۔ لاہور کا دبستان شاعری (ڈاکٹر علی محمد خان)

ڈاکٹر علی محمد خان کی کتاب ''لاہور کا دبستانِ شاعری'' **۱۹۹۲ء** میں لاہور سے شائع ہوئی مصنف نے لاہور قدیم کے فارسی شعراء کو بھی بطور خاص اس کتاب میں شامل کیا ہے۔پہلے باب میں لاہور شہر کے سیاسی، تہذیبی اور تمدنی حالات بیان کئے ہیں جب کہ دوسرے باب میں لاہور کے ان شعراء کی شاعری اور حالات قلمبند کئے ہیں جو فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ زیرِ نظر کتاب ان کا وہ مقالہ ہے جس پر انہیں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری عطا ہوئی ہے۔(۷۶) اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''میری خوش قسمتی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کے اس مقالے کی تیاری کے لئے پروفیسر ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کو میرا نگران مقرر کیا اس دوران میں بعض اوقات کسی ایک بات کی تصدیق یا تحقیق میں مہینوں صرف ہو جاتے کئی بار ایسے دشوار گزار مقام آئے کہ ہمت جواب دے جاتی لیکن استاد محترم سجاد باقر رضوی کی مشفق ومہربان شخصیت قدم قدم پر میری رہنمائی کرتی رہی یہاں تک کہ منزل مقصود تک میری رسائی ممکن ہوگئی۔'' (۷۷)

پنجاب ہندوستان کا وہ قدیم خطہ ہے جہاں ہندوستان پر حملہ کرنے والے تمام سپہ سالاروں نے اپنا پڑاؤ ڈالا۔ تاریخی لحاظ سے پنجاب قوموں اور لشکروں کی گزرگاہ بھی رہا ہے۔سکندراعظم، محمودغزنوی، محمدغوری، منگول آریاء، نادرشاہ درانی اوراحمدشاہ ابدالی وغیرہ سب سے پہلے خطہ پنجاب ہی میں پہنچے اس لیے لاہور ہندوستان کا قدیم شہر ہے۔اس میں مختلف مکتبہءفکر کے لوگ رہائش پذیر تھے۔مصنف نے آریاءسماج سے لے کر تقسیم ہند تک لاہور شہر کی تہذیب اور ثقافت کو پہلے باب میں بیان کیا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جنگ آزادی کے دوران میں بے شمار جانی اور مالی نقصان ہوا انگریزوں کے سات ہزار مقتولین کے بدلے میں کم وبیش پانچ لاکھ ہندوستانی ہلاک کیے گئے جن میں کثیر تعداد مسلمانوں کی تھی۔دہلی پر تو ایک قیامت ٹوٹ پڑی، ایک عرصہ تک لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم رہا۔۔۔۔۔دہلی کی تباہی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو زبان وادب کی نشو ونما کا مرکز اب لاہور بن گیا۔صرف یہی نہیں بلکہ لاہور ایک نئے سماجی سیاسی اور تہذیبی شعور کا بھی مرکز بن گیا۔'' (۷۸)

پہلے باب میں لاہور کی تہذیب وتمدن میں مصنف نے لاہور میں فارسی اور اُردو شاعری پر دو الگ الگ ابواب مختص کئے ہیں۔دبستانِ لاہور کے معروف شعراءاور دیگر شعراء کے حوالے سے بھی الگ الگ باب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔کتاب کا تیسرا باب اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے منفرد ہے اس باب میں انجمن پنجاب، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق سمیت ''اقبال ایک شاعر ایک تحریک'' پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے:

''حضرت علاّمہ اقبال فقط ایک شاعر ہی نہ تھے بلکہ اپنی ذات میں ایک تحریک تھے۔ایسی تحریک جوان سے شروع ہوگئی اور انہیں پر ختم ہوگئی۔قدیم وجدید شعراء میں ان کا موازنہ کسی شاعر سے نہیں کیا جاسکتا۔۔۔۔ ہاں یہ مسلمہ امر ہے کہ ان کے افکار سے شاعری پر بڑے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔'' (۷۹)

کتاب کا چوتھا باب ''لاہور کا دبستانِ شاعری'' اور پانچواں باب دبستانِ لاہور کے معروف شعراء کے متعلق ہے۔ دبستانِ لاہور کے معروف شعراء بلحاظ ترتیب زمانی مولانا محمد حسین آزادؔ سے لے کر قتیل شفائی تک شامل ہیں۔ان کا آغاز محمد حسین آزاد سے کیا گیا ہے۔ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آزاد کی طبیعت میں ایجاد اُختراع کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔۔۔۔۔اگر چہ فنی محاسن کے اعتبار سے شاعری میں آزاد کا مرتبہ بہت اونچا نہیں ہے۔خواہ وہ جدید نظم کو معراج کمال تک نہ پہنچا سکے ہوں کیونکہ آزاد کا میدان صرف شاعری نہ تھا۔اوران کے ادبی نظام میں یہ چیز ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ تاہم جدید نظم اوراس کے فروغ میں اوّلیت کا شرف بلاشبہ انہیں حاصل ہے اور یہ وہ شرف ہے جوان

کی تاریخی حیثیت متعین کرتا ہے چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزاد اُردو شاعری میں اپنے اسلوبِ نگارش اور اندازِ فکر دونوں حوالوں سے دبستانِ لاہور کے بانی قرار پائے جانے کے مستحق ہیں۔'' (۸۰)

اس طرح قتیل شفائی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''قتیل کے گھرانے میں دور دور تک کوئی شاعر نہ تھا۔ ابتداء میں گھر والوں سے چھپ کر شاعری کیا کرتے تھے۔۔۔۔۔ جب ایک نظم پر اسکول میں ایک کتاب انعام میں ملی تو والد نے جن کا نام فیروز خان تھا بہت شاباش دی اس کے بعد بے جھجک شعر کہنے لگے ابتداء میں جو کچھ لکھتے وہ حکیم یحییٰ شفا خانپوری کو جن کی نسبت سے آپ (شفائی کہلاتے ہیں) دکھاتے تھے اور کچھ عرصہ احمد ندیم قاسمی سے بھی مشورہ لیتے رہے جو حُسنِ اتفاق سے آپ کے ہمسایہ بھی ہیں مگر بعد میں اپنی طبع موزوں کو راہنما بنایا اور کسی سے اصلاح نہ لی۔'' (۸۱)

ڈاکٹر علی محمد خان نے لاہور کی ادبی حیثیت کو دہلی، لاہور اور دیگر ادبی مراکز کی طرح ٹھوس ثبوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

۱۳۔ اُردو کی خالق گوجری زبان (چوہدری محمد اشرف ایڈووکیٹ)

چوہدری محمد اشرف ایڈووکیٹ نے اُردو زبان کا ماٰخذ گجرات کو ثابت کرتے ہوئے ۱۹۹۸ء میں ''اُردو کی خالق گوجری زبان'' تصنیف کی۔ کتاب مذکورہ کیپیٹل پبلی کیشنز، اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ دوسو پندرہ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت سو روپے ہے اور انتساب سرکارِ دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ہے۔ (۸۲)

کتاب کی تصنیف تحقیقی انداز سے کی گئی ہے جو پیش لفظ، حوالہ جات اور تبصرہ جات کے علاوہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جو بالترتیب گوجر قوم اور گوجری زبان، گوجری اور گوجرات، دکنی پر گوجری کا اثر، گوجری کے علاقائی نام، گوجری سے اُردو کا جنم، قدیم گوجری شاعر و ادیب، جدید گوجری شاعر و ادیب اور گوجری ادب کے ادارے پر مشتمل ہیں۔

کتاب مذکورہ میں مصنف نے برِصغیر کی ہزاروں سالہ پرانی سماجی، تاریخی، تہذیبی اور جنگی تاریخ کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ درحقیقت گوجر بھی مستقل آریہ قوم ہے جس کو محققین اور مؤرخین اکثر اوقات نظر انداز کرتے آئے ہیں۔ جب سے آریہ قوم خطہء برِصغیر میں آباد ہے گوجر قوم بھی اس ملک میں آباد ہیں۔ (۸۳) مصنف گوجر قوم کی ابتداء کے بارے میں انگریزی محقق وی۔ اے۔ سمتھ کی تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''گوجر قوم کی ابتداء اور آغاز کے بارے میں مؤرخین نے مختلف النوع آراء کا اظہار کیا ہے۔ انگریز محقق وی۔ اے۔ سمتھ کے مطابق گوجر ہنوں کے قرابت دار تھے جو دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک

گروہ وولگا اور آکس کی وادیوں میں پھیل جانے کے بعد دریائے ڈینوب اور وولگا کے درمیان واقع مشرقی یورپ کے علاقوں پر قابض ہوگیا لیکن ان کی سلطنت جلد ہی ختم ہوگئی۔ ان کا دوسرا گروہ پانچویں صدی عیسوی میں سلطنتِ کابل پر حملہ آور ہوا اور بالآخر سلطنت گپتا کو بھی تہہ وبالا کرڈالا۔ ان کے سردار طورامنہ نے سلطنت مالوہ کی بنیاد ڈالی۔ ۵۱۰ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے میہر گلا نے انتظام سلطنت سنبھالا جو انڈیا کا عظیم حکمران ثابت ہوا۔ اس کا دارالحکومت سکلہ (موجودہ سیالکوٹ) تھا۔'' (۸۴)

بعض محققین نے گوجر قوم کو ہندوستان کی مقامی قوم بھی ثابت کیا ہے۔ کوئی انہیں کھتری النسل کہتا ہے۔ کسی نے گرجر، مہان۔ بلوان، شکتی شالی اور طاقتور قوم کہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ لفظ گرجر، گوجر کہلانے لگا جواب مستقل قوم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ عبدالباقی نسیم اس قوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''گوجری زبان وادب اس بدنصیب اور خود فراموش قوم کا ورثہ ہے جو برصغیر کی ایک قدیم ترین اور عظیم ترین قوم ہے۔ اس قوم کے بادشاہوں، راجوں، مہاراجوں اور سلاطین و وزراء نے صدیوں نہیں بلکہ ہزاروں سال تک دنیا کے وسیع خطوں اور براعظموں پر حکومت کی ہے۔'' (۸۵)

گوجر قوم اور خطہء گجرات کے جغرافیائی اور تاریخی پسِ منظر پر تو بہت سے محققین اور مصنفین نے قلم اٹھایا لیکن گجرات میں اُردو زبان وادب کا رشتہ بہت کم لوگوں نے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف موصوف نے اس کتاب میں گوجری کو اُردو زبان کی خالق پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ اُردو ہی تھی جو گجرات پہنچنے پر گوجری کی شکل اختیار کرگئی یا یہ تاثر کہ گوجری ایک حادثے سے پیدا ہوئی اور دوسرے حادثے کے ساتھ ختم ہوگئی غلط ہے کیونکہ گجری زبان تو اُردو کے جنم سے ہزاروں سال پہلے بھی موجود تھی اور آج بھی اس طمطراق کے ساتھ موجود ہے۔ گجرات میں علاقے کی نسبت سے گجراتی یا دکن سے منسوب دکنی نہیں بلکہ علیحدہ تشخص برقرار رکھتے ہوئے گوجری نام ہی سے پکاری گئی۔ گوجری زبان وادب نے تخلیقی ذہنوں کو وہ جلا بخشی کہ جب عربی، فارسی اور ہندوی تہذیبی کا ملاپ ہوا یا یہ باہم ٹکرائیں تو ایک قابلِ قبول یا تیسرے کلچر کے طور پر جو کھڑی یا کھڑی زبان وجود میں آئی تو اس نے بھی اپنا خمیر گوجری ہی سے حاصل کر کے نئی منزل کی جانب سفر شروع کیا۔'' (۸۶)

گجری زبان کی اس خالص اور قدیم ہندی روایت کا تذکرہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی دیا ہے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی، گروگرنتھ صاحب، شمس العشاق شاہ میراں جی، ابراہیم عادل شاہ، برہان الدین جانم اور شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی مختلف اوقات میں اپنے صوفیانہ خیالات کو گجری کی ہئیت میں بیان کئے۔ (۸۷)

گجری زبان پر مشرقین نے بھی تحقیق کی جن میں بی اے گریئرسن کا نام بھی گجری کی تحقیق کے ساتھ آتا ہے۔ انہوں

نے کشمیر کی پہاڑی، راجھستان کی میواتی، ہزارہ میں بولی جانے والی ہزاروی، نیپال اور مشرقی راجھستان کی بولیاں اور وادی جمنا کی بولیوں کو گجری کے مماثل قرار دیا ہے۔انہوں نے تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ ان علاقوں کی زبانوں کو گجر قوم نے گوجری کے ساتھ ترقی دی۔(۸۸)

اُردو زبان وادب کے آغاز وارتقاء کا سہرا زمینِ دکن کے سر ہے لیکن جب دکنی زبان و بیان کے ذخیرہ پرنظر ڈالی جائے تو اس میں گجری کا عمل دخل بھی نظر آتا ہے۔اس دور کے گجری ادب اور دکنی ادب کا ملاپ کیا جائے تو میراں جی، اشرف بیابانی، جانم، ابراہیم شاہ جگت گرو کے کلام میں دکنی اور گجری دونوں کے آثار برابر موجود ہیں۔(۸۹) گوجری اور دکنی کا موازنہ کرتے ہوئے مصنف رقمطراز ہیں:

> ''تحقیق ثابت کرتی ہے کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی، راگ تلنگ نام دیو، حضرت میراں جی شمس العشاق، ابراہیم عادل شاہ جگت گرو، شیخ بہاؤالدین باجن، خوب محمد چشتی، اشرف بیابانی، سید محمد مہدی، قاضی محمود دریائی، نصرتی، عبدل، ملاوجہی اور عالم گجراتی کا کلام بھی گوجری زبان ہی کا شاہکار تھا۔''(۹۰)

لسانیات کے ماہرین نے گوجری کو برصغیر کی قدیم ترین معیاری ادبی صلاحیتوں سے مالا مال گوجری زبان قرار دیا ہے۔ اسی زبان نے مارواڑائی، میواتی، راجھستانی، سندھی، کاچھی اور گجراتی پر بھی اثرات ڈالے۔ ان زبانوں کے تقابلی جائزے اور تحقیق کے نتیجے میں محققین نے یہ رائے دی ہے کہ یہ سب گوجری ہی کے مختلف نام اور روپ ہیں۔اسی طرح کشمیر اور راجھستان برصغیر کے جدا جدا علاقے ہیں لیکن گوجر قوم نے ان دو علاقائی وحدتوں کو یکجا کر دیا ہے اسی حوالے سے گوجری کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔(۹۱)

مصنف مذکور نے کتاب میں قدیم وجدید گوجری شعراء وادباء کی تفصیل بیان کی ہے جو ادبی تاریخ میں اہم اضافہ ہے۔قدیم شعراء میں میراں جی، شاہ علی محمد جیو گام دھنی، میاں مصطفیٰ، شاہ برہان الدین جانم، شیخ محمد امین، شیخ خوب محمد چشتی، شیخ بہاؤالدین جانم، قاضی محمود دریائی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، مظفر خان، کبیر اور سید نور دین محمد عرف ست گرو کے کلام، تصانیف اور گوجری کی ادبی خدمات کی مکمل تفصیل بیان کی ہے۔تمام شعراء کا نمونہ کلام بھی پیش کیا گیا ہے جو تحقیقی وتاریخی لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

گوجری زبان وادب کے جدید شعراء وادباء میں مصنف نے صابر آفاقی، مولانا محمد اسماعیل ذبیح راجوری، اسرائیل مہجور، غلام حسین اظہر، رانا فضل حسین فضل، چوہدری غلام احمد رجا، مولانا مہر الدین قمر راجوری، مخلص وجدانی، چوہدری عبدالرشید، احمدالدین عنبر، اقبال عظیم چوہدری، نسیم پونچھی، غلام یٰسین غلام، عبدالرحیم ندیم، چوہدری عبدالغنی عارف اور کرم دین چوپڑہ کے حیات وکلام اور تصانیف کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔اُردو کی خالق گوجری زبان کی اہمیت بیان کرتے ہوئے مصنف

رقمطراز ہیں:

''اُردو کی خالق گوجری زبان کی اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب کتاب میں شامل عنوانات گوجری مقالہ جات، گوجری کہانیاں اور افسانے، گوجری ڈرامہ، گوجری غزل، گوجری نظم، گوجری گیت اور بیت، گوجری ادب کے ادارے، گوجری رسائل و جرائد، مجلّات اور دیگر سرمائے کی مکمل تفصیل پر نظر پڑتی ہے۔'' (۹۲)

مصنف نے مذکورہ عنوانات میں زبان و ادب کی مکمل تفصیل بیان کر کے اپنی محنت شاقہ کا بھرپور ثبوت دیا ہے۔ گوجری زبان کے ارتقاء اور جائزے سے مصنف نے بات واضح کر دی ہے کہ یہ زبان برصغیر کی قدیم بولیوں میں سے ایک ہے۔ گوجر قوم جن جن علاقوں میں آباد ہوئی اپنی زبان کو بھی قائم و دائم رکھا۔ خصوصاً ریاست گجرات میں یہ زبان نشو ونما پاتی رہی۔ مسلمانوں کی برصغیر میں آمد کے بعد یہ زبان عربی اور فارسی میں شامل ہو کر خود کو اُردو میں تبدیل کر دیا۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد یہ زبان پس منظر میں چلی گئی لیکن جلد ہی محققین و مؤرخین نے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ مختلف قبائل اور علاقوں کے باہمی میل جول نے زبانوں کو آپس میں اس طرح مدغم کیا کہ اب اُردو کے علاوہ ان کی پہچان علیحدہ سے کرنا مشکل ہو چکا ہے۔ اکثر الفاظ اب اُردو یا ہندی میں مستقل طور پر شامل ہو چکے ہیں۔ ذرائع نقل و حمل کی ترقی اور تعلیمی شرح بڑھنے کی وجہ سے ہر زبان نے دوسری زبانوں پر گہرے اثرات مرتب کر رکھے ہیں۔ ڈاکٹر صابر آفاقی گوجری پر تحقیق نہ کئے جانے کا نوحہ لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''گوجر قوم اور گوجری زبان کے ساتھ زیادتی یہ ہوتی رہی کہ عرب وعجم کے مؤرخین نے گوجروں کے کتبے اور قدیم تحریریں پڑھنے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ حیرت تو یہ ہے کہ گزشتہ سو سال کی مدت میں ہندو اور مسلم محققین اور ماہر لسانیات نے جو کچھ لکھا وہ بھی تعصب سے لکھا ہے۔ ان میں کوئی بھی غیر جانب دار محقق اور سائنسی ذہن رکھنے والا ماہرِ لسانیات نہ تھا۔ ان کا مقصد غالباً یہی تھا کہ وہ لکھنؤ اور دلی کی عظمت کے گیت گاتے رہیں۔'' (۹۳)

پروفیسر محمد فاروق سولنگی کتاب مذکورہ کی اہمیت اور افادیت پر رائے دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''چوہدری محمد اشرف ایڈووکیٹ کی اپنی ''زمین اور نسل'' سے جذباتی وابستگی زبان و ادب میں ایک سنجیدہ تحقیق کے اضافے کا موجب ہے اور یہی ہمارے مستقبل کے معماروں کے لئے زادِراہ ثابت ہوگی۔ بالخصوص اپنی تاریخ اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کے چھپے ہوئے گوشے بے نقاب کئے جائیں۔ مصنف کی ذاتی لگن اس تحقیق کا باعث بنی جو ہمارے لسانی ادب کی تاریخ کے طلباء کے لئے گرامی قدر اضافہ ہے۔'' (۹۴)

مصنف کی اس کاوش کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ گوجری زبان کی طرف مؤرخین و محققین

نے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔ چوہدری محمد اشرف ایڈووکیٹ نے اس موضوع پر مفصل کتاب لکھ کر اس کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ کتاب کی روشنی میں گوجری زبان کو اُردو ہندی کی صرف مآخذ ہی نہیں بلکہ عملِ ارتقاء کی منزل بھی ملتی ہے۔ تحقیق اسلوب نے اسے مزید اہمیت دے کر مخفی شگوفوں کو نئی شکل سے اجاگر کر دیا ہے۔

۱۴۔ پاکستان میں اُردو (پانچ جلدیں)

پروفیسر فتح محمد ملک، سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، ایسی بلند پایہ شخصیات اور ادارہ مقتدرہ قومی زبان پاکستان نے جو اچھے کام کئے ان میں پانچ جلدوں پر مشتمل کتاب ''پاکستان میں اُردو'' کی اشاعت ہے جسے پروفیسر فتح محمد ملک، سید سردار احمد پیرزادہ اور تجمل شاہ نے مرتب کیا ہے اس کتاب کی پہلی جلد ''سندھ'' دوسری جلد ''بلوچستان'' تیسری جلد ''اباسین'' (سرحد + شمالی علاقہ جات) چوتھی جلد ''پنجاب'' اور پانچویں جلد ''کشمیر'' کے عنوان سے مرتب کی گئی ہے۔ پانچوں جلدیں اُردو کے مختلف علاقوں میں ارتقاء اور پھیلاؤ کو بیان کرتی ہیں ان میں شامل مضامین اہلِ علم اور صاحبِ بصیرت محققین اور ناقدین کے ہیں۔ مندرجات پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اُردو زبان و ادب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مرتبین نے اُردو کی اہمیت اور وسعت کو نہ صرف واضح کر دیا ہے بلکہ اس حقیقت کو بھی بیان کر دیا ہے کہ اُردو علاقائی زبان نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ اثر پورے ملک پر محیط ہے اس سلسلے میں پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> پاکستان میں اُردو کی یہ پانچ جلدیں اسی تلاش و تجسس کا ثمر ہیں۔ یہ حقیقت بڑی خوش آئند ہے کہ سندھ، بلوچستان، پنجاب، اباسین (صوبہ سرحد + شمالی علاقہ جات) اور کشمیر کے ماہرین لسانیات اُردو کی پیدائش اور ابتدائی نشوونما اپنے فوری گرد و پیش میں دیکھتے ہیں۔ ہر چند اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء سے متعلق یہ تمام نظریات لسانی اور تاریخی شواہد پر مبنی ہیں۔ تاہم مجھے اس باب میں سائنسی صداقت سے کہیں زیادہ جذباتی صداقت سے سروکار ہے یہ بات کہ پاکستان کا ہر صوبہ قومی زبان اُردو کو اپنی ہی زبانوں سے پھوٹنے والی ایک زبان قرار دیتا ہے پاکستان کے تہذیبی مستقبل کے لئے ایک بے حد نیک شگون ہے۔ پاکستان کے ہر خطے میں اُردو سے یہ جذباتی لگاؤ ''پاکستان میں اُردو'' کی ہر جلد میں سطر در سطر موجزن ہے۔'' (۹۵)

پروفیسر فتح محمد ملک نے بجا کہا ہے کہ پاکستان کے ہر خطے میں اُردو سے جذباتی لگاؤ ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُردو ایک ایسی زبان ہے جو دوسری علاقائی زبانوں کے ساتھ میل جول پیدا کرتی ہے اور جذب و قبول کی صلاحیت رکھتی ہے اور رابطے کی زبان بن جاتی ہے پہلی جلد ''سندھ'' کے مندرجات بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً: (۱) اُردو کیونکر پیدا ہوئی از سید سلیمان ندوی (۲) اُردو زبان کا اصلی مولد سندھ از سید حسام الدین راشدی (۳) سندھ میں اُردو از پروفیسر رحمت فرخ آبادی (۴) سندھ میں اُردو (آغاز سے ۱۹۷۵ء تک) از ڈاکٹر جمیل جالبی (۵) اُردو سندھی کے لسانی روابط:

تاریخ کی روشنی میں از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی (۴) اُردو اور سندھی کا مشترک صوتی نظام از ماما یا کن ساکو (ٹوکیو) (۷) سرسید کی تحریک کے سندھ اور سندھی ادب پر اثرات از ڈاکٹر محمد یوسف بہت اہم مقالات ہیں۔ سید سلیمان ندوی اُردو کیونکر پیدا ہوئی میں لکھتے ہیں:

''اس زبان کی پیدائش کی وجہ سے مختلف قوموں کا کاروباری اور تجارتی اختلاط اور میل جول تھا اور اسی ضرورت نے اس نئی زبان کو وجود بخشا تھا۔ اس زبان کی پیدائش کی اور پیدائش کی نہ سہی تو اس کے قیام، بقاء اور ترقی کی وجہ اس سے بھی بڑھ کر ناگزیر ایک اور ہے۔ مسلمان جب اس پورے ملک پر حکمراں ہوئے تو گو فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے ان کے ساتھ آئی تاہم ایک ایسی قوم کے لئے جن کا تعلق پورے ملک سے ہو اس ملک میں کوئی ایک بھی متحدہ اور مشترکہ زبان موجود نہ تھی۔ لکھے پڑھے تو خیر آج کی انگریزی کی طرح کل کی فارسی سے کام چلا لیتے تھے مگر ان پڑھ ناخواندہ اور عوام کے لئے ایک ایسی زبان کی سخت ضرورت تھی جو پورے ملک کی بول چال، آمد و رفت اور کاروبار میں کارآمد ہو اور بعینہ یہی ضرورت آج بھی موجود ہے۔'' (۹۶)

اُردو زبان کاروباری اور تجارتی اختلاط کا نتیجہ تھی۔ سید سلیمان ندوی کا یہ مقالہ اُردو زبان کی پیدائش پر جامع روشنی ڈالتا ہے جس کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ سندھ میں اُردو کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''پنجابی؛ ملتانی اور اُردو کے اس قدیم گہرے اور حقیقی رشتے سے واقف ہو کر جب ہم پنجابی، ملتانی اور سندھی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بھی ایک دوسرے سے بہت قریب نظر آتی ہیں۔ اہلِ تحقیق کی رائے ہے کہ ملتانی اور سندھی ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے ایک تھیں اور آج بھی سندھی بولنے والے کے لئے سرائیکی اور سرائیکی بولنے والے کے لئے سندھی زبان اجنبی نہیں ہے۔ جس طرح ملتانی و پنجابی سے اُردو کا گہرا رشتہ و تعلق ہے اسی طرح سندھی سے بھی اُردو کا ویسا ہی بنیادی و قدیم رشتہ ہے اُردو زبان ہر اس علاقے میں تیزی سے پروان چڑھی جہاں مختلف اقوام کو سیاسی اور معاشرتی سطح پر ایک دوسرے سے ملنے جلنے کی ضرورت پیش آئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے سندھ میں ہوئی اور معاشرتی سطح پر ملنے جلنے کی ضرورت بھی سب سے پہلے یہیں پیش آئی۔ موہنجودڑو کی طرح، آج تاریخ کی گرد کی دبیز تہہ نے اس تعلق سے پیدا ہونے والی زبان پر ظلماتِ ماضی کے پہاڑ کھڑے کر دیئے ہیں اور جو کچھ تھا وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے لیکن پھر بھی تاریخ کا مطالعہ کچھ نہ کچھ نشان دہی ضرور کرتا ہے جس سے واضح نتائج نکالے جا سکتے ہیں''۔ (۹۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے پنجابی، ملتانی (سرائیکی) اور اُردو کے گہرے رشتے پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے وہ غورِ

طلب ہے تاہم سندھی اور ملتانی (سرائیکی) کا آپس میں جو تعلق ہے وہ بھی اُردو کے تعلق تک جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے سندھ میں ہوئی۔اس لئے اُردواور سندھی کا گہرا تعلق ہے۔ ''پاکستان میں اُردو'' کی دوسری جلد''بلوچستان'' ہےاس جلد کے مندرجات بھی اُردو کی تاریخ فہمی کے لئے بہت اہم ہیں جس میں مندرجہ ذیل قابلِ غور ہیں۔ (۱) کیا اُردو کا اصل مولد بلوچستان ہے از ڈاکٹر عبدالرزاق صابر (۲) بلوچستان میں اُردو کا سفر از غوث بخش صابر (۳) بلوچستان میں اُردو از ڈاکٹر انعام الحق کوثر (۴) بلوچستان میں رابطے کی زبان اُردو از بیرم غوری (۵) بلوچستان میں اُردو: پس منظر اور پیش منظر پروفیسر ایم انور رومان (۶) بلوچستان کی اُردو روایت از ڈاکٹر جمیل جالبی بہت اہم مقالات ہیں تاہم اس جلد میں ۵۷ مقالات ہیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ڈاکٹر عبدالرزاق صابر لکھتے ہیں:

''بلوچستان'' ہی وہ خطہ ہے جہاں اہلِ عرب، اہلِ فارسی اور اہلِ ہند آپس میں ملتے ہیں۔ نیز بلوچستان کی قدیم تاریخ اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ کسی زمانے میں کردی اور تورانی زبانیں بھی اس خطے میں بولی جاتی رہی ہیں جو عربی اور فارسی سے مل کر ایک نئی زبان کا ہیولیٰ تیار کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوئی ہیں۔گمان ہے کہ بلوچستان کے علاقے مکران اور جھالاوان وساراوان (وادی خضدار، قلات) وہ مقامات ہیں جہاں یہ ہیولیٰ تیار ہوا ہوگا۔ اہلِ عرب کے برصغیر پاک و ہند میں داخل ہونے سے پہلے بلوچستان میں جن زبانوں سے واسطہ پڑتا ہے ان میں قدیم پہلوی کی ہم عصر بلوچی زبان، ایک پروٹو دراوڑی یا قدیم تورانی زبان براہوئی اور قدیم زمانے میں بلوچستان میں مروج جٹکی زبان شامل ہیں۔ تاہم مکران اور توران ہی وہ علاقے ہیں جہاں اہلِ عرب اور اہلِ ہند کا ملاپ ہو لہٰذا اگر پنجاب، سندھ، دکن، سرحد اور دلّی کو اُردو کا پہلا مرکز کہا جاسکتا ہے تو اس اعتبار سے بلوچستان جو کہ اصل باب الاسلام بھی ہے اور یہی خطہ اُردو کا مؤلد بھی ،اس کے علاوہ اس صوبے کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہاں سے ایک ایسی زبان کا خمیر اٹھا جو آگے چل کر پورے برِصغیر میں رابطے کی زبان بننے کے علاوہ دنیا کی اہم زبانوں میں شامل ہوئی۔'' (۹۸)

ڈاکٹر عبدالرزاق صابر نے بلوچستان میں اُردو کے مولد کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ اُردو کی وسعت پذیری کو ثابت کرتا ہے اُردو جس انداز سے مختلف علاقوں میں پھیلی اور جن زبانوں کے ساتھ میل جول پیدا کیا ہے وہ ڈاکٹر موصوف نے بہت ہی اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے''بلوچستان میں اُردو'' پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''اہلِ بلوچستان کے لئے اُردو زبان کی جانب مائل ہونا صرف اس زبان کے بنیادی مزاج ہی کے باعث آسان نہ تھا بلکہ خود اہلِ بلوچستان کا مزاج بھی لسانی تغیر کے لئے برصغیر میں سب سے زیادہ موزوں تھا یہ خصوصیت صرف اسی خطے کے لوگوں کو حاصل ہے کہ وہ بیک وقت ذواللسان ہیں۔ قلات اور مکران ڈویژنوں میں اکثر لوگ بلوچی اور براہوئی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے

ہیں۔مغربی بلوچستان میں بلوچی اور پشتو بولنے والے اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔جنوبی ومشرقی بلوچستان میں سندھی اور براہوئی دونوں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔شمالی ومشرقی بلوچستان میں سرائیکی، بلوچی اور پشتو تینوں بولی جاتی ہیں اور کوئٹہ جو بلوچستان کا مرکز ہے، لسانی تنوع کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز منظر پیش کرتا ہے۔اس میں براہوئی، بلوچی اور پشتو کے علاوہ فارسی، اُردو، سرائیکی اور پنجابی بولنے والے افراد بھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں اور قریب قریب ہر فرد تین تین چار چار زبانیں بیک وقت آسانی اور روانی سے بول سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اہلِ بلوچستان کے لئے اُردو کے لئے اُردو کو اپنا لینا قطعاً مشکل نہ تھا۔''(۹۹)

ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اُردو زبان کو بلوچستان کے لوگوں کے مزاج سے ہم آہنگ قرار دیا ہے اور بہت ہی عمدگی سے بلوچستان میں اُردو کی اثر پذیری کو بیان کیا ہے پاکستان اُردو کی تیسری جلد (اباسین سرحد + شمالی علاقہ جات) کے عنوان سے مرتب کی گئی ہے جس میں صوبہ خیبر پختون خواہ اور شمالی علاقہ جات شامل ہیں۔اس کے مندرجات قابلِ توجہ ہیں ۴۲ مقالات شامل ہیں: جس میں مندرجہ ذیل قابلِ غور ہیں (۱) سرحد میں اُردو از فارغ بخاری (۲) سرحد میں اُردو از پروفیسر محسن احسان (۳) سرزمین اباسین اور اُردو از ڈاکٹر ممتاز منگلوری (۴) سرحد میں اُردو (ایک اجمالی جائزہ) از احمد پراچہ (۵) سرحد میں اُردو روایت از ڈاکٹر جمیل جالبی (۶) اباسین، اُردو اور قومی یک جہتی از تجمل شاہ وغیرہ شامل ہیں۔فارغ بخاری سرحد میں اُردو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دلی اور لکھنؤ کو اُردو کے مراکز قرار دینے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ مقامات شاہان وقت کے پایۂ تخت تھے اور زبان کی نشو ونما اور ترویج وترقی کے اعتبار سے ان مراکز کی اہمیت مسلم ہے لیکن اُردو جو سنسکرت اور فارسی کے اختلاط کا نتیجہ تھی، اس کا خمیر سرحد کے سنگلاخ ماحول میں اس وقت سے تیار ہو رہا تھا جب ایرانیوں نے پہلے پہل ہندوستان کو سونے کی چڑیا جان کر اس پر دھاوے بولنے شروع کیے۔یہاں ایرانیوں کی آمد کا آغاز ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی کے حملوں سے ہوا اور سترھویں صدی میں نادر شاہ درانی کے عہد تک مسلسل یہ یلغار جاری رہی۔ظاہر ہے کہ اجنبی حملہ آوروں کو اپنی رہنمائی کے لئے یہاں کے باشندوں سے مدد لینا پڑی اور لسانی اجنبیت دور کرنے کے لئے ایک دوسرے کے قریب ہونا پڑا آپس کے ربط وضبط اور میل جول سے ایک دوسرے کے الفاظ سیکھنا پڑے۔جس سے غیر ارادی طور پر ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑی اور یہی بولی بعد میں ''ریختہ'' کہلائی۔''(۱۰۰)

فارغ بخاری نے ایرانیوں کے حملے کو اُردو کا آغاز قرار دیا ہے ان کا نکتہ نظر قابلِ تحقیق ہے۔تاہم پروفیسر محسن احسان نے سرحد میں اُردو پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''قیامِ پاکستان سے نصف صدی پہلے بھی اُردو زبان صوبہ سرحد کے بڑے بڑے شہروں کے علاوہ

دورافتادہ علاقوں میں بھی اپنے اثرات رکھتی تھی۔ یہ وہاں بھی بولی، پڑھی لکھی اور سمجھی جاتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد اس کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوا۔ آپ پاکستان کے شمالی علاقہ جات یا جنوبی اضلاع میں چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں جائیں، آپ کو بات سمجھنے یا سمجھانے میں دقت محسوس نہیں ہوگی۔ یہ پرانی نسل کے لوگ ہوں گے یا نئی نسل کے نمائندے سبھی بڑے اعتماد کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرتے ہیں۔ پرائمری سے بڑی جماعتوں تک اس میں تعلیم ہوتی ہے۔ علاقائی زبانوں کے اثرات اُردو زبان کے ذخیرہ الفاظ بکثرت استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ گفتگو میں مقامی لب ولہجہ بڑی آسانی سے علاقے کی نشاندہی کا باعث بن جاتا ہے۔'' (۱۰۱)

پروفیسر محسن احسان قیام پاکستان سے ۵۰ سال پہلے کی بات کر رہے ہیں جب اُردو صوبہ سرحد کے قریہ قریہ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اور ادب میں بھی اس زبان کی اہمیت تھی۔

پاکستان میں اُردو کی چوتھی جلد بہت اہم ہے جو پنجاب کے عنوان سے مرتب کی گئی ہے۔ اس جلد میں تمام مندرجات سب سے اہم ہیں اس جلد میں ۶۳ مقالات شامل ہیں جن میں حافظ محمود شیرانی کے چار مقالات بہت اہم ہیں۔ (۱) اُردو کا ارتقاء کس زبان سے ہوا (۲) پنجاب میں اُردو کی سرگزشت کا ایک فراموش شدہ ورق (۳) اُردو قدیم کے متعلق چند تصریحات (۴) پنجاب میں قدیم اُردو ادب، اس کے علاوہ دیگر مقالات بھی اہمیت سے خالی نہیں ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک کا مقالہ پنجاب کی مادری زبان اُردو ہے بھی بہت اہم ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''حافظ محمود شیرانی نے لسانی تحقیق کے جدید سائنسی اصولوں کی روشنی میں یہ حقیقت روشن تر کر دی کہ اُردو زبان کا مولد پنجاب ہے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے بتایا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کا انتظام اہلِ پنجاب نے چندہ جمع کر کے کیا تھا اس کتاب کی اشاعت نے بیس برسوں پر محیط بحث کو ایسی تکمیلی شان عطا کی کہ اُردو کے پنجابیوں کی مادری زبان ہونے کے جذباتی صداقت سائنسی حقیقت کا روپ دھار گئی۔'' (۱۰۲)

پروفیسر فتح محمد ملک کا مقالہ اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ اُردو اور پنجاب کا جو جذباتی تعلق ہے وہ اس مقالے سے واضح ہو جاتا ہے پروفیسر حافظ محمود شیرانی اُردو قدامت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہم اُردو کے آغاز کو شاہجہاں یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں لیکن یہ زبان اس زمانے سے بہت زیادہ قدیم ہے۔ بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود ان ہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں اُردو کی قدامت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ گجرات و دکن میں اس زبان میں دسویں صدی ہجری کی ابتداء میں یعنی بابر کی آمد سے قبل سے ادبیات کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے اور فارسی لغات کی شہادت سے جو نویں صدی ہجری میں

ہندوستان میں لکھی جاتی ہیں۔ صاف واضح ہوتا ہے کہ اُردو زبان ان ایام میں، تمام اسلامی ہندوستان میں سمجھی جاتی تھی۔ یہ لغات نگار اس کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ہندی سے ان کا مقصد یہی زبان ہے جسے ہم اُردو کہتے ہیں۔'' (۱۰۳)

تاہم پروفیسر حافظ محمود شیرانی اُردو اور پنجابی کے اشتراک پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''آٹھویں اور نویں صدی ہجرت کی کتب تاریخ و لغات کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ہندوستان لاکھ کو''لک''، پاگ کو''پگ''، کھانڈ کو''کھنڈ'' بھانڈ کو''بھنڈ''، ماٹ کو''مٹھ''، آنب کو''انب''، مونگ کو''منگ'' گاڑی کو''گڈی''، گڑیا کو''گڈی''، تالاب کو''تل'' بڑی جھیل کو''دھنڈ'' اور چقندر کو''گنگلو'' یا''گانگلو'' کہتے تھے۔ اہلِ پنجاب میں ان الفاظ کو آج بھی لکھ، پگ، کھنڈ، بھنڈ، مٹھ، انب، منگ، گڈی، گڈی، دھنڈ اور گونگلو بول رہے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ اُردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم ہے ان میں مشترک تھا، رفتہ رفتہ اُردو زبان سے خارج ہوتا رہا ہے۔'' (۱۰۴)

زبانوں میں جو اشتراک ظاہر کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو اور پنجابی کا گہرا تعلق ہے۔ پنجابی نے ابتداً ہی اُردو پر اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔

پاکستان میں اُردو کی پانچویں جلد''کشمیر'' کے عنوان سے مرتب کی گئی ہے جس کے تمام مندرجات بہت اہم ہیں۔ اس میں ۳۲ مقالات شامل کئے گئے ہیں تاہم مندرجہ ذیل مقالات کلیدی نوعیت کے ہیں۔ (۱) کشمیر میں اُردو زبان کا ارتقاء از ڈاکٹر محمد صغیر خان (۲) کشمیر میں اُردو از حبیب کیفوی (۳) آزاد کشمیر میں نفاذ اُردو از پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر (۴) اُردو اور پہاڑی کے لسانی روابط از میاں کریم اللہ قریشی کرناہی وغیرہ شامل ہے تاہم دوسرے مقالات بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد صغیر خان کشمیر میں اُردو زبان کا ارتقاء کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کشمیر میں ڈوگرہ راج کا آغاز ایسے وقت میں ہوا جب اُردو ہندوستان (برِصغیر) میں ابتدائی تشکیلی مراحل تیزی سے طے کرتے ہوئے ایک واضح اور مستحکم زبان کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ لہٰذا سکھوں کے عہد میں دربار لاہور سے وابستگی کے باعث پنجاب سے اُردو ادب وصحافت کی نئی اٹھنے والی تحریکوں نے جموں کی راہ بھی دیکھ لی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے اُردو شعر وادب کی روایات بھی مختلف ذریعوں سے جموں و کشمیر میں روشناس ہونے لگی تھیں۔'' (۱۰۵)

ڈاکٹر موصوف نے سکھوّں کے عہد میں اُردو کا کشمیر میں مولد ثابت کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کشمیر میں اُردو کی قدامت کے اس طرح قائل نہیں ہیں جس طرح دوسرے علاقے کے اہل علم قائل ہیں حبیب کیفوی اپنے مقالے ''کشمیر میں اُردو'' میں لکھتے ہیں:

''جموں تو بہر حال پنجاب سے ملحق تھا اس لئے جموں میں اہلِ پنجاب کی آمدورفت اور پنجاب کے شہریوں کا جموں والوں کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔ اس لئے دونوں علاقوں کے باشندے ایک دوسرے سے متاثر ہوتے تھے البتہ کشمیر کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ مواصلاتی نظام نہ ہونے کی وجہ سے شروع میں ہندوستان کے باشندوں کی کشمیر میں آمدورفت آسان نہ تھی لیکن جب مری کوہالہ روڈ اور بانہال روڈ کی تعمیر ہوگئی تو کشمیر پہنچنے میں آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ ہر مکتب فکر کے لوگ کشمیر پہنچنے لگے اور قریبی رابطہ قائم ہونے سے کشمیر میں اُردو کو روز بروز فروغ حاصل ہونے لگا۔'' (۱۰۶)

حبیب کیفوی نے اُردو اور کشمیر کا جو تعلق بیان کیا ہے وہ پنجاب کے توسط سے قائم ہوا۔ جب لوگ پنجاب سے کشمیر پہنچے تو اُردو بھی کشمیر پہنچی۔ مصنف موصوف کشمیر میں اُردو کی پیدائش اور ارتقاء پر زور دیتے ہیں۔

پاکستان میں اُردو کی پانچوں جلدوں میں سیر حاصل مقالات موجود ہیں۔ اُردو کا آغاز و ارتقاء مختلف علاقوں میں اس کی نشوونما، زبان سے ادب کا سفر، مختلف زبانوں سے اثر پذیری، اُردو ادب کا مختلف اصناف میں ارتقاء تحقیق، تنقید، تخلیقی ادب میں اُردو ادب آغاز سے عصر حاضر تک کا سفر پیش کیا گیا ہے کہا جاسکتا ہے کہ مقتدرہ قومی زبان کا یہ واحد کارنامہ ہے جو ناقابلِ فراموش رہے گا۔

۱۵۔ ہزارہ میں اُردو زبان وادب کی تاریخ (پروفیسر بشیر احمد سوز)

ہزارہ اُردو زبان و ادب کی تاریخ کے مؤلف پروفیسر بشیر احمد سوزؔ ہیں۔ اُن کی یہ کتاب جون ۲۰۱۰ء کو ادبیاتِ ہزارہ سے شائع ہوئی۔ کتاب کا انتساب محسنین ادبیاتِ ہزارہ جناب ابوزین پیر سیّد محی الدین محبوب، مدظلہ العالیٰ، جناب محمد ہارون اور جناب قاضی محمد اصغر کے نام کیا ہے۔ (۱۰۷)

سرزمینِ ہزارہ میں بے شمار مخلص اور دردمند سیاسی رہنما، باکمال نامور شعراء، حساس و ہمدرد ادیب، شجیع اور کھرے صحافی، شہرت یافتہ ٹی وی اور سٹیج کے اداکار، ان گنت سوشل ورکر، نامور مبلغینِ اسلام، مشائخ عظام غرض ہر شعبہ زندگی سے وابستہ افراد ملیں گے لیکن ان سب پر شعراء اور ادیب بازی لے گئے کیونکہ باقی شعبہ ہائے زندگی سے جڑے افراد کو کوئی پروفیسر بشیر احمد سوز میسر نہیں آیا۔ پروفیسر بشیر احمد سوزؔ جیسے بلند پایہ، آشنائے فن، قابل محقق اور نقاد نے ''ہزارہ میں اُردو زبان و ادب کی تاریخ'' کو نہایت محنت و شفقت، عرق ریزی اور دیدہ دری سے تصنیف کر کے انہوں نے ہزارہ کے عظیم سرمائے کو محفوظ کیا۔ ہزارہ کی تہذیب و تمدن، سماجی و سیاسی اور عصری تاریخ نے اسے حیاتِ جاوداں بخشی ہے جس کے مطالعے سے نہ صرف گونہ مسرت ہوتی ہے بلکہ اس کی چاشنی، لطافت اور رنگینی ہمارے ذوق مطالعہ کو طمانت اور آسودگی کی دولت سے بھی ہمکنار کرتی ہے۔ مصنف نے کتاب کا آغاز ہزارہ میں اُردو زبان و ادب۔ ایک مختصر جائزہ سے کیا ہے۔ اس حوالے سے

پروفیسر بشیر احمد سوزؔ لکھتے ہیں:

''اُردو زبان نے سرحد میں جنم لیا۔ دلی، لکھنؤ، دکن، آگرہ، امروہہ، روہیلکھنڈ نے اسے پالا پوسا اور پنجاب نے اس کے منہ زور شباب کو بھٹکنے اور آوارگی کی طرف مائل ہونے سے بچا کر اس سے وہ تعمیری کام لیا جس سے اُردو ادب میں عہد بہ عہد ترقی ہوئی۔ اُردو زبان کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کے بارے میں بیسیوں نظریات سامنے آچکے ہیں کہ ہر علاقہ اُردو کا ملجاو ماویٰ بننے کو تیار ہے لیکن اس مضمون کا تقاضا یہ ہے کہ اُردو کسی حد تک فارسی زبان نے ہزارہ کی سرزمین پر قدم رکھ کر یہاں کے لوگوں کے ذہنوں کو کس قدر جلا بخشی اور ادب کی تخلیق میں کیا کردار ادا کیا۔ جب غزنویوں، غوریوں اور مغلوں کی ہندوستان میں آمد اور حکمرانی سے فارسی زبان نے یہاں ایسے بیج بوئے کہ یہاں کی مقامی بولیوں نے فارسی کے گہرے اثرات قبول کئے۔ یہی ملاپ اُردو کی صورت میں بھی نمایاں ہوا اور اسی زبان (فارسی) نے نہ صرف یہاں کی تہذیب وتمدن میں اپنے رنگ بھرئے بلکہ فارسی کی جملہ اصناف کو بھی اُردو کے دامن میں بھر دیا''۔ (۱۰۸)

مؤلف کے نزدیک اُردو اور کسی حد تک فارسی زبان نے جب ہزارہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو ہزارہ ان زبانوں کی شیرنی اور مٹھاس سے بہرہ مند ہوتا رہا۔ تاریخ ہزارہ میں زبان وادب کی تاریخ کو پروفیسر بشیر احمد سوزؔ نے مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جس میں ہزارہ میں اُردو زبان وادب ۔۔۔ ایک مختصر جائزہ پیش کرنے کے بعد حصہ شاعری میں ہزارہ کے شعراء کا شخصیت وفن کے حوالے سے تذکرہ شامل کیا ہے۔ شعراء کے تذکرے میں مصنف نے تقریباً پانچ سو سے زائد شعراء کے فن اور شخصیت پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ رعبایات، قطعات، گیت، ماہیا، ہائیکو، دوہے اور طنزیہ ومزاحیہ شاعری وغیرہ بھی شامل ہیں۔ کتاب مذکورہ میں جہاں حصہ شاعری کے عنوانات اہمیت کے حامل ہیں وہاں حصہ نثر کی انفرادیت بھی اپنی جگہ ہے۔ حصہ نثر میں ہزارہ میں اُردو نثر، تحقیق وتنقید، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نویسی، انشائیہ نگاری، خاکہ نگاری، سوانح نگاری، تاریخ، دیگر تاریخی کتب، سفرنامہ، تذکرہ علمائے ہزارہ، تذکرہ صاحب تصنیف، مشائخ، عظام، دین و مذہب کے حوالے سے چند کتب، متفرق موضوعات پر کتب، ہزارہ میں صحافت، اُردو ادب میں مزاح نگاری، علمی وادبی جرائد اور مجلّے اور ہزارہ کی علمی وادبی انجمنین وغیرہ شامل ہیں۔ پاکستان جیسے ترقی پذیر اور غریب ملک میں جہاں زندگی کی بنیادی سہولیات کا حصول مشکل ہے۔ وہاں پر بہت سے ایسے لکھاری موجود ہیں جو اپنے محدود حلقے میں تو داد پاتے ہیں اور اُن کی پہچان بھی بنتی ہے۔ لیکن وسائل کی کمی اور ذرائع کی عدم دستیابی کی وجہ سے وہ کسی بڑے پلیٹ فارم تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کتاب میں ایسے کئی شعراء اور نثر نگاروں کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں ہزارہ کی ادبی سرگرمیوں کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے جس سے کتاب کی آفادیت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ مؤلف کی یہ کتاب اُن کا اہم کارنامہ ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ مؤلف لائق تحسین اور مبارک باد کے حقدار ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد طفیل، مدیر، ماہنامہ نقوش (ادبی معرکے نمبر ۲)، ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ص۔۲، ۳

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو اَدب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۔۱۸۳

۳۔ نصیرالدین ہاشمی، دکن میں اُردو، بک ٹاک، میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۔۴

۴۔ ایضاً ص۔۲

۵۔ ایضاً ص ص۔۴، ۵

۶۔ ایضاً ص ص۔۶۳، ۶۴

۷۔ ایضاً ص ص۔۹۰، ۹۱

۸۔ ایضاً ص۔۲۵۶

۹۔ ایضاً ص۔۳۰۱

۱۰۔ ایضاً ص۔۳۶۷

۱۱۔ ایضاً ص۔۶۷۰

۱۲۔ محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اُردو (حصّہ اول)، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، طبع دوم، ۱۹۹۸ء، ص۔۳

۱۳۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، حرفِ آغاز، مشمولہ پنجاب میں اُردو (از حافظ محمود شیرانی)، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء طبع دوم، ص۔۱

۱۴۔ ایضاً ص۔۲

۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو اَدب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، طبع اوّل، فروری ۱۹۹۱ء، ص۔۴۲

۱۶۔ محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اُردو، ص۔۱۱۰

۱۷۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، ''کتابِ خانہ شیرانی کے نوادِر'' مشمولہ اورینٹل کالج میگزین (شیرانی نمبر)، فروری ۱۹۴۷ء، ص۔۴۰

۱۸۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، دیباچہ، مشمولہ مقالاتِ، حافظ محمود شیرانی (حصّہ اول)، مظہر محمود شیرانی (مرتبہ) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص۔۶

۱۹۔ مظہر محمود شیرنی، حافظ محمود شیرنی اوران کی ادبی خدمات، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۔۱۹۷
۲۰۔ مظہر محمود شیرنی، ڈاکٹر، مرتب، مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (جلد پنجم)، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، جون ۱۹۹۹ء، ص۔۶۲۵
۲۱۔ محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اُردو، ص ص۔۲۸۷، ۲۴۸
۲۲۔ ایضاً ص۔۳۰۱
۲۳۔ ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، غضنفر اکیڈمی، پاکستان، کراچی، طبع دوم، ۱۹۸۷ء، ص۔۱۱
۲۴۔ ایضاً ص۔۱۱
۲۵۔ ایضاً ص۔۱۵
۲۶۔ ایضاً ص۔۱۳
۲۷۔ ایضاً ص۔۴۰۵
۲۸۔ ایضاً ص ص۔۴۲۹، ۴۳۰
۲۹۔ ایضاً ص ص۔۵۸۸، ۵۸۹
۳۰۔ ایضاً ص۔۵۸۹
۳۱۔ ایضاً ص۔۶۰۷
۳۲۔ نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر، دہلی کا دبستانِ شاعری، بک ٹاک، میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۔۷
۳۳۔ ایضاً ص ص۔۸، ۹
۳۴۔ ایضاً ص۔۹
۳۵۔ ایضاً ص۔۲۴۲
۳۶۔ محمد باقر، ڈاکٹر، اُردوئے قدیم (دکن اور پنجاب میں)، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اوّل، اگست ۱۹۷۲ء، ص۔۲
۳۷۔ ایضاً ص ص۔(الف، ب)
۳۸۔ ایضاً ص۔۳
۳۹۔ محمد ذکریا، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد اوّل)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۹ء، ص۔۲
۴۰۔ مجاہد کامران، پروفیسر ڈاکٹر، طبع دوم، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد اوّل)، ص۔۵
۴۱۔ محمد ذکریا، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد اوّل)، فہرست

۴۲۔ ابوسعید نورالدین، ڈاکٹر، تاریخِ ادبیاتِ اُردو (حصّہ اوّل)، مغربی پاکستان، اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص۔۱۳

۴۳۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اُردو کی پیدائش اور ارتقاء، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد اوّل)، ص۔۳۶

۴۴۔ حمیدالدین شاہد باشتراک تبسم کاشمیری، ادبیاتِ گولکنڈہ مشمولہ، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد اوّل)، ص۔۲۴۱

۴۵۔ رؤف پاریکھ، مرتب، اُردو تحقیق و تدوین کا تاریخی و تنقیدی جائزہ، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص۔۱۷۳

۴۶۔ محمد زکریا، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد اوّل)، ص ص۔۳۱، ۳۲

۴۷۔ محمد زکریا، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد دوم)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۹ء، ص۔۷

۴۸۔ ایضاً ص۔۴۷

۴۹۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''میر تقی میر''، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد دوم)، ص ص۔۹۸، ۱۰۲

۵۰۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر، ''مرزا محمد رفیع سودا''، مشمولہ ایضاً ص۔۳۷

۵۱۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، ''قائم چاند پوری''، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد دوم)، ص۔۱۳۸

۵۲۔ محمد صادق، ڈاکٹر، نظیر اکبرآبادی، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد دوم)، ص۔۱۶۸

۵۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، اُردو شاعری لکھنؤ میں، مشمولہ ایضاً ص۔۲۳۶

۵۴۔ ایضاً ص۔۲۴۷

۵۵۔ محمد زکریا، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد سوم)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع دوم، مارچ ۲۰۱۰ء، (اضافہ و نظر ثانی کے بعد)، ص۔۲

۵۶۔ ایضاً ص ص۔۱۲۰، ۱۲۲

۵۷۔ راحت افزا بخاری، شیخ محمد ابراہیم ذوق، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد سوم)، ص۔۱۱۸

۵۸۔ ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر، اُردو مرثیہ لکھنؤ میں (میر ببر علی انیس)، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد سوم)، ص۔۲۰۱

۵۹۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، اُردو کی ابتدائی صحافت، مشمولہ ایضاً ص۔۲۳۴

۶۰۔ محمد زکریا، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، (جلد چہارم)، طبع دوم ۲۰۱۰ء، ص (الف)
۶۱۔ ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر، داغ دہلوی اور امیر مینائی، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد چہارم)، ص۔۲۱۴
۶۲۔ گیان چند، ڈاکٹر، اُردو میں تحقیق و تدوین، مشمولہ اُردو تحقیق و تدوین کا تاریخی و تنقیدی جائزہ، مرتب رؤف پاریکھ، ص۔۱۲۹
۶۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تاریخ کی تشکیل نو کے مسائل، مشمولہ ادبی تاریخ نویسی، مرتبین ڈاکٹر سید عامر سہیل/نسیم عباس احمر، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، طبع دوم ۲۰۱۵ء، ص۔۵۴، ۵۵
۶۴۔ فیاض محمود، گروپ کیپٹن سید، مدیرِ خصوصی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (اُردو ادب)، جلد پنجم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع اوّل، فروری ۱۹۷۲ء، ص۔۵
۶۵۔ ایضاً ص۔۲۹
۶۶۔ ایضاً ص ص۔۲۶۱، ۲۶۲
۶۷۔ ص۔۶۷۱
۶۸۔ شاہدہ بیگم، ڈاکٹر، سندھ میں اُردو، اُردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص۔۴
۶۹۔ ایضاً ص ص۔۱۳، ۱۴
۷۰۔ ایضاً ص۔۳۶
۷۱۔ ایضاً ص۔۹۹
۷۲۔ ایضاً ص۔۱۲۲
۷۳۔ ایضاً ص۔۱۸۶
۷۴۔ ایضاً ص۔۲۹۳
۷۵۔ سید سلیمان ندوی، نقوشِ سلیمانی، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۔۲۳
۷۶۔ علی محمد خان، ڈاکٹر، لاہور کا دبستانِ شاعری، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص۔۹
۷۷۔ ایضاً ص۔۱۴
۷۸۔ ایضاً ص۔۵۷
۷۹۔ ایضاً ص۔۱۴۷

۸۰۔ ایضاً ص۔۲۵۷

۸۱۔ ایضاً ص۔۵۳۰

۸۲۔ محمد اشرف، چوہدری ایڈووکیٹ، اُردو کے خالق گوجری زبان، کیپٹل پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ص ۲، ۳

۸۳۔ کے ایم منشی، گوجر زبان، مشمولہ تاریخِ گوجر، علی حسن چوہان، (مرتب) انٹرنیشنل پریس، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص۱۲۲

۸۴۔ محمد اشرف، چوہدری ایڈووکیٹ، اُردو کی خالق گوجری زبان، ص ص۔۱۱، ۱۲

۸۵۔ عبدالباقی نسیم، گوجر اور گوجری زبان، گوجری ادبی بورڈ، پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۔۹

۸۶۔ محمد اشرف، چوہدری ایڈووکیٹ، اُردو کی خالق گوجری زبان، ص ص۔۸۷، ۸۸

۸۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو (جلد اوّل)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ص۔۹۲، ۹۳

۸۸۔ محمد اشرف، چوہدری ایڈووکیٹ، گوجروں کا عروج و زوال، نوائے گوجر پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء، ص ص۔۲۲، ۲۳

۸۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو (جلد اوّل)، ص۔۱۳۰

۹۰۔ محمد اشرف، چوہدری ایڈووکیٹ، اُردو کی خالق گوجری زبان، ص۔۶۱

۹۱۔ ایضاً، ص ص ص۔۷۹، ۸۰، ۸۱

۹۲۔ ایضاً، ص ص۔۱۴۵، ۱۵۳

۹۳۔ صابر آفاقی، پروفیسر ڈاکٹر، اُردو کی ماں گوجری، مشمولہ اُردو کی خالق گوجری، چوہدری اشرف ایڈووکیٹ، ص۔۱۷۰

۹۴۔ محمد فاروق سولنگی، پروفیسر، گوجری اور اُردو، مشمولہ، اُردو کی خالق گوجری، ص۔۱۷۳

۹۵۔ فتح محمد ملک، پروفیسر سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، (مرتبین) پاکستان میں اُردو (جلد اوّل)، سندھ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء، ص۔۳

۹۶۔ ایضاً ص۔۷

۹۷۔ ایضاً ص۔۳۱

۹۸۔ فتح محمد، پروفیسر سید ملک سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، مرتبین پاکستان میں اُردو (جلد دوم) بلوچستان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء، ص۔۱۴

۹۹۔ ایضاً ص۔۲۰

۱۰۰۔ فتح محمد، پروفیسر سید ملک سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، مرتبین پاکستان میں اُردو (جلد سوم) اباسین (سرحد

+ شمالی علاقہ جات)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء، ص۔۱

۱۰۱۔ ایضاً ص۔۲۲

۱۰۲۔ فتح محمد، پروفیسر سید ملک سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، مرتبین پاکستان میں اُردو (جلد چہارم) پنجاب، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء، ص۔۴، ۵

۱۰۳۔ ایضاً ص۔۶

۱۰۴۔ ایضاً ص۔۸

۱۰۵۔ فتح محمد، پروفیسر سید ملک سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، مرتبین پاکستان میں اُردو (جلد پنجم) کشمیر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء، ص ص۔۱، ۲

۱۰۶۔ ایضاً ص ص۔۲۰، ۲۱

۱۰۷۔ بشیر احمد سوز، پروفیسر، ہزارہ میں اُردو زبان و ادب کی تاریخ، ادبیاتِ ہزارہ، جون ۲۰۱۰ء، ص۳

۱۰۸۔ ایضاً ص ۶

باب پنجم: عہدوار تاریخ نگاری

عہدوار تاریخ نگاری مقالے کا پانچواں باب ہے اس باب میں وہ کتب شامل ہیں جو مختلف ادبی ادوار کے حوالے پیش کرتی ہیں۔ اُردو زبان وادب کے آغاز وارتقاء کے حوالے سے جو کتب کسی ایک دور کا احاطہ کرتی ہیں وہ بھی اس باب میں شامل ہیں۔ اُردو ادب نے مختلف ادوار میں کئی تحریکوں کو جنم دیا ہے اس لئے ادبی تحریکوں پر مشتمل کتب بھی اسی باب کا حصہّ ہیں دوسرے ابواب کی طرح اس باب کی ترتیب بھی زمانی اعتبار سے کی گئی ہے۔

۱۔ داستان تاریخِ اُردو (حامد حسن قادری)
(ابتداء سے بیسویں صدی کے آغاز تک)

داستان تاریخِ اُردو حامد حسن قادری کی تین سالہ محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے اس کام کا آغاز کیا تھا جو ۱۹۴۱ء کو مکمل ہوا۔ ''داستان تاریخِ اُردو'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں اور دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں آیا یہ انیسویں صدی کے اختتام تک ہی کے مصنفوں کا احصا کرتی ہے لیکن تا حال یہ اُردو نثر نگاروں کی بہترین تاریخ ہے۔(۱)

''داستان تاریخِ اُردو'' ابتداء سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک محیط ہے۔ اس کتاب میں پہلے باب کے علاوہ اُردو نثر کے چھ ادوار بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے باب میں آغازِ اُردو سے پہلے کی زبان کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔ اُردو کے ابتدائی نمونے پہلے باب میں درج کئے گئے ہیں۔ محمد غوری کے حملے اور شمالی ہند میں زبان کے آغاز پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔ اُردو کی نشونما میں اولیائے اللہ کا کردار بھی واضح کیا گیا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت خواجہ معین الدینؒ، حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء، علاؤالدین علی احمد صابر کلیری، سراج الدین عثمانی اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی زبان کے لئے خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے صوفیاء کرام کا حوالہ بہت مختصر مگر جامع الفاظ کے ساتھ درج کیا ہے۔

مصنف نے حضرت خواجہ شرف الدین سمنانی کے رسالے کو اُردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ دکن میں آغازِ اُردو گجرات میں آغازِ اُردو، اُردو کی مقبولیت اور اہمیت اور شمالی ہند میں اُردو شاعری کا قدیم دور جیسے موضوعات زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ پہلا باب صرف ۳۶ صفحات پر مشتمل ہے لیکن مصنف نے کمال دانش مندی سے مندرجہ بالا تمام عنوانات کو اتنے کم صفحات میں سمودیا ہے۔ (۲) کتاب کے پہلے ایڈیشن اور بڑھتی ہوئی مانگ کے حوالے سے مصنف

دوسرے دیباچے میں کہتے ہیں:

''داستان تاریخِ اُردو پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی چھپتے ہی میں نے بہت سے ادیبوں، نقادوں، پروفیسروں اور ایڈیٹروں کو کتاب بھجوائی۔ سب سے پہلے ۳۱ دسمبر، ۱۹۴۱ء کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے دہلی سے ریڈیو پر اس کے متعلق تقریر نشر کی۔ پھر دلّی، لکھنؤ، حیدرآباد دکّن سے دوسرے نقادوں نے بھی ریڈیو پر تبصرہ کیا۔ بعض نے مجھے خطوط میں رائیں لکھیں۔ بعض نے رسائل میں ریویو شائع کرائے۔ چند مہینوں میں کتاب کی اتنی شہرت اور اتنی قدر ہوئی کہ مجھے اس کا تصور بھی نہ تھا۔''(۳)

کتاب کی اہمیت اور قدر و منزلت کا اندازہ مندرجہ بالا اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ کتاب مذکورہ اُردو کی نثری تاریخ پر مشتمل ہے اور تاریخ کو زمانی ترتیب سے درج کیا گیا ہے۔ مناسب واقعوں پر حوالے بھی دئے گئے ہیں۔

اُردو نثر کا پہلا دور ''دکن میں اُردو'' کے عنوان سے دیا گیا ہے۔ اس باب میں سلطنت بہمنی کی تاریخ، عادل شاہی حکومت قطب شاہی دور، دکن بعہد مغلیہ اور دکن میں عہد مغلیہ کے بعد کے دور پر مختصراً بات کی گئی ہے۔ ان ادوار میں جن مصنفین نے خصوصاً نثر میں اپنی خدمات سرانجام دیں ان کے کارناموں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اہم ترین شخصیات سید اشرف جہانگیری سمنانی، افضل جھنجھانوی، گنج العلم، خواجہ بندہ نواز، شاہ میراں جی، برہان الدین جانم، شاہ امین اعلیٰ، سید میراں حسینی، مولانا عبداللہ، ملا وجہی اور سید شاہ میر کے نثری کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔

اورنگزیب عالمگیر نے جب دکن پر حملہ کر کے بیجاپور اور گولکنڈہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تو سارا ہندوستان مغل سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اس حوالے سے مصنف رقمطراز ہیں:

''شہنشاہِ اورنگزیب عالمگیر نے ۱۶۸۶ء میں بیجاپور اور گولکنڈہ میں ۱۶۸۷ء پر حملہ کر کے تمام دکن میں مغلیہ سلطنت قائم کر دی۔ اس زمانے میں بھی دکن میں اُردو کی ترقی تصانیف، نثر و نظم کا سلسلہ جاری رہا لیکن ہر عہد میں نثر کی تصانیف نظم کے مقابلے میں کم ہوئی ہیں۔'' (۴)

اُردو نثر کا دوسرا دور ''شمالی ہند'' سے شروع ہوتا ہے۔ جس کا دورانیہ مصنف نے ۱۷۳۲ء سے ۱۷۹۹ء تک درج کیا ہے۔ اس میں مغل بادشاہ محمد شاہ، فضل علی فضلی، مرزا رفیع سودا، شاہ رفیع الدین میر، عطا حسین تحسین، یورپی مصنفین کی آمد خصوصاً جان گلکرائسٹ اور مشنری اسکول کے آغاز کو موضوع باب بنایا ہے۔ اس دور میں اُردو نثر نے شاعری کی نسبت کم ترقی کی لیکن باقاعدہ آغاز کے پودے اسی دور میں اگنا شروع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کے حوالے سے جنہوں نے بعد میں فورٹ ولیم کے پلیٹ فارم سے اُردو زبان و ادب کی خدمت کی تھی مصنف لکھتے ہیں:

''اہلِ یورپ میں اُردو زبان پر سب سے بڑا احسان ڈاکٹر گلکرائسٹ کا ہے۔ انہوں نے ۱۷۸۷ء سے اُردو کی خدمت شروع کی اور بیس برس تک اُردو زبان میں اور اُردو کے متعلق انگریزی زبان میں

تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔'' (۵)

نثر کا تیسرا دور ''مصنفین فورٹ ولیم کالج'' کے عنوان پر مشتمل ہے۔اس باب میں اولاً فورٹ ولیم کالج کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے بعد ان مصنفین کی نثری خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔جو فورٹ ولیم کالج سے منسلک تھے۔ اہم نام میر امّن دہلوی، سیّد حیدر بخش حیدر، جان گلکرائسٹ، شیر علی افسوسؔ، مرزا علی لطف، میر بہادر علی حسینی، مظہر علی خان وِلاؔ، مرزا کاظم علی جوانؔ، مولوی امانت اللہ شیدا، شیخ حفیظ الدین، خلیل علی خاں اشکؔ، اکرام علی، نہال چند لاہوری، بنی نرائن جہاںؔ، للّو لال جی اور مرزا جان طپشؔ کی نثری خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ہر مصنف کی حیات اور کارناموں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔مجموعی طور پر فورٹ ولیم کالج کی خدمات پر تبصرہ بھی پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان مصنفین کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔جو فورٹ ولیم کالج سے منسلک نہیں تھے لیکن نثری خدمات انجام دے رہے تھے۔ان میں بالترتیب کلیم دہلوی، شریف خاں دہلوی، انشاءاللہ خاں، مرزا قتیل، مولوی اسمٰعیل دہلوی، سیّد اعظم علی اکبرآبادی، مرزا رجب علی سرورؔ اور محمد بخش مہجورؔ، کا نام شامل ہے۔

چوتھا باب مرزا غالب کے خطوط اور دیگر چند مصنفین کی نثری کتب پیش کرتا ہے۔جو فورٹ ولیم کالج کے بعد سامنے آئیں۔ان میں فقیر محمد گویاؔ، مولوی قطب الدین دہلوی، مفتی سعداللہ رام پوری اور دیگر کئی نثر نگاروں کو شامل کیا گیا ہے۔ مرزا غالب کے خطوط کا اُردو نثر میں مقام و مرتبے کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

نثر کے پانچواں دور کا دورانیہ ۱۸۷۱ء تا ۱۹۰۰ء تک ہے اس دور میں سر سیّد احمد خاں اور اس کی ادبی خدمات کے علاوہ دیگر غیر معروف مصنفین کی تصانیف کو سامنے لایا گیا ہے۔اس باب میں ایسی شخصیات بھی شامل ہیں جو کتاب مذکورہ کی تالیف سے قبل نامانوس تھیں لیکن اس کتاب کی اشاعت کے بعد اُردو کی نثری تاریخ میں ان کا نام شامل ہو گیا ہے۔

آخری باب میں علی گڑھ تحریک سے وابستہ ادیب اور نقادوں کی اُردو نثر میں خدمات بیان کی گئی ہیں۔اس باب کو نثر کا چھٹا دور (غدر کے بعد) کا نام دیا گیا ہے۔محمد حسین آزادؔ، مولوی ذکاءاللہ دہلوی، مولوی نذیر احمد دہلوی، خواجہ الطاف حسین حالی، میر ناصر علی خاں دہلوی، خواجہ سیّد ناصر نذیر فراقؔ دہلوی اور اس دور کی نثر پر تبصرہ کیا گیا ہے۔مذکورہ شخصیات کی ادبی خدمات کو بہت ہی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔خاص طور پر کتب کے نام، تبصرے اور عہد بہ عہد ترقی کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔سات ابواب پر مشتمل یہ کتاب اُردو کی نثری تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ایک ہزار صفحات پر مشتمل یہ کتاب مؤرخ اور تاریخ کے سکالر کے لئے کارآمد ثابت ہوئی ہے۔خصوصاً تاریخ کا سکالر اس سے ہر ممکن مدد لے سکتا ہے۔مصنف موصوف نے کتاب مذکورہ میں مصنفین کی کتب کا نام تبصرے اور عہد بہ عہد ترقی کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔یہ کتاب تحقیق اور تنقید کے لئے بھی ایک اہم کتاب ہے جس میں آغازِ اُردو سے تحریک علی گڑھ اور اس کے بعد کچھ اہم مصنفین کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

۲۔ ''تاریخ ادب اُردو'' قدیم دور (جلد اوّل) ڈاکٹر جمیل جالبی

ڈاکٹر جمیل جالبی ایک عہد ساز نقاد، مؤرخ، محقق، مترجم، مرتب استاد اور کئی جہتوں کے مالک ہیں۔ ڈاکٹر جمیل کی پہلی جلد ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد اُردو زبان وادب کے آغاز سے لے کر ولی گجراتی اور ان کے معاصرین کے عہد تک کا احاطہ کرتی ہے۔ (۶)

کتاب کا انتساب اپنی ''آپا'' کے نام ہے جس کے نیچے علامہ محمد اقبالؒ کی نظم ''مرد مسلمان'' کا یہ مصرع بھی درج ہے۔

''جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم'' (۷)

ڈاکٹر موصوف کا ادبی سرمایہ زبان وادب کے ساتھ ہے جب تک اُردو زبان کا وجود باقی رہے گا ڈاکٹر موصوف کا نام بھی زندہ رہے گا۔ آج کل کراچی میں مقیم صاحبِ فراش ہیں لیکن لکھنے لکھانے کا کام بھی کسی حد تک جاری ہے۔ ڈاکٹر موصوف ان چند گنتی کی شخصیات میں شامل ہیں جو ڈی لٹ کی ڈگری کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر موصوف نے قدیم دور کو جس خوبصورتی اور روانی سے پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے کتاب مذکورہ کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ یہ اپنی جگہ پر مکمل ہے اور آنے والی جلدوں سے مربوط بھی۔ اس بات کا اظہار خود مصنف نے دیباچے میں کر دیا ہے:

> ''میرا کام جسے میں نے تاریخِ ادب اُردو کا نام دیا ہے چار جلدوں میں ہے۔ اس کی پہلی جلد آپ کے سامنے ہے جو آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک قدیم اُردو زبان وادب کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ جلد اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور دوسری جلد سے مربوط و پیوستہ بھی۔ واضح رہے کہ یہ جدید انداز کی مربوط تاریخ ہے، متفرق مقالات کا مجموعہ یا تذکرہ نہیں ہے۔'' (۸)

ڈاکٹر صاحب کا سرمایہ اُردو ادب میں بہت زیادہ ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اور کچھ بھی نہ کرتے تو ''تاریخِ ادب اُردو'' ہی انہیں دوام بخشنے کے لئے کافی تھی۔ جالبی صاحب کو کتاب مذکورہ ترتیب دیتے وقت بہت سی پریشانیوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے دیباچہ میں ان تمام مسائل سے بحث کی ہے جو انہیں لاحق تھے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''تاریخِ ادب ادارے لکھتے ہیں جن کے پاس سرمایہ ہوتا ہے جنہیں ہر قسم کی سہولت میسر ہوتی ہے، جن کے پاس اپنا کتب خانہ ہوتا ہے اور دوسرے کتب خانوں سے وہ قلمی و مطبوعہ کتب مستعار لے سکتے ہیں۔ مددگاروں کی ایک جماعت اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ وہاں صدر ہوتے ہیں، سیکریٹری ہوتے ہیں، مشاہیرِ علم وادب کام کرتے ہیں اور کہیں برسوں میں جا کر یہ منصوبہ پورا ہوتا ہے۔ لیکن مجھے اس قسم کی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ دن بھر گردشِ روزگار اور پیٹ کا دوزخ بھرنے

کے لئے مشقت کی چکّی ، نہ کوئی مددگار، نہ کوئی ساتھی۔ایک ایک کتاب کے لئے مختلف کتب خانوں
کے چکر کاٹنے پڑے۔'' (۹)

مذکورہ اقتباس سے اہلِ نظر یقیناً ان کی محنتِ شاقہ تک پہنچ گئے ہوں گے۔ یہاں پر ایک اہم نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ کام کرنے والے مشکل ترین کام کو بھی انجام دے کر ہی دم لیتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی وہ کام سرانجام دیا جو واقعتاً مشکل تھا۔

کتاب تاریخ کے موضوع پر ہے اس لئے اسے زمانی ترتیب کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔اس میں چھ فصلوں کا اندراج کیا گیا ہے۔اور ہر فصل کوابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔زبان،تمدن اور سماج کی خصوصیات سامنے لائی گئی ہیں۔دیباچہ مصنف نے خود لکھا ہے جس میں اپنی مشکلات اور آسانیوں کا ذکر کیا ہے اور کتاب کی ترتیب اور لکھنے کے خیال سے آگاہ کیا ہے۔فصلِ اوّل سے پہلے ''تمہید'' کے عنوان سے ابتدائیہ لکھا گیا ہے جو کتاب کا دل ہے کیوں کہ کتاب زبان وادب کی تاریخ ہے اور تمہید میں اُردو زبان اور اس کے پھیلنے کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔

تاریخِ ادب اُردو (جلد اوّل) کو چھ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر فصل کے مختلف ابواب متعین کئے گئے ہیں۔ کتاب کی طوالت کو مدِ نظر رکھ کر اگر فہرست کو جانچا جائے تو یقیناً یہ بات سامنے آئے گی کہ فہرست کی موجود ترتیب موزوں ہے۔پہلی فصل ''شمالی ہند'' کے زیرِ عنوان ہے جس کے تین ابواب ہیں پہلے باب میں اُردو زبان کے پہلے شاعر مسعود سعد سلمان سے لے کر بابا گرونانک کی تاریخ رقم کی گئی ہے۔جن شعراء کو موضوع بحث بنایا گیا ہے ان میں حضرت امیر خسرو، مسعود سعد سلمان، شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر، شیخ باجن، شیخ حمیدالدین ناگوری، بوعلی قلندر اور شیخ شرف الدین، یحیٰ منیر قابلِ ذکر ہیں۔مصنف نے تمام شعراء کا تعارف، کلام اور حالات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔تمام کام تحقیق پر مبنی ہے۔ امیر خسرو کا تعارف یوں کراتے ہیں:

''امیر خسرو جنہوں نے گیارہ بادشاہوں کی بادشاہی دیکھی، فارسی کے ایسے باکمال شاعر تھے کہ خود اہلِ زبان ان کا لوہا مانتے ہیں۔موسیقی کے ایسے استادِ بے بدل کہ ان کی ایجادات واختراعات آج تک علمِ موسیقی کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔اُردو زبان وادب کے وہ شاعرِ اول جن کی مٹھاس آج بھی زبان میں شہد گھول رہی ہے۔امیر خسرو دو تہذیبوں کے امتزاج کے وہ گلِ نورس ہیں جو ابھرتی پھیلتی تہذیبوں کے ایسے ہی موڑ پر ظہور میں آتے ہیں اور خود تہذیب کی علامت بن جاتے ہیں۔'' (۱۰)

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق وتنقید دونوں کو مدِ نظر رکھ کر اُردو ادب کی تاریخ رقم کی ہے۔ موصوف نے ہر شخصیت کا مرقع مُو بہ مُو کھینچ کر رکھ دیا ہے کہ پڑھنے والا واہ واہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔دوسرا باب ''بابر سے شاہ جہاں تک'' کے عنوان سے ہے۔یہ دور مغلیہ سلطنت کے عروج کا دور ہے۔اس لئے اس باب میں بہت سی معلومات دی گئی

ہیں۔مصنف نے مغل بادشاہوں کے ادوار کے بارے میں تفصیلاً بحث کی ہے۔شہنشاہ اکبر پر رائے دینے میں رقمطراز ہیں:

''آئین اکبری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر ایسے کلچر کو پروان چڑھانا چاہتا تھا جسے صحیح معنی میں ''تیسرا کلچر'' کہا جاسکے۔جس میں ہندوی تہذیب عربی ایرانی تہذیب سے گھل مل کر ایک نئے سانچے میں ڈھل جائے اور جس میں ہندو اور مسلمان دونوں اپنائیت محسوس کرسکیں۔یہی وہ کلچر ہے جسے آج بھی ہم ''مغل کلچر'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں''۔(۱۱)

اکبر عہد میں جو شعراء اور کتب سامنے آئیں ان میں افضل کی بکٹ کہانی اور بہرام سقّہ بخاری کا دیوان اہم ہیں۔اس کے علاوہ مغل سلاطین نے اُردو زبان کو فروغ دینے میں بہت کام کیا۔آئین اکبری ہمایوں نامہ اور اکبری نامہ اس دور کے شاہکار ہیں۔تیسرا باب ''دورِ اورنگزیب'' کے حوالے سے ہے ''غرائب اللغات'' کے مصنف ''میر عبدالواسع ہانسوی'' اسی دور سے تعلق رکھتا تھا۔کبیر داس کی خدمات اب تاریخ کا مستقل حصہ بن چکی ہیں۔کبیر کی خدمات کو مصنف نے یوں بیان کیا ہے۔

''کبیر کے احسان کو اُردو ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔کبیر نے ایسے زمانے میں جب یہ گری پڑی زبان نئی تہذیبی قوتوں کے سہارے اٹھنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی تھی۔اس کی وسعت و اہمیت کو محسوس کر کے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔'' (۱۲)

سابقہ دو ابواب کی نسبت یہ باب مختصر ضرور ہے لیکن اورنگزیب عالم گیر کے عروج و زوال کی داستان اس میں رقم ہے۔یہ دور اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ اورنگزیب نے اپنی زندگی میں مغلیہ دور کو آنچ نہ آنے دی لیکن اس کی وفات کے بعد حالات خراب ہونا شروع ہوگئے۔

فصل دوم کو چار ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔اس فصل میں گجری ادب اور اس کی روایت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پہلا باب پانچویں صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی تک گجری زبان و ادب کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔دوسرے باب میں نویں اور دسویں ہجری کے خاص موضوع ملفوظات،لغات اور کتبے شامل ہیں۔تیسرے باب میں نویں اور دسویں صدی ہجری کی ادبی روایت اور چوتھے باب میں دسویں، گیارہویں اور بارھویں صدی ہجری کے اوائل میں گجری اُردو روایت کے عنوانات شامل ہیں۔اس سے پہلے فاضل مصنف نے شمالی ہند میں اُردو زبان و ادب کے ارتقاء پر مفصل بیان کیا ہے۔ گجرات، دکن بلکہ پورے برصغیر میں جب اُردو زبان کی شہرت ہوئی تو ہندوستان کی بڑی زبان اُردو کا وجود قائم ہوگیا۔اس فصل میں بھی زبان و ادب کا ارتقاء خاص طور گجرات کے حوالے بیان کیا گیا ہے۔ مصنف رقمطراز ہیں:

''اسی زبان کا ایک روپ ہمیں گجرات میں ملتا ہے جسے ''گجری'' یا ''بولی گجرات'' کا نام دیا جاتا ہے۔تاریخ بتاتی ہے کہ جب گوجر قوم فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئی تو اس نے اپنے جنوبی مقبوضات کے تین حصے کئے۔۔۔۔۔۔برعظیم کے مغرب اور مکران وسندھ کے نیچے خلیج

کچھ سے ملحق علاقہ آج بھی ترک فاتحوں کے اسی نام گجرات سے موسوم ہے''۔(۱۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے گجرات میں اُردو کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ زبان و ادب کے قلمی نسخے، ملفوظات اور قدیم کتب زیادہ تر گجرات سے ملی ہیں۔ مصنف نے اس بات کا بھی بطورِ خاص ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گجرات میں قدیم اُردو کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں یا تو صوفیائے کرام کے ملفوظات ہیں جن سے اُس زمانے کی عام بول چال کی زبان کا اندازہ ہوتا ہے یا پھر شاعری کے وہ نمونے ہیں جو شاہ باجن قاضی محمود دریائی۔ شاہ علی جیو گام دھنی اور خوب محمد چشتی کے قلم سے نکلے۔ گجرات میں پہلی بار ہمیں اس زبان میں تخلیق کرنے کی مسلسل روایت کا پتا چلتا ہے جو اس دور میں اس طور پر کہیں نظر نہیں آتی۔'' (۱۴)

ریاست گجرات جب تک آزاد رہی اس میں علم و ادب ارتقائی مراحل طے کرتے رہے اور بڑے بڑے شعراء سامنے آئے جن کی تحریریں آج بھی تاریخ کا روشن باب ہیں لیکن جب اکبر کے زمانے میں گجرات کو مغل شہنشاہوں نے فتح کیا تو گجری اُردو کی سرپرستی کسی نے نہیں کی اور دیکھتے ہی دیکھتے شمالی اور جنوبی ہند خاص طور پر دلی اور دکن میں اُردو ادب کو فروغ ملا جو ہمارے ادب کا مرکز اور محور تھا۔ اس حوالے سے فاضل مصنف کہتے ہیں:

''اکبر کی فتح گجرات ۹۸۰ھ کے بعد یہاں کا تہذیبی و سیاسی نقشہ کچھ اس طور پر بدلا کہ گجرات کے اہلِ علم بدلے ہوئے حالات کو دیکھ کر قرب و جوار کے ان علاقوں کی طرف ہجرت کر رہے تھے جہاں ان کے علم و ہنر کی قدر دانی ہو سکتی تھی۔'' (۱۵)

''اُردو بہمنی دور میں'' کے عنوان سے فصل سوم کے ابواب کی تقسیم کی گئی ہے۔ اس فصل کے دو باب ہیں پہلے باب میں پسِ منظر، مآخذ اور لسانی و ادبی خصوصیات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ جبکہ دوسرے باب میں ادب کی روایت پر بحث کی گئی ہے۔ اس دور میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے تین موضوعات کی نشاندہی کی ہے۔ یعنی قصہ کہانی کو اشعار میں ڈھالنا، اسلامی تاریخ کے اشعار اور تصوف و اخلاق جیسے موضوعات کا بیان، برہان الدین جانم، شاہ کوچک ولی، عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز، مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری اور محمد علی سامانی بہمنی دور کے مقبول اور اُردو ادب کے دیرینہ ادباء شعراء ہیں۔ اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

''اس دور کے ادب کا جسے ہم نے آسانی کے لئے ''بہمنی دور'' کے نام سے موسوم کیا ہے بہ حیثیت مجموعی جائزہ لیں تو یہاں ہمیں تین قسم کے موضوعات نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ غزل کا وہ وجود گجری دورِ ادب کی طرح اس دور میں بھی نہیں ملتا۔ گجری اُردو اور اس دور کی زبان و بیان میں کوئی فرق نہیں ملتا۔'' (۱۶)

فصل چہارم میں عادل شاہی دور کا تذکرہ کیا گیا ہے اس فصل کو آٹھ مختلف عنوانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتداء میں

گجری ادب کی روایت کی چھاپ ہے لیکن بعد میں نصرتی کی آمد سے دکنی ادب کا عروج بھی دکھایا گیا ہے اس دور کو مصنف نے نئے عبوری دور سے تعبیر کیا ہے۔

پہلا باب عادل شاہی دور کا پسِ منظر روایت اور لسانی خصوصیات کے حوالے سے ہے اس باب میں مجموعی طور پر زبان کے ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''عادل شاہی دور کی تخلیقی سرگرمیوں میں فنِ تعمیر، خطّاطی اور شعروادب کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ادب میں تاریخی اور مذہبی موضوعات بھی شامل تھے لیکن سب سے زیادہ اہمیت شاعری کو حاصل تھی۔ شاعری ہر قسم کے خیالات خواہ وہ عاشقانہ و ناصحانہ ہوں یا صوفیانہ و رزمیہ ہوں۔ اظہار کا سب سے مقبول وسیلہ تھی۔'' (۱۷)

فصل چہارم میں عادل شاہی دور کو شاعری کا باقاعدہ دور کہا گیا ہے۔ ویسے تو شاعری اُردو زبان کے آغاز سے ہی جنم لے چکی تھی لیکن انفرادی طور پر صوفیاء اور حکمرانوں کی تحریریں نثر میں ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ عادل شاہی دور میں پورا معاشرہ شاعری کی لپیٹ میں آ گیا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عادل شاہی حکمران شعر و ادب کے دلدادہ تھے خاص طور پر ابراہیم عادل شاہ اور سلطان محمد عادل شاہ نے شاعری کی سرپرستی کی۔ابتداء میں یہاں گجری دور اور ہندی زبان کی توسیع کی گئی۔ گیت اور دوہے کو فروغ ملا لیکن بعد میں فارسی روایت سامنے آئیں اور قطب شاہی دور کی طرح یہاں بھی غزل کا اجراء ہوا۔

اُردو غزلیات اور فارسی قصائد کا عادل شاہی دور میں چرچا ہو گیا تو حکمران کی دیکھا دیکھی عوام نے بھی اس روایت کو آگے بڑھایا اور شعروادب میں مقبولیت حاصل کی۔ اس حوالے سے مصنف نے کیا خوب صورت بات لکھی ہے:

> ''کمال خان رستمی، اسماعیل خان کا بیٹا تھا۔ جسے عادل شاہیوں کی طرف سے خطاط خان کا لقب ملا تھا۔اسماعیل خان کا خاندان چھ پُشتوں سے دبیرِ شاہی کے عہدے پر فائز تھا۔کمال خان رستمی نہ صرف علومِ مروجہ سے بہرہ ور تھا بلکہ فارسی قصائد و اُردو غزلیات کی وجہ سے بھی بیجاپور میں شہرت رکھتا تھا۔''(۱۸)

حیدرآباد دکن کی دو ریاستیں بیجاپور اور گولکنڈہ واحد ریاستیں تھیں جو خاندانِ تغلق میں بھی آزاد رہیں۔ اور تقریباً ۱۶۸۰ء تک خودمختیار ریاستیں رہیں۔ ان دونوں سلطنتوں پر جو بادشاہ حکومت کرتے تھے انہوں نے شعر و ادب کو بہت ترقی دی۔ بیجاپور میں عادل شاہی حکومت اور گولکنڈہ میں قطب شاہی بادشاہوں نے جہاں دو اعلیٰ شاہکار پیش کئے وہاں اچھے اچھے عوامی شعراء بھی سامنے آئے۔ حیدرآباد دکن دونوں ریاستوں کا دورِ حکومت کا دورانیہ ایک ہی ہے۔ دونوں ریاستیں بیک وقت سترھویں صدی عیسویں تک خودمختیار رہیں لیکن مغل حکومت کے آنے کے بعد مغلوں نے ان پر قبضہ کر کے اپنے حصے میں شامل کرلیا۔لیکن ایک بات طے ہے کہ شعروادب کی جو روایت عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں ملتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس دور کو دکنی ادب کا عروج اور خاص طور پر غزل کا بامِ عروج کہا ہے۔ مزید رقمطراز ہیں:

''اس دور میں فارسی اسلوب و آہنگ کے اثرات صرف عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے حدود ہی میں آہستہ آہستہ جذب ہو کر اُردو زبان کے راگ رنگ کو نہیں بدل رہے ہیں بلکہ پوری سرزمینِ دکن میں یہ تہذیبی عمل اور لسانی تبدیلیاں جاری ہیں۔ حسن شوقی کے کلام میں جو نظام شاہی سے وابستہ تھا یہ رنگ و آہنگ اُردو غزل کو ایک خاص شکل دیتا ہوا سامنے آتا ہے۔'' (۱۹)

عادل شاہی دور کے مشہور شعراء نصرتی، شاہی حسن شوقی وغیرہ نے اُردو شاعری کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ مصنف نے اس دور کو ایک عبوری عہد قرار دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارتقاء کی صورت ہمیں دکنی ادب کے بعد صاف نظر آتی ہے۔

فصل پنجم قطب شاہی دور کے حوالے سے اس فصل کے چھ ابواب ہیں جو مجموعی طور پر فارسی روایت اور عروج پر مبنی ہیں۔ یہ وہی دور ہے جس میں نظم و نثر نے شہرت پائی۔ ملا وجہی کی سب رس اسی دور کا سرچشمہ ہے۔ اسی دور میں ہم نے پہلے صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ سے آگاہی حاصل کی اور اسی دور میں ہی اُردو نثر کے شاہکار فن پارے سامنے آئے۔ تاریخ قطب شاہی کے دور سے پہلے کے سب ادوار یہاں آکر دم توڑ دیتے ہیں۔ ''تاریخ قطب شاہی'' یہ باتیں تفصیل سے درج ہیں۔ قطب شاہی سلاطین نے شعر و ادب کی جو روایت ڈالی وہ بہت جلد ولی دکنی کے پاس پہنچی اور ولی جسے اُردو غزل کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس نے قطب شاہی دور سے متاثر ہو کر اس کا خلاصہ اپنے دیوان میں شامل کر دیا اور اس کا (گولکنڈا) دکن میں بہت چرچا ہوا۔ اسی طرح قلی قطب شاہ کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

''محمد قلی قطب شاہ ۱۵۸۰ء میں تختِ سلطنت پر بیٹھا اور تینتیس سال حکومت کر کے اڑتالیس سال کی عمر میں وفات پائی وہ دکن کا پہلا بادشاہ ہے جس نے اسی برِ عظیم کا لباس اختیار کیا۔ محمد قلی قطب شاہ ایک پرُ گو اور اُردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس سے پہلے بھی شعراء کا کلام ملتا ہے لیکن اب تک کسی نے اپنا دیوان فارسی طریقے سے بہ اعتبار حروف تہجی ترتیب نہیں دیا تھا۔'' (۲۰)

عادل شاہی حکومت ۱۶۸۵ء میں جبکہ قطب شاہی ۱۶۸۶ء میں مغل حکومت کے قبضہ میں چلی گئیں اور ایک عرصہ تک آزاد و خود مختیار رہنے کے باوجود ان لسانی اور ادبی لب و لہجہ منفرد رہا۔ یہ ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ جس طرح گنگا اور جمنا کا پانی لمبے فاصلے تک ایک دوسرے سے نہیں ملتا یہی حال ان دو حکومتوں کا تھا۔ مصنف اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

''مغلوں کی فتح کے بعد دکن کی ساری سلطنتوں کے حدود مٹ کر ایک ہو گئے اور معاشرتی، تہذیبی اور لسانی سطح پر ایک کھچڑی سی پکنے لگی۔ فتح بیجاپور فتح گولکنڈا کے آخری تاجدار بھی اس جہاں فانی سے رخصت ہو گئے۔ ۱۶۹۹ء میں سکندر عادل شاہ اور ۱۷۰۰ء میں ابوالحسن تانا شاہ وفات پا گئے۔ جیسے گنگا جمنا مل کر ساتھ بہنے کے باوجود بہت دور تک الگ الگ نظر آتی رہتی ہیں اور دور سے ہی ان کو پہچانا جاسکتا ہے اسی طرح زبان و بیان کے نئے ادبی معیار ایک عرصہ تک تہذیبی و لسانی پر ملنے کے

باوجود الگ الگ نظر آتے رہے۔'' (۲۱)

دکن کی دونوں ریاستوں کے ختم ہونے کے بعد ان کا شعروادب کا سلسلہ بھی وہیں رک گیا۔ اور جس شاعر نے اس روایت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کو آگے بڑھایا وہ ولی دکنی ہیں۔ آخری فصل ولی دکنی کے شعری سلسلے پر مشتمل ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ فارسی روایت کا پھر عروج ہوا جس کا سہرا ولی دکنی کے سر ہے اور معاصرین ولی اور بعد کی نسل کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

''ولی تک آتے آتے اُردو شاعری کی روایت تین سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہوچکی تھی۔ اس روایت میں دور رجحانات نے رنگ بھرا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ولی آئندہ دوسو سال کی شاعری کے نظامِ شمسی کا وہ سورج ہے جس کے دائرہ کشش میں اُردو شاعری کے مختلف سیارے گردش کرتے ہیں۔'' (۲۲)

ولی دکنی نے اُردو غزل کو طبع آزمائی کے لئے موزوں سمجھتے ہوئے اپنی ساری توانائی اس صرف کردی۔ ملاحظہ ہو:

''جب ولی نے غزل کو اظہار کا ذریعہ بنایا اس وقت کم بیش ساری دکنی روایت میں غزل کا تصور یہ تھا کہ اس سے صرف و محض عورتوں سے ''باتیں کرنے'' یا ان کی باتیں کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ ولی سے پہلے کی غزل میں کسی گہرے تجربے، احساس یا حیات و کائنات کے شعور کا پتا نہیں چلتا۔ ولی نے اسی روایت کو اپنا کر اس میں زندگی کے رنگا رنگ تجربات، تنوع اور داخلیت کو سمو کر غزل کے دائرے کو پوری زندگی پر پھیلا دیا۔ اس طرح ولی نے اپنی زندگی میں بیک وقت دو سطحوں پر دو شاعروں کا کام انجام دیا۔'' (۲۳)

ولی کے معاصرین میں سے داؤد، شاہ حاتم، فراقی، فقیراللہ آزاد، سراج الدین سراج اورنگ آبادی اور عارف الدین خان عاجز نے ولی کی روایت پر کام کیا۔ ولی کی وفات کے بعد جب اس کا دیوان دلّی پہنچا تو میر و سودا نے غزل کا جو مقام بنتا ہے اس کو دلوا دیا۔ چھٹی فصل میں مصنف نے اختتامیہ بھی لکھا ہے:

''قدیم ادب انہی اثرات اور روایت کے اتار چڑھاؤ سے عبارت ہے اور قدیم روایت کی لہروں کا پیچ و تاب انہی رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ مردہ یا ناکارہ روایت کو چھوڑ کر عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق زندہ طرزِ احساس کو اپنانا ہمیشہ سے تخلیقی ذہنوں کا شیوہ رہا ہے۔ یہ یونہی ہوتا آیا ہے اور یونہی ہوتا رہے گا۔'' (۲۴)

اس کتاب کو پڑھ کر دل کو مسرت ہوتی ہے کہ ایک ہی جلد میں آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک کا اُردو زبان کا شعرو ادب محفوظ ہے۔ مصنف کی محنت شاقہ کا ثبوت ہے کہ ذوقِ ادب رکھنے والوں کے لئے آسانی پیدا کردی ہے۔ اس کے علاوہ ضمائم، اشاریہ، کتابیات اور شخصیات و مقامات کا تفصیلی جائزے نے بھی کتاب کی خوبصورتی اور اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مصنف کو اس عظیم کارنامے کو انجام دینے پر اپنی حفاظت میں رکھے کہ اس طرح کے امور صدیوں بعد بھی سرانجام نہیں دیئے جاتے۔

۳۔ تاریخِ ادبِ اُردو (جلد دوم) (ڈاکٹر جمیل جالبی)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب تاریخِ ادبِ اُردو (جلد دوم) طبع چہارم، جنوری ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی اسے مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور نے شائع کیا۔ (۲۵) ڈاکٹر جمیل جالبی جلد دوم کے بارے میں پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''تاریخ ادبِ اُردو کی جلد دوم آپ کے سامنے ہے جسے پڑھنے والوں کی آسانی کی خاطر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ جلد جو کم و بیش اٹھارویں صدی عیسوی کا احاطہ کرتی ہے اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور اگلی پچھلی جلدوں سے پوری طرح مربوط بھی''۔ (۲۶)

اس جلد کو پہلی جلد اور باقی کی تمام جلدوں کو مربوط کر کے پڑھا جا سکتا ہے اس جلد کا پہلا حصّہ تمہید پر مشتمل ہے جس کے دو ابواب بنائے گئے ہیں۔ پہلا باب اٹھارویں صدی: سیاسی منظر، طرزِ فکر، تہذیبی و معاشرتی رویے کے عنوان سے ہے جبکہ دوسرا باب اُردو شاعری: رواج، کشمکش، اثرات، محرکات و میلانات کے عنوان سے ہے۔ درحقیقت ان ابواب میں ڈاکٹر موصوف نے اٹھارویں صدی کے سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی تناظر میں اُردو شاعری کا جائزہ لیا ہے تا کہ آگے جلد مذکورہ میں بیان ہونے والے تمام حقائق کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''اُردو شاعری: رواج، کشمکش، اثرات، محرکات و میلانات کے پسِ منظر میں یہ بات ذرا دیر کو حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ عین اس دورِ انتشار میں جب عظیم مغلیہ سلطنت کے در و دیوار گر رہے ہیں اور معاشرہ زوال کی انتہائی پستیوں کو چھو رہا ہے، اُردو ادب اور اس کی روایت کیسے ظہور میں آ گئی، اُردو شمال کے لئے کوئی اجنبی زبان نہیں تھی۔ یہ یہیں کی زبان تھی اور صدیوں سے برِعظیم میں ایک عام و مشترک زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ خود دکن میں پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل سے اس میں باقاعدہ ادب کی روایت کا آغاز ہو چکا تھا اور تین سو سال کے عرصے میں وہاں اُردو زبان و ادب کی کم و بیش وہی اہمیت ہو گئی تھی جو شمال میں فارسی زبان و ادب کی تھی''۔ (۲۷)

اٹھارویں صدی تک اُردو زبان نے جو سفر طے کیا تھا اور اب جس شعری سرمایے کی حامل تھی وہ ان ابواب میں بیان کر دیا گیا ہے جلد دوم کے مزید مندرجات کچھ اس طرح ہیں اس کی چھ فصلیں قائم کی گئی ہیں۔ پہلی فصل شمالی ہند میں اُردو شاعری کی ابتدائی روایت کے عنوان سے ہے۔ جس کے تین ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ جن میں مذہبی شاعری، رزم نامے، طنز و ہجو کی روایت بیان کی گئی ہے۔ منتخب شعراء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مثلاً جعفر زٹلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جعفر کے حالاتِ زندگی کسی تذکرے یا تصنیف میں نہیں ملتے۔ نکات الشعراء، مخزن نکات، چمنستان شعراء، تذکرہ شورش، تذکرۂ میر حسن اور مجموعۂ نغز وغیرہ میں جو حالات درج ہیں وہ بہت مختصر ہیں اور ان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جعفر، جعفر زٹلی کے نام سے مشہور تھا۔ نادرۂ زمان اور اعجوبۂ دوران تھا، زبانِ گزیدہ رکھتا تھا۔ قائم نے لکھا ہے کہ ''سخن وری کی بنیاد زیادہ تر ہزل پر تھی، اس بنا پر وہ زٹلی کہلانے لگا تھا اور اسی باعث اس کے کلام نے عوام میں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔'' (۲۸)

جعفر زٹلی درحقیقت ایک عہد کا نام ہے جس نے طنز و مزاج کے انداز میں شہرت حاصل کی۔ ڈاکٹر موصوف نے جعفر زٹلی کو اس کی منفرد شاعری کی وجہ سے منتخب کیا ہے۔

جلد دوم کی فصل دوم میں بھی دو ابواب ہیں جس میں فارسی کے ریختہ گو موضوع بنے ہیں۔ اس فصل میں فارسی کی اُردو پر اثر اندازی کو موضوع بنایا گیا ہے اور بتایا ہے کہ اُردو شاعری سے پہلے فارسی شاعری کی ایک روایت موجود تھی جبکہ فصل سوم میں چار ابواب ہیں اور ان ابواب میں ولی دکنی، ایہام گوئی اور ایہام گو شعراء کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس فصل میں غیر ایہام گو شعرا کا تذکرہ موجود ہے۔ شاہ مبارک آبرو، شاکر ناجیؔ، شرف الدین مضمون، مصطفٰی خان یک رنگ، احسن اللہ احسنؔ، اشرف گجراتی، محمد رضی رضیؔ، شاہ تراب وغیرہ کا تفصیلی ذکر ہے۔

فصل چہارم ردِعمل کی تحریک کے عنوان سے ہے اس میں تین ابواب ہیں پہلے باب میں اسباب، خصوصیات اور معیارِ سخن کے عنوانات ہیں جبکہ دوسرے باب میں ردِعمل کے شعراء مرزا مظہر جانِ جاناں، انعام اللہ خاں یقین، میر عبدالحئی تاباں، میر محمد باقر حزیں وظہور وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ تیسرے باب میں بھی ردِعمل کے شعراء خصوصاً شاہ حاتم کا ذکر ہے۔ ایہام گوئی کے بعد ردِعمل کی تحریک کو سمجھنے کے لئے یہ فصل بہت اہم ہے۔ فصل پنجم بھی ردِعمل کی تحریک کی توسیع کے عنوان سے ہے جس میں نو ابواب ہیں، یہ فصل نہایت اہم ہے۔ پہلا باب: میر و سودا کا دور، دوسرا باب: محمد تقی میر، تیسرا باب بھی محمد تقی میر، چوتھا باب: مرزا محمد رفیع سودا، پانچواں باب: میر درد، چھٹا باب: قائم چاند پوری، محمد میر سوز، میر اثر، ساتواں باب: میر حسن، جبکہ آٹھواں باب: دوسرے شعراء پر مشتمل ہیں۔

فصل پنجم کے بعد فصل ششم بھی بہت اہم ہے اس میں پانچ ابواب ہیں اور نثر اُردو کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پہلے باب میں اُردو نثر کے رجحانات، اسالیب، دوسرے باب میں تنقیدی نثر اور اسالیب، تیسرے باب میں مذہبی تصانیف اور اسالیب، چوتھا باب تاریخی نثر اور اس کا اسلوب جبکہ پانچواں باب افسانوی تصانیف اور اسالیب کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اس فصل میں ڈاکٹر موصوف نے نہ صرف اُردو نثر کی تاریخ بیان کر دی ہے بلکہ اس دور کے اسلوبِ بیان کو بھی موضوع بنایا ہے جو کہ اہم کام ہے۔ نثری ارتقاء کے ساتھ اسلوب کے ارتقاء کا بھی اس فصل میں پتا چلتا ہے جلد دوم میں سب

سے آخر میں اشاریہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ کتب ومنظومات، اشخاص، مقامات اور متفرقات کے اشاریے بیان کردیئے گئے ہیں اس جلد میں تحقیق میں اشاریے کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔

۴۔ اُردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ (شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک)
(ڈاکٹر محمد ایوب قادری)

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے مختصر سی کتاب ''اُردو کی ابتدائی نشو نما میں صوفیاء کرام کا حصہ'' تالیف کی تھی تو پہلی دفعہ یوں محسوس ہونے لگا کہ اُردو زبان وادب کو پروان چڑھانے میں شمالی وجنوبی ہند کے شعراء اور سلاطین کے علاوہ صوفیائے کرام کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ اس کے بعد جب ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی ضخیم کتاب ''اُردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ'' ۱۹۸۸ء میں منظرِ عام پر آئی (۲۹) تو پہلی دفعہ کسی نے اس امر کی طرف توجہ دلائی۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنے اس کارنامے میں تقریباً ۸۰ علماء کی نثری خدمات کو بروئے کار لا کر ثابت کیا کہ شعراء وادباء صوفیاء کے ساتھ ساتھ علمائے کرام نے بھی اُردو کی ترویج وترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کتاب مذکورہ کو آٹھ مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن کی فہرست سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کتاب کتنی اہمیت کی حامل ہے۔ فہرست ملاحظہ ہو:

مصنف نے پیش لفظ کے عنوان سے اس کا دیباچہ لکھا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ محمد اسحاق بھٹی نے ''حرفِ چند'' کے عنوان سے اظہار خیال کیا ہے۔ وہ کتاب کی اہمیت وافادیت کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایوب قادری مرحوم نے ستاون برس چار مہینے عمر پائی۔ اپنی تصانیف وتراجم میں ہزاروں علماء و مشائخ اور زعما وفضلا کے حالات لکھے اور بہت سے اصحاب علم اور اربابِ تحقیق سے لوگوں کو متعارف

کرایا۔ رجال کے سلسلے میں ان کی نظر بڑی وسیع تھی اور ان کا دائرۂ معلومات دور تک پھیلا ہوا تھا۔ دیگر کتابوں کے علاوہ ''اُردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ'' ان کی وہ کتاب ہے جو اس بارے میں ان کی وسعت نظر کی سب سے بڑی شاہد ہے۔ اس کے مطالعے سے قارئین کے سامنے غور و فکر کی نئی راہیں کھلیں گی۔'' (۳۰)

ڈاکٹر موصوف نے اپنی کتاب میں علماء و مشائخ کے حالات بہت سے اصحاب علم اور ارباب تحقیق سے لوگوں کو متعارف کروایا۔ ان کی کتاب سے مطالعے کے قارئین کے لئے غور و فکر کی نئی راہیں کھلتی ہیں جس سے قاری مستفید ہوتا ہے مصنف کتاب کی وجہ اشاعت اور اہمیت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''اُردو زبان کی نثر کی تاریخ لکھنے والوں کا بالعموم یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی سرگرمیوں سے اس کا آغاز کرتے ہیں۔ خطوطِ غالب پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ پھر شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین یا دو چار مذہبی کتابوں مثلاً تقوۃ الایمان، وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے سرسید تحریک پر آجاتے ہیں۔ اُردو نثر کے ارتقاء میں دیگر علماء کے کارناموں کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حالانکہ اُردو زبان کی تاریخ کا یہ ایسا پہلو ہے جو انتہائی لائق توجہ اور شائستہ التفات ہے۔'' (۳۱)

مصنف جن ۸۰ علمائے کرام کی اُردو خدمات کو منظرِ عام پر لایا ہے ان میں ہر عالم کو اس کے عہد اور علاقے کے مطابق کسی باب میں شامل کیا ہے۔ مثلاً پہلے باب میں آٹھ، دوسرے باب میں نو، تیسرے باب میں پانچ، چوتھے باب میں چودہ، پانچویں باب میں دس، چھٹے باب میں پندرہ، ساتویں باب میں تیرہ، جبکہ آخری باب میں چھ علمائے کرام کے حالاتِ زندگی، مذہبی اور نثری خدمات کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے۔ جن میں قابلِ ذکر علماء شاہ مراد اللہ انصاری، شاہ غلام علی مجددی، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل دہلوی، سید عبداللہ حسینی، سید محمد دہلوی، مولانا نواب قطب الدین دہلوی، مفتی صدرالدین آرزو، سید حسین علی رامپوری، ملا محمد نظام شاہ جہان پوری، مولوی مرزا ہادی لکھنوی، مولوی مرزا جان لکھنوی، شاہ ظہور الحق عظیم آبادی اور مولوی عالم عظیم آبادی ہیں۔ ان علمائے درس و تدریس اور تحریری زبان اُردو کو اپناتے ہوئے اپنی مذہبی اور ادبی نثر پاروں کی اشاعت کا کام کیا۔ مصنف نے جس تفصیل سے علمائے کرام کی نثری تحریروں کی نشاندہی کی ہے وہ اُردو نثر کا قیمتی سرمایہ ہے۔ علمائے کرام کی اُردو نثر کے نمونے زیادہ تر مذہب اسلام اور شریعت اسلام کے حوالے سے ہیں۔ مصنف نے ہر شخصیت کو اس کے منفرد کارنامے کی وجہ سے موضوع کتاب بنایا ہے۔ مثلاً عالمِ دین شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی نقش بندی سلسلے کے مشہور شیخ تھے۔ انہوں نے اُردو زبان میں قرآن کریم کے تیسویں سپارے '' عَمَّ یَتَسَاءَ لُوْنَ '' کی تفسیر لکھی جو نہایت مقبول ہوئی اور خدا کی نعمت کے نام سے چھپتی رہی ہے۔ شاہ مراد کی یہ تفسیر ''تفسیرِ مرادیہ'' کے نام سے بھی مشہور ہے اور

یہ تفسیر ۲۴ محرم ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۱ء) کو مکمل ہوئی۔'' (۳۲)

نامور عالم دین نواب قطب الدین خان دہلوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا قطب الدین خان دہلوی نے ''تزکیۃ الصیام وتذکرۃ الصیام'' کے عنوان سے احادیث جمع کر کے کتابی شکل میں مرتب کر دی تھیں۔ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی نے نواب صاحب کی خواہش پر ان رسائل کا اُردو ترجمہ ۱۸۵۵ء میں کیا یہ ترجمہ عربی متن کے ساتھ بطور بین السطور شائع ہوا ہے۔'' (۳۳)

ڈاکٹر موصوف کے نزدیک نواب قطب الدین خان دہلوی نامور عالم دین تھے۔ انہوں نے ''تزکیہ الصیام وتذکرہ الصیام'' کے عنوان سے احادیث جمع کر کے کتابی شکل میں مرتب کر دی تھیں۔ ان کا یہ کام لائق ستائش ہے جس سے قارئین مستفید ہوتے ہیں۔ کتاب مذکورہ اُردو نثر کے ابتدائی نمونوں کی تاریخ پیش کرتی ہے اس لئے اسے شامل مقالہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بیک وقت اسلامی ادب کے اولین نمونے، اُردو نثر کی ابتدائی تاریخ اور علماء اسلام کی شاندار دینی خدمات کو پیش کرتی ہے۔ مصنف نے اس شاندار کتاب کی تالیف کر کے ادبی تاریخ میں ایک اچھا اضافہ کیا ہے جو لائقِ تحسین ہے۔

۵۔ اُردو نثر کا ارتقاء (۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک) (ڈاکٹر عابدہ بیگم)

اُردو نثر کا ارتقاء ڈاکٹر عابدہ بیگم کی پی ایچ ڈی (اُردو) کا مقالہ ہے جو انہوں نے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی نگرانی میں شعبہء اُردو دہلی یونیورسٹی بھارت سے ۱۹۷۸ء میں مکمل کیا تھا دس سال بعد ۱۹۸۸ء اشاعت پذیر ہوا۔ اس حوالے سے مصنفہ لکھتی ہیں:

''دو تین دن شعبہ کے گرد چکر کاٹنے کے بعد فاروقی صاحب نے مشرقی روایات کا پاس کرتے ہوئے خالص بزرگانہ انداز میں موضوع سے متعلق گفتگو کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ بھی ہفتوں چلتا رہا اور آخر کار وہ نیک ساعت بھی آ گئی جب کمیٹی نے ریسرچ میں داخلے کے خواہش مند طلبہ اور طالبات کے موضوعات کا تعین کر دیا۔ میرے تحقیقی مقالے کا موضوع تھا ''اُردو نثر کا ارتقاء'' (۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک) پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی میرے نگراں مقرر کئے گئے۔۔۔۔۔۔۔ مقالہ تقریباً دس سال بعد شائع ہو رہا ہے۔ اسباب وعلل کے تذکرے اور تجزیئے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ یہی کیا کم ہے کہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔'' (۳۴)

سات ابواب پر مشتمل اس کتاب کے پہلے دو ابواب ۱۸۰۰ء سے پہلے کی نثر جو جنوبی ہند اور شمالی ہند میں پروان چڑھی کے حوالے سے سرسری معلومات پیش کی گئی ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو چند ادیبوں کے انفرادی کارناموں

کے علاوہ فورٹ ولیم کالج، دلی کالج اور اُردو صحافت کے حوالے سے بات زیادہ کی گئی ہے۔ آخر میں مصنفہ نے طویل اختتامیہ لکھا ہے جس میں علی گڑھ کی نثری خدمات اور بعد میں آنے والی تحریکوں کی نثر کا ماخذ جنگ آزادی سے پہلے تک کی نثر کو قرار دیا گیا ہے۔ داستان نگاری جسے ایک لحاظ سے غیر مذہبی نثر کا نام بھی دیا جاتا ہے فورٹ ولیم کالج کی مرہون منت ہے۔ مصنفہ اس کے آغاز بارے میں لکھتی ہیں:

''اُردو میں غیر مذہبی نثر کے نمونے دراصل اٹھارویں صدی کے اواخر کی دین ہیں نوطرزِ مرصع، قصہ مہر افروز دلبر، نوآئینِ ہندی عرف قصّہ ملک محمد وگیتی افروز اور عجائب القصص سے غیر مذہبی نثر اور داستانوی طرزِ بیاں کی ابتداء ہوتی ہے۔''(۳۵)

کتاب کا بہترین اور ضخیم باب فورٹ ولیم کالج ہے تاہم دلی کالج کی نثری خدمات کو بھی رد نہیں کیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج دراصل اُردو نثر کا باقاعدہ آغاز تھا اور اس کی ابتداء بھی ۱۸۰۰ء میں ہوئی اس لئے مصنفہ کا موضوع ہی اسی سال سے شروع ہوتا ہے تو اس حسین دور کا مرقع شاندار الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی اعلیٰ خدمات اور ترجمہ کی ہوئی شہرہ آفاق نثری داستانوں کی عہد بہ عہد تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کی نثر کا آغاز وارتقاء بھی قلمزد کیا گیا ہے۔ ۱۸۰۰ء کے اولین دور کی نثر کا ۱۸۴۰ء کی نثر کے ساتھ موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ دیکھئے:

''۱۸۳۵ء میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا۔ سرکاری دفاتر میں قانونی حیثیت ہوئی۔ سمّن، پروانے، تجاویز اور احکامات اسی زبان میں جاری ہونے لگے اگرچہ اس سے قبل بھی عوام کی آسانی کے لئے سرکاری قوانین کا اُردو ترجمہ شائع کیا جاتا تھا لیکن اس دور کی زبان میں صفائی اور سلاست نہیں پائی جاتی تھی۔''(۳۶)

''اُردو نثر کا ارتقاء'' آخری باب ہندوستان کی صحافت کے حوالے سے ہے۔ موضوع کی مناسبت سے مصنفہ نے ۱۸۵۷ء تک کی اُردو نثر کا آغاز وارتقاء پیش کیا ہے اور اُردو نثر کی صحافت کو بھی اپنے مقالے کا موضوع بنایا ہے ہندوستان کی بدلتی ہوئی سیاسی صورتِ حال نے اس دور کی نثر، شاعری اور صحافت پر بھی اثرات مرتب کئے جس کے ابتدائی نقوش مصنفہ نے ''اُردو صحافت'' کے زیرِ عنوان باب میں پیش کر دیئے ہیں۔ لکھتی ہیں:

''ہندوستانی اخبار نویس کے ابتدائی دور کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک ہندوستانی صحافت ابھی ابتدائی دور میں ہے۔ بنگالی صحافت کو اولیت حاصل ہونے کے باوجود اس دور میں فارسی اور اُردو اخبار نویسی کو زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ ۱۸۲۲ء میں فارسی کا پہلا اخبار ''جامِ جہاں نما'' کلکتہ سے جاری ہوا۔ اگلے سال یعنی ۱۸۲۳ء میں اس کا اُردو میں ضمیمہ جاری ہو جو پانچ سال بعد بند ہوگیا۔ اس کے بعد دہلی اُردو اخبار اور پھر ملک کے مختلف حصوں سے اخبارات اور رسائل کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ صحافت کی اس کامیابی کے پیچھے ملک کے بدلتے ہوئے حالات

تھے۔''(۳۷)

مصنفہ کا کمال ہے کہ اس نے ۱۸۵۷ء تک نثر کی تمام صورت حال کو پیش کیا ہے دوسرا انہوں نے علی گڑھ تحریک کے عروج کا سہرا بھی انیسویں صدی کے آغاز نثر کے سر باندھا ہے، لکھتی ہیں:

''سرسید احمد خان تحریک اور اس کے بعد جدید نثر نے جن راہوں پر آگے قدم بڑھایا اور جن عناصر کو پروان چڑھایا ان کی داغ بیل ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء کے درمیان نہ صرف پڑ چکی تھی بلکہ سماجی و سیاسی حالات نے ان کے فروغ کے سارے اسباب مہیا کر دئے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد نثر کے ارتقاء میں یہی تسلسل واضح طور پر نظر آتا ہے۔''(۳۸)

اُردو زبان و ادب کا عہد بہ عہد جائزہ سیکڑوں مصنفین نے اپنے اپنے طور پر پیش کیا ہے جس کو ادبی تاریخ میں ہمیشہ معتبر سمجھا جائے گا۔ ڈاکٹر عابدہ بیگم نے ستاون سالہ نثری تاریخ کا تحقیقی تاریخی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب نظر آتی ہیں۔ امید ہے فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ، طالبہ اور اسکالرز اس کتاب سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

۶۔ فورٹ ولیم کالج (تحریک اور تاریخ) پروفیسر سیّد وقار عظیم

پروفیسر سید وقار عظیم کی ادبی خدمات بحیثیت محقق، استاد، مؤرخ، نقاد اور نثر نگار لائق ستائش ہیں۔ انہوں نے بہت سی نادر کتب ادب کے افق پر جلوہ افروز کیں۔ اسی سلسلے کی اہم کڑی فورٹ ولیم کالج (تحریک اور تاریخ) ہے۔ جس کی طبع دوم ۱۹۸۸ء میں یونیورسل بکس، اُردو بازار لاہور سے شائع ہوئی۔ (۳۹)

فورٹ ولیم کالج دستاویزی شکل میں ۵۴ سال تک اُردو نثر کا ذخیرہ پیدا کرتا رہا لیکن زیادہ کام اس کے آغاز ۱۸۰۰ء سے لے کر ۱۸۰۵ء تک ہوا۔ اس دور میں تقریباً ۲۰۰ کتب شائع ہوئیں جن میں زیادہ تر نثری داستانیں تھیں۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اس حوالے سے منفرد ہیں کہ انہوں نے ایک خاص عہد میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے ایسے جوہر دکھائے کہ آج بھی فورٹ ولیم کالج ان کے نام پر فخر کرتا ہے۔ کتاب مذکورہ کے کل چار ابواب ہیں جن میں پہلا فورٹ ولیم کالج کے آغاز و ارتقاء اس کی قانونی حیثیت اور آغاز کی وجہ کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی نثری خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا باب فورٹ ولیم کالج کی مجموعی خدمات جبکہ آخر میں اضافات اور مزید اضافات کے زیرِ عنوان چوتھے باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے کتاب کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے نام منسوب کیا ہے۔ دوسرا باب کتاب کا اہم اور ضخیم باب ہے جس میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی انفرادی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر جان گل کرائسٹ، میر امن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف، امانت اللہ

لکھنوی، مظہرعلی وِلاؔ، کاظم علی جوان، للو لال کوی، نہال چندلاہور، بنی نرائن،طپش،مسکین، فطرت، حمیدالدین اور خلیل اللہ سمیت دیگراہم مصنفین اس کا موضوع خاص ہیں۔ ہرمصنف کا الگ الگ مکمل تعارف سوانحی حالات، فورٹ ولیم کالج سے منسلک ہونے کی وجہ اور دورانیے سمیت اس کے نثری کارناموں پر بھی تفصیلاً بات کی گئی ہے۔مثلاً حیدر بخش حیدری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب تک حیدر بخش حیدری کی جن کتابوں کے اقتباسات ہماری نظر سے گزرے انہیں دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ سادگی وسلامت حیدری کے طرزِ بیان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھائیں اپنے خیالات کو سلیس اور سیدھی سادی عام فہم زبان میں بڑی روانی اور بے تکلفی سے بیان کردیتے ہیں۔''(۴۰)

مرزا علی لطف کا تعارف ملاحظہ ہو جس میں اس کا آبائی وطن، سفرِ ہندوستان، شاہِ ہندوستان تک رسائی اور فورٹ ولیم کالج سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا ادبی کارنامہ بھی پیش کردیا ہے، لکھتے ہیں:

''مرزا علی لطفؔ مرزا، مرزا کاظم بیگ خان کے بیٹے تھے جن کے آباؤاجداد کا وطن ایران تھا ۱۷۴۱ء میں نادرشاہ کے ساتھ ہندوستان آئے اور دہلی کو اپنا وطن بنالیا۔ نواب آصف الدولہ کے دادا ابوالمنصور خان صفدر جنگ کی وساطت سے محمد شاہ (شاہ دہلی) تک رسائی ہوئی اور دربار سے تعلق پیدا ہوگیا۔ مرزا علی لطف نے اپنے تذکرے گلشن ہند میں اپنے متعلق یہ لکھا ہے۔
مشورہ ریختہ کا اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے''۔(۴۱)

پروفیسر سید وقار عظیم نے ہر مصنف کا خاندانی پسِ منظر، اس کا علمی وادبی مقام اور ان کی نثری خدمات کا بغور جائزہ لیا ہے اور ہر مصنف کے ساتھ مساویانہ سلوک روا رکھا ایک اقتباس شیر علی افسوس کے کارناموں کا ملاحظہ ہو:

''فورٹ ولیم کالج کے دورانِ قیام میں افسوس نے دو کتابیں ترتیب دیں۔ایک باغِ اُردو اور دوسری آرائش محفل، باغِ اُردو سعدی کی معروف تصنیف گلستان کا ترجمہ ہے۔اس کے دیباچے میں افسوس نے فورٹ ولیم کالج سے اپنے تعلق اور کتاب کے ترجمے کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔''(۴۲)

فورٹ ولیم کالج (تحریک اور تاریخ) ایک خاص عہد اور گروہ کی نمائندگی کرتی ہے۔اس لئے اس میں زیادہ تر فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اور فورٹ ولیم کالج کی تالیفات کی بات کی گئی ہے۔ بہرحال فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات کا ظہور جس تناظر میں بھی ہو اس کی شائع کردہ کتب کا مقابلہ آج تک کوئی ادارہ نہیں کرسکا۔

فورٹ ولیم کالج شمالی ہند کا، پہلی علمی ادبی اور تعلیمی ادارہ ہے جہاں اجتماعی حیثیت سے ایک واضح مقصد اور منظّم ضابطہ کے تحت ایسا کام ہوا جس سے زبان اور ادب کی بڑی خدمت ہوئی۔فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اُردو میں تصنیف و

تالیف کا جتنا کام کالج سے منسلک اور وابستہ رہنے والے اہلِ علم اور اہلِ قلم ماہرین نے کیا۔اس سے اُردو ادب کا سرمایہ پہلی مرتبہ علمی وقعت و وقار کا حامل بنا اور اس میں علمی و ادبی کاموں کو اصول و قواعد کے تحت انجام دینے کی روایت کا آغاز ہوا۔

پروفیسر سید وقار عظیم اُردو تنقید اور تحقیق کا ایک بہت ممتاز، مقبول اور معتبر نام ہے انہوں نے فورٹ ولیم کالج اور اس کے بعض قابل ذکر مصنفین کے ادبی کارناموں کو جس انداز سے پیش کیا ہے۔وہ اپنی مثال آپ ہے۔

۷۔ اُردو ادب کی تحریکیں (ڈاکٹر انور سدید)

ڈاکٹر انور سدید بیک وقت نقاد، موَرخ، شاعر اور فاضل ادیب ہیں ان کی ادبی خدمات بہت زیادہ ہیں۔اس لئے ادب میں ان کی اہمیت اور حیثیت مستند اور معتبر ہے۔ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''اُردو ادب کی تحریکیں'' کا اشاعت نہم انجمن ترقی اُردو پاکستان سے ہوا۔(۴۳) یہ کتاب ڈاکٹر انور سدید کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں جامعہ پنجاب سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔کتاب کی مقبولیت اور اہمیت کے حوالے سے جمیل الدین عالی رقمطراز ہیں:

> ''اس کتاب کی مقبولیت اور اہمیت کا صرف یہی ثبوت سامنے نہیں کہ بارہ برس میں تیسری بار چھپ رہی ہے بلکہ یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ اسے تمام جامعات میں جہاں ادبِ اُردو کا شعبہ ہے ایک غیر رسمی نصابی لازمے کی حیثیت حاصل ہوچکی ہے۔۔۔۔۔۔اس موضوع پر پورے جنوبی ایشیاء میں اُردو کے حوالے سے ان کی محنت تاحال بے مثال ہے''۔(۴۴)

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی اور اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں جن کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ڈاکٹر موصوف کی کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل: ''تحریک اور اس کے عوامل'' سے ہے جس میں جمود اور حرکت، بنیادی محرّک، رجحان سے تحریک تک، فروغِ تحریک میں عصبیت اور تقدس، تحریک کی سمت، تحریک کا عروج و زوال، تحریک میں زمانے کی اہمیت، تحریک کی طبعی عمر، تحریک کے چار ادوار، تحریک اور عمل تقلیب، تحریک اور ادب، ادبی تحریک، نئے سوال کی اہمیت، ادب میں نئے رجحانات کی اہمیت، ادبی تحریک اور نصب العین، سیاسی تحریک اور ادبی تحریک، ادبی تحریک اور نئی معنویت، نئی معنویت اور زبان، ادبی تحریک کے اثرات، رومانی اور کلاسیکی تحریک، تہذیبی ترقی کی روشنی میں دنیا کی قدیم تحریکوں کا مطالعہ، قرونِ وسطیٰ کی مذہبی تحریکیں، عیسائیت کی تحریک، اسلام کی تحریک، مغرب میں احیاء العلوم کی تحریک، مغربی ادب کی عمرانی تحریک، اصلاح مذہب کی تحریک، مغرب کی کلاسیکی تحریکیں، مغرب کی رومانی تحریک، وجودیت کی تحریک، نفسیات کی تحریک، آزاد تلازمہ خیال کی تحریک، سرئیلی تحریک، تجریدیت، علامت نگاری کی تحریک، تحریک تاثریت اور مارکسی

تحریک شامل ہیں۔ تحریک اوراس کے عوامل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''تحریک جمود کی یک رنگی کو توڑ کر ہمہ رنگی اور تنوع پیدا کرنے کا عمل ہے اوراس کی تہہ میں تحرک کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور کارفرما ہوتا ہے۔عہد نامہ قدیم کے حوالے سے تخلیقِ کائنات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ابتداء میں ہر طرف جمود تھا، فضاء یکسر ساکن تھی اور تحرّک پر صرف خدا کو قدرت حاصل تھی۔ پھر آدمؑ کو پیدا کیا گیا اوراس جامد فضاء میں حرکت کی پہلی لہر پیدا ہوئی۔ابتدائے کائنات کے ان ایّام میں زندگی ہموار اور احکام خداوندی کے تابع تھی اور آدم عمل تغیر سے نا آشنا تھا۔ اس لئے اسے جمود کی فضا کہا گیا۔مگر جب آدم نے دانہ ءگندم چکھ لیا تو دیکھتے ہی دیکھتے جمود کی فضاء پارہ پارہ ہوگئی اور پھر اس ذہنی اور جذباتی جزر ومد کا آغاز ہوا جس سے یہ تحریک عبارت ہوتی ہے۔''(۴۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں ہر طرف جمود تھا، فضاء یکسر ساکن تھی اور تحرک پر صرف اللہ تعالیٰ قادر تھا جب آدمؑ کی تخلیق ہوئی تو جامع فضاء میں بھی حرکت کی پہلی لہر پیدا ہوئی۔

باب دوم:''ریختہ کی دو تحریکیں'' کےعنوان سے ہے جس میں برِصغیر کی قدیم تحریکوں کا پسِ منظر بھگتی تحریک، ریختہ کی پہلی تحریک۔امیر خسرو، صوفیاء کی تحریک، ریختہ کی دوسری تحریک۔ولی دکنی، ولی اور شاہ گلشن کی ملاقات وغیرہ شامل ہیں۔
باب سوم: ''اٹھارویں اور انیسویں صدی کی لسانی تحریکیں'' کےعنوان سے ہے جس میں ایہام کی تحریک، تحریکِ ایہام کا ردِعمل، اصلاحِ زبان کی تحریک، اصلاح زبان کی تحریک کا ردِعمل کو شامل کیا گیا ہے۔''اصلاحِ زبان کی تحریک کا ردِعمل'' کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

''ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہوگیا ہے، عربی ہو یا فارسی، ترکی، ہریانی، سریانی، پنجابی ہو یا پوربی ازروئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے اگر اصل کے مطابق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلافِ اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔اس کی صحت و غلطی اُردو کے استعمال پر موقوف ہے کیوں کہ جو کچھ خلافِ اُردو ہے غلط ہے گو اصل میں وہ صحیح ہو اور جو کچھ موافق اُردو ہے صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو۔''(۴۶)

اصلاحِ زبان کی تحریک کا ردِعمل میں مصنف نے اُردو کی اصلیت کو اجاگر کیا اور بتایا کہ جو کچھ موافق اُردو ہے وہ صحیح ہے۔بابِ چہارم: ''فورٹ ولیم کالج کی تحریک'' کےعنوان سے ہے۔باب پنجم: ''علی گڑھ تحریک'' کےعنوان سے ہے پس علی گڑھ تحریک، پسِ منظر، تحریک سید احمد بریلوی، برہمو سماج تحریک، آریہ سماج تحریک، تحریک دلّی کالج اور علی گڑھ تحریک کےعنوان سے ہے۔علی گڑھ تحریک کے بارے میں مصنف رقمطراز ہیں:

''علی گڑھ تحریک اُردو کی اوّلین فکری تحریک تھی۔اس تحریک سے پہلے زبان کی ظاہری ہیئتوں پر توجہ

صرف ہوئی تھی۔ اُردو زبان کا استخوان ہندوستانی لیکن مغز ایرانی تھا اس تحریک نے ان دونوں میں
جسم اور روح کا رشتہ قائم کیا اور لفظ کے حسن کو اجاگر کرنے کے بجائے روح اور معنی کو اہمیت
دی۔''(۴۷)

بابِ ششم: ''انجمن پنجاب کی تحریک'' کے عنوان سے ہے جس میں تحریک انجمنِ پنجاب کا تنقیدی زاویہ، تحریک انجمنِ پنجاب کے اثرات، تحقیقی اور تنقیدی جہت کی توسیع اور تجزیہ و نتائج شامل ہیں۔ باب ہفتم: ''اقبال کی تحریک'' کے حوالے سے ہے جس میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کے اواخر میں جب اُردو زبان کے مطلعِ ادب پر اقبال کا ظہور ہوا تو برِصغیر میں
سیاست، معاشرت، مذہب اور ادب کی متعدد تیز روئیں آپس میں متصادم ہو چکی تھیں چنانچہ اقبال
کی تحریک ایک ایسے پسِ منظر سے ابھری جس میں تلاطم اور پیکار زیادہ ہے۔ لیکن تحریک اقبال نے
جمود کو حرکت میں اور قنوطیت کو رجائیت میں بدلنے کی سعی کی۔'' (۴۸)

اُردو زبان کے مطلع ادب پر اقبال کا ظہور ہوا تو برصغیر میں سیاسی، معاشرتی اور مذہبی تیز روئیں متصادم ہوئیں لیکن تحریک اقبال کے جمود کو حرکت اور مایوسی کو رجائیت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ باب ہشتم: ''رومانی تحریک'' کے عنوان سے ہے جس میں مخزن کی تحریک، اُردو شاعری میں رومانیت، اُردو تنقید میں رومانیت کو شامل کیا گیا ہے جب کہ باب نہم: ''ترقی پسند تحریک'' کے عنوان سے ہے جس میں حقیقت نگاری اور ترقی پسند تحریک، افسانہ، شاعری اور تنقید کو موضوع بنایا گیا ہے۔ باب دہم: ''حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک'' کے عنوان سے ہے جس میں حلقہ ارباب کی شاعری، افسانہ اور تنقید شامل ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حلقہء اربابِ ذوق کی ابتداء افسانہ خوانی سے ہوئی تھی۔ میراجی نے اس کا رخ تنقید کی طرف
موڑا۔ حلقے کے رفقاء میں سے یوسف ظفر، قیوم نظر، تابش صدیقی اور حلقے کی مرکزی شخصیت میراجی
کا شمار نئے شعراء میں ہوتا تھا۔ اس لئے بہت جلد حلقے کا رخ شاعری کی طرف ہو گیا۔ میراجی اس
گروہ کے سب سے زیرک، باکمال اور تخلیقی لحاظ سے خلّاق شاعر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اُردو نظم میں
داخلیت کا وہ رجحان پیدا کیا جس کی ابتداء تصدق حسین خالد اور ن۔م۔ راشد کر چکے تھے۔ ان تینوں
شعراء کی اساسی عطا یہ ہے کہ انہوں نے پابند نظم کی مقبولیت کے دور میں آزاد اور معرّٰی نظم کو اہمیت
دی اور یوں شعراء کو نہ صرف نئے اسلوبِ شعر سے روشناس کرایا بلکہ جذبے کے جزر و مد کو چھوٹے
بڑے مصرعوں میں سمونے کا سلیقہ بھی سکھا دیا۔''(۴۹)

باب یازدہم: ''تحریکِ ادبِ اسلامی'' کے عنوان سے ہے اور باب دوازدہم: ''پاکستان میں اُردو ادب کی دو تحریکیں'' کے عنوان سے ہے جس میں پاکستانی ادب کی تحریک اور ارض ثقافتی تحریک کے موضوع کو شامل کیا گیا ہے۔ پاکستانی

ادب کی تحریک کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

''پاکستانی ادب کی تحریک ادبی سطح پر قومیت کو ابھارنے والی ایک اہم تحریک تھی اس تحریک نے زمین کو آسمان کے تابع قرار دے کر قومی سطح پر ادب پیدا کرنے کی طرح ڈالی۔ چنانچہ اس پر سب سے پہلا مخالفانہ حملہ ترقی پسند تحریک نے کیا اور اس کی نظریاتی اساس کو دلیل سے رد کرنے کے بجائے اس تحریک کے ادباء سے عدم تعاون کا منصوبہ بنا لیا۔ ہر چند اس قسم کا سیاسی عمل ادب کے ارتقاء میں رکاوٹ نہیں بنتا تاہم المیہ یہ ہوا کہ اس تحریک نے اپنی نظریاتی بنیاد تو استوار کر لی لیکن اس کی صداقت کو تخلیقی سطح پر ثابت کرنے کے لئے اچھے شاعروں اور افسانہ نگاروں کا تعاون حاصل نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک معنوی اور تخلیقی طور پر زیادہ عرصے سے زندہ نہ رہ سکی اور ترقی پسند تحریک پر پابندی لگ جانے کے بعد جب اس کا ادبی حریف میدانِ عمل سے ہٹ گیا تو یہ تحریک دوبارہ حلقہء اربابِ ذوق میں فطری طور پر ضم ہو گی۔''(۵۰)

پاکستان کا قیام محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ یہ ان تحریکوں کی فکری اور ثقافتی جہت بھی متعین کرتا ہے۔ آزادی کے فوراً بعد ادب میں جو اوّلین تحریک رونما ہوئی اس نے ارضِ پاکستان کی نسبت سے زمین کے اور اسلامی نظریات کے حوالے سے آسمان کے عناصر کی اہمیت کو تسلیم کیا اور نئے ادب کی تخلیق کے لئے ان دونوں کا امتزاج ضروری قرار دیا۔ کتاب مذکورہ کے آخر میں اختتامیہ، مطالعے کی کتابیات (اُردو) مقالات، اور انگریزی کتابیات کو شامل کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر انور سدید کی کتاب جامع ہے اور کتاب مذکورہ کی فہرست ابواب سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے ایک بڑے موضوع کا احاطہ کتنی محنت اور توجہ سے کیا ہے اور اہلِ نظر میں یہ کتاب تاریخی لحاظ سے نہایت اہم ہے۔

۸۔ اُردو شاعری کا ارتقاء (۱۷۳۹ء تا ۱۸۰۳ء) ڈاکٹر ناہید کوثر

ڈاکٹر ناہید کوثر کی تاریخی تحقیق ''اُردو شاعری کا ارتقاء'' (۱۷۳۹ء تا ۱۸۰۳ء) ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو انہوں نے افتخار احمد صدیقی کی نگرانی میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مکمل کیا اسے مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۳ء شائع کیا۔(۵۱) اپنے موضوع کی داستان سناتے ہوئے پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

''ایم اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں مطالعہ کے میدان میں ذرا آگے بڑھی تو اندازہ ہوا کہ اُردو غزل کے بارے میں بہت کچھ کیا جا سکتا ہے چنانچہ میں نے اس موضوع پر کافی مطالعہ کیا اور ''اُردو غزل کا ارتقاء ۱۷۳۹ء تا ۱۸۰۳ء کے عنوان سے بورڈ آف اسٹڈیز اُردو (پنجاب یونیورسٹی) کو

ابتدائی خاکہ اور کتابیات پیش کیں لیکن ماہرین نے یہ رائے دی کہ پی ایچ ڈی کے لئے یہ موضوع مناسب نہیں چنانچہ یہ تجویز ہوئی کہ اس عہد کے تمام اصنافِ سخن کا محققانہ و ناقدانہ جائزہ لینا چاہئے لہٰذا ازسرِ نو خاکہ مرتب کر کے پیش کیا گیا جسے یونیورسٹی نے منظور کر لیا۔ چونکہ یہ موضوع بے حد وسیع و بسیط ہو گیا تھا اس لئے ہر مرحلے پر پھونک پھونک کر قدم رکھنا تھا۔ ہر طرح کی افراط و تفریط سے دامن بچانا تھا۔ تاہم اس میں جہاں بھی تنقیدی یا تحقیقی پہلو تشنہ تھا اس کو حتی الامکان زیرِ بحث لانے کی کوشش کی گئی۔ اگر موضوع صرف غزل تک ہی محدود رہتا تو اس میں زیادہ گہرائی پیدا ہو سکتی تھی گو یہ میری طالب علمانہ کاوش ہے تاہم میں نے اس بات کو مدِ نظر رکھا ہے کہ اس دور کے مخصوص سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی حالات کے زیرِ اثر جن اصناف نے ترقی پائی اس کا بخوبی تجزیہ پیش کیا جا سکے۔ ہر باب کے آغاز میں اس کا مفصل خاکہ پیش کر دیا گیا لہٰذا یہاں ان ابواب کا خلاصہ باعثِ طوالت ہو۔''(۵۲)

اُردو شاعری کا ارتقاء کو چھ مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے قاری کی سہولت کے لئے ہر باب کی فصلیں تیار کی گئی ہیں جو پوری کتاب پڑھنے کا تقاضہ کرتی ہیں۔ پہلے تین ابواب ہندوستان کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات، شمالی ہند میں اُردو شاعری اور اصلاحی تحریکوں پر مبنی ہیں جن میں مصنفہ نے ہندوستان کے حالات سمیت فارسی زوال، ریختہ گوئی کی تحریکیں، ابتدائی لسانی، دہلی کی ابتدائی شاعری، تذکرہ نگاری، سلاطین کی ادب دوستی، اصلاحِ زبان کی تحریکوں، ادبی پہلوؤں اور ادبی موضوعات پر مباحث کئے ہیں۔ ان صفحات کو پڑھ کر ہندوستان کی قدیم شاعری اور اندرونی حالت کے بارے میں سیر حاصل معلومات ملتی ہیں۔ جہاں تک شعری اصناف کا تعلق ہے مصنفہ نے زیادہ صفحات غزل اور مثنوی کے شاندار ماضی پر صرف کئے ہیں یہ دور ولی دکنی اور اسی لئے اس دور میں غزل کے عروج کے ساتھ ساتھ مثنوی کے خاص مزاج اور مختلف رجحانات پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے۔ مثنوی کے موضوعات میں محمد شاہی دور کی عشقیہ مثنویاں، سوانحی مثنویاں، طنزیہ مثنویاں اور صوفیانہ مثنویاں جن میں اخلاقیات حاوی ہیں، پیش کی گئی ہیں۔ غزل اور مثنوی کی نسبت دیگر اصناف خصوصاً قصیدہ، مرثیہ اور نظیر اکبر آبادی کی نظموں پر بھی تہذیبی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس دور کی اہمیت اور افادیت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے لائقِ تحسین و آفرین ہے۔ غزل جب دکن سے دہلی تک آئی اور میر و مرزا نے اس کو سنوارا تو اس وقت کیا رنگارنگی سامنے آئی؟ مصنفہ لکھتی ہیں:

''اس دور میں داخلیت پسندی کا عنصر غالب آتا ہے جس سے اُردو غزل میں فکری عنصر اور داخلی مضامین کا اضافہ ہوا۔ حد سے بڑھتی ہوئی سیاسی افراتفری، ملکی بدنظمی، تہذیبی قدروں کا زوال اور معاشی بدحالی نے داخلیت پسندی کے رجحانات کو فروغ دیا یہ رجحان منفی نہیں کیونکہ اس میں خارجی تجربہ کا عکس موجود ہے۔ اس دور کی داخلیت پسندی محض شعراء کے اپنے دل ہی کا مرثیہ نہیں ہے بلکہ اجتماعی شعور کی بدولت اس میں دلّی کی تہذیب اور ایک عظیم سیاسی اور معاشرتی نظام کے جانے کا درد

بھی شامل ہے۔'' (۵۳)

غزل اور مثنوی کے علاوہ شہرِ آشوب، رُباعی، قصیدہ اور مرثیہ نگاری کے آغاز وارتقاء پر بھی انیسویں صدی کے آغاز تک تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جعفر علی، سوؔدا، قائم، میر حسن، میر صاحب، میر سوز، میر تقی میر اور دیگر شعراء کے مختلف نوعیت کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جعفر علی حسرت کے ایک شہرآشوب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''جعفر علی حسرت کا بھی ایک شہرِ آشوب مخمس دراحوالِ دہلی ملتا ہے رسالہ نقوش اکتوبر ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر محمد عمر نے اس شہرِ آشوب کو میر محمد حیات المخاطب بہ ہیبت علی خان حسرت عظیم آبادی المتوفی ۱۲۱۰ھ سے منسوب کیا ہے۔'' (۵۴)

اُردو شاعری کے جس دور کا انتخاب مصنفہ نے کیا ہے وہ میر و مرزا، درد قائم اور میر ضاحک وغیرہ کے شعری عروج کا دور ہے۔ میر وسودا کی شاعری کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کی معاصرانہ چشمک کے پیشِ نظر بہت سے جگہوں پر ان کا موازنہ بھی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً سودا کی ہجویہ مثنویوں پر بات کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''سودا کی مثنوی نگاری کا کمال ان کی ہجویہ مثنویوں سے نمایاں ہے۔ میر نے بھی اگرچہ ہجویہ مثنویاں لکھی ہیں لیکن سودا کی ہجو نگاری کے سامنے میر تو کیا اُردو زبان کے کسی شاعر کی بھی دال نہیں گلتی۔''(۵۵)

مصنفہ نے شمالی ہند میں شاعری کے سنہری دور کا موضوع لے کر بہت بڑا معرکہ سرانجام دیا ہے اہم بات یہ ہے کہ اس دور میں شعراء کی کثیر تعداد تھی پھر مصنفہ نے ہر بڑے شاعر کی کوئی نہ کوئی خوبی بیان کر کے اس کو امتیازی حیثیت دینے کی کوشش کی ہے۔ سودا کو ہجویہ مثنویاں اور قصائد کی بنا پر بڑا شاعر کہا ہے تو میر کو غزل اور عشقیہ مثنویوں کی بدولت عزت دی ہے۔ قائم چاند پوری کو مثنوی کی کثرتِ تعداد، فنی محاسن اور موضوعات متنوع کی وجہ سے اولیت دی ہے تو خواجہ میر درؔد کو رباعی کے امکانات وسیع کرنے پر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ غرض یہ کہ تمام قابلِ ذکر شعراء کو کوئی نہ کوئی ایسی خوبی بیان کی ہے جس سے وہ منفرد نظر آتا ہو۔ خواجہ میر درؔد کی رباعیات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شمالی ہند میں اگرچہ تقریباً ممتاز شعراء نے رباعیاں کہی ہیں لیکن خواجہ میر درؔد، میر تقی میؔر اور سوؔدا نے اس صنف کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے اور رباعی کے امکانات کو وسیع کرنے میں مدد دی ہے۔ رباعی نگاری کی حیثیت سے درد کا اپنے معاصرین میں ایک خاص مرتبہ ہے۔ ان کی رباعیوں کی تعداد اگرچہ تیس بتیس ہے مگر درد کا کمال یہ ہے کہ ان کی رباعیاں ہر سقم سے پاک ہیں۔'' (۵۶)

اسی طرح قائم چاند پوری کا اعتراف یوں کرتی ہیں:

''قائم کی مثنویاں کثرتِ تعداد، فنی محاسن اور موضوعات کے تنوع، غرض ہر لحاظ سے خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ قائم کی طویل عشقیہ مثنوی ''عشق درویش'' ۱۳۷۳ اشعار ہیں جس میں پنجاب کے ایک

درویش شاہ لدھا کی داستانِ معاشقہ نظم کی گئی ہے۔'' (۵۷)

اُردو شاعری کا صحیح کلاسیکی دور اٹھارویں صدی کے انجام تک تھا اس کے بعد غالب کے علاوہ بہت کم شعراء ایسے ہیں جو اُردو کے سنہری دور کا مقابلہ کر سکیں۔

شمالی ہند کے اس دور پر ڈاکٹر نورالحسن نقوی سے لے کر ڈاکٹر سلیم اختر تک تقریباً سیکڑوں مؤرخین نے بہت لکھا ہے اور اسے خوب نبھایا بھی ہے۔ ڈاکٹر ناہید کوثر نے صرف شمالی ہند کے اس سنہری دور کا انتخاب کر کے ادبی حلقوں کی تمام توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ ایسا ہے جسے فراموش کرنے والا ہر صاحبِ ذوق ادبی گنہگار سمجھا جائے گا۔

۹۔ تاریخ ادبِ اُردو (جلد سوم) (ڈاکٹر جمیل جالبی)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب تاریخِ ادبِ اُردو جلد سوم انیسویں صدی نصف اوّل سے متعلق ہے۔ اسے بھی مجلس ترقی ادب لاہور نے طبع اوّل کے طور پر جون ۲۰۰۶ء میں شائع کیا۔ (۵۸) اس جلد کے لئے بھی ڈاکٹر موصوف نے پیش لفظ لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''تاریخِ ادبِ اُردو'' کی تیسری جلد اب آپ کے سامنے ہے جو اپنی جگہ پر مکمل بھی ہے اور پچھلی جلد سے پوری طرح مربوط بھی۔ پہلی جلد آغاز سے ۱۷۵۰ء تک اُردو ادب و زبان کا احاطہ کرتی ہے۔ دوسری جلد اٹھارویں صدی کا احاطہ کرتی ہے اور یہ تیسری جلد انیسویں صدی کے ادب و زبان پر محیط ہے۔ قارئین کرام اس بات سے ضرور واقف ہوں گے کہ انیسویں صدی تخلیقِ ادب اور رواجِ زبان کے اعتبار سے اُردو کی سب سے بڑی صدی ہے۔ اس صدی میں اُردو زبان کے متعدد ادیب و شاعر دادِ تخلیق دے رہے ہیں اور اُردو زبان نہ صرف سارے ہندوستان کے گلی کوچوں میں سمجھی اور بولی جارہی ہے بلکہ بادشاہ سے لے کر وزیر تک اور امیر سے لے کر فقیر تک سب یہ زبان بول رہے ہیں۔'' (۵۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک انیسویں صدی اُردو زبان کے لئے بہت اہم ہے اس صدی میں اُردو ہر طبقے کی زبان بن چکی تھی، ادیب، شاعر اور تخلیق کار کے علاوہ وہ گلی کوچے کے عوام کی زبان بن چکی تھی، امیر و غریب اس زبان میں بات کرتے تھے۔ اس جلد کی پانچ فصلیں ہیں پہلی فصل میں چھ ابواب ہیں۔ پہلا باب: اُردو شاعری، محرکات و رجحانات، روایت وغیرہ کے عنوان سے ہے جبکہ دوسرا باب قلندر بخش جرات، معرکہ مصحفی و جرأت، تہذیبی اثرات، معاملہ بندی، مثنویات اور دوسری اصناف کا مطالعہ، جرأت کی زبان پر مشتمل ہے گویا دوسرا باب: جرأت یہ ہے جرأت کے بارے میں

ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

''جعفر علی حسرتؔ (۱۲۰۶ھ/ ۱۷۹۱ء) نے جس رنگِ سخن کو لکھنؤ و فیض آباد کی تہذیبی فضاء کے ساتھ مل کر نکھارا تھا، جراُت نے اس رنگِ سخن کے سارے امکانات کو تصرف میں لا کر اپنی انفرادیت کی مہر ثبت کر دی اور خود اس رنگِ سخن کے نمائندہ بن گئے۔ اسی لیے آج ہم جعفر علی حسرت کو بھول جاتے ہیں اور قلندر بخش جراُت ہمیں یاد رہ جاتے ہیں۔

شیخ قلندر بخش جراُت (۱۱۶۲ھ تا ۱۲۲۴ھ) (۱۷۴۹ء تا ۱۸۰۹ء) جن کا یحییٰ امان، عرفیت قلندر بخش اور تخلص جراُت تھا، دہلی کے رہنے والے تھے۔ اکثر تذکروں میں جراُت کا نام قلندر بخش بتایا گیا ہے جو اس لئے درست نہیں ہے کہ خود جراُت نے اپنے ایک شعر میں اپنا نام یحییٰ امان بتایا ہے۔

جراُت کہے تھا کل وہ کسی سے یہ الاماں جتنا رکھوں نہ مجھ کو جو یحییٰ اماں ملے۔'' (۶۰)

جراُت اپنی ذات میں جعفر علی حسرتؔ کی روایت کا شاعر تھا مگر اس نے اپنی انفرادیت بھی قائم کی تھی اور ایک بلند مقام پایا تھا۔ تیسرا باب: انشاء اللہ خان انشاء چوتھا اور پانچواں باب: غلام ہمدانی مصحفی کے بارے میں ہے اور چھٹا باب: سعادت یار خان سے متعلق ہے۔ مصنف نے فصل اوّل میں ہی چند دوسرے شعراء کے عنوان کے تحت ''روایت کی تکرار'' کے ذیلی عنوان سے مزید چار ابواب اور بھی قائم کئے ہیں اور ان ابواب میں اس عہد کے چند مزید شعراء کا تذکرہ کیا ہے۔ فصل اوّل میں آئے چل کر ''چند اور شعراء'' کے عنوان سے ایک اور ذیلی عنوان قائم کیا ہے اور اس ذیلی عنوان ''روایت کی تبدیلی کا عمل و آغاز'' کے تحت مزید اور چار ابواب قائم کئے ہیں جن میں طالب علی خان عیشی، جسونت سنگھ پروانہ، قاضی محمد صادق اختر اور مہدی علی خان ذکی مراد آبادی کی شعری خدمات کو پیش کیا ہے۔

فصل دوم میں اُردو نثر کا جائزہ پیش کیا ہے جس کے پندرہ ابواب قائم کئے ہیں پہلا باب فورٹ ولیم: مقاصد و تعارف کے عنوان سے ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

''فورٹ ولیم کالج کلکتہ انیسویں صدی کا ایک اہم ادارہ تھا جس کی بنیاد انگریز گورنر جنرل مارکوئیس ولزلی نے ٹیپو سلطان کی شکست اور انگریزوں کی فیصلہ کن فتح (۴ مئی ۱۷۹۹ء) کی پہلی سالگرہ (۴ مئی ۱۸۰۰ء) کے موقع پر رکھی تھی۔ اس کالج کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ان نئے افسران کی، جو پندرہ سولہ سال کی عمر میں انگلستان سے بھرتی کر کے ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ یہاں تعلیم و تربیت کی جائے کہ وہ نہ صرف اپنے فرائض منصبی کو پوری کارکردگی سے ادا کر سکیں بلکہ مشرق میں برطانوی طاقت کے پر جوش حامی بن کر دنیا کے اس حصے میں عیسائی مذہب کو بھی قائم کر سکیں۔'' ولزلی کا خیال تھا کہ یہ نوجوان جو سول ملازمت حاصل کر کے ہندوستان بھیجے جاتے ہیں نہ صرف کم تعلیم یافتہ اور

بے تربیت ہوتے ہیں بلکہ وہ ہندوستان کی زبانوں اور یہاں کے طور طریقوں، رسم و رواج اور قاعدے قانون سے بھی ناواقف ہوتے ہیں اور جب اپنے منصب پر فائز کئے جاتے ہیں تو ان کی حیثیت ایک ایسے ادنیٰ ملازم کی سی ہوتی ہے جو نقل نویس بابو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اس لئے اس ادارے کو قائم کرنے کا مقصد رکھا گیا تھا۔'' (۶۱)

ڈاکٹر موصوف کے بہ قول فورٹ ولیم کالج کا مقصد حکمرانی اور عیسائیت کی مضبوطی تھا۔ دوسرا باب جون گل کرسٹ سے متعلق ہے جبکہ باقی تیرہ ابواب ان نثر نگاروں سے متعلق ہیں جنہوں نے فورٹ ولیم کالج کے زیرِ انتظام اُردو نثر کی تخلیقت کے جوہر سے آشنا کیا۔

تیسری فصل ''نوطرز مرضع اور فسانہ عجائب کی درمیانی کڑیاں،'' کے عنوان سے ہے جس میں محمد بخش مہجور، عظمت اللہ نیاز، غلام علی عشرت کے حالات اور مطالعہ اوران کی کتب گلشن نو بہار، نورتن، قصہ رنگیں گفتار، اور داستان سحر البیان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ فصل سوم میں ہی کہیں مزید ابواب ''نثر رنگین کا نقطہ عروج'' کے عنوان سے ذیلی عنوانات مرزا رجب علی بیگ سرور، فخر الدین حسین سخن دہلوی اور جعفر علی شیون کا جائزہ لیا گیا ہے۔

فصل چہارم میں مجموعی طور پر اٹھارواں باب قائم کئے گئے ہیں جن میں امام بخش ناسخ، حیدر علی آتش علی اوسط رشکؔ، فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق، امداد علی خواجہ محمد وزیر، فقیر محمد خان گویا، کلب حسین خان نادر، مرزا حاتم علی مہر، میر کلّو عرش، عبدالغفور خان نساخ، آغا حسن امانت علی لکھنوی، محمد خان رند، میر وزیر علی صبا، آغا حجو شرف، پنڈت دیا شنکر نسیم، اور نواب مرزا شوق کے فکر و فن کو موضوع بنایا گیا ہے۔

فصل پنجم دو ابواب پر مشتمل ہے پہلا باب بادشاہ واجد علی شاہ کے فن اور شخصیت کے متعلق ہے جبکہ دوسرا باب نظیر اکبر آبادی کے فن و شخصیت کی تفصیل بیان کی ہے جلد کے آخر میں افراد، کتب، رسائل، مخطوطات و مطبوعات کا اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

۱۰۔ تاریخِ ادبِ اُردو (جلد چہارم) ڈاکٹر جمیل جالبی

ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب ''تاریخ ادبِ اُردو'' (جلد چہارم) فروری ۲۰۱۲ء میں علی پرنٹرز نے ۱۹۔اے ایبٹ روڈ، لاہور سے شائع ہوئی۔ (۶۲) اس میں انیسویں صدی نصف آخر کے اُردو ادب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں چار فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں اکیس ابواب ہیں پہلے چھ ابواب تو صرف غالبؔ کے متعلق ہیں ساتواں باب نثر اور باقی کے تمام ابواب شعراء کے متعلق ہیں غالبؔ کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''غالب کی اُردو غزل کو دیکھا جائے تو انہوں نے غزل گوئی کی روایت کو قائم رکھا ہے۔ غزل، جیسا کہ حسن و عشق کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ غالب نے اسے اسی دائرے میں اپنے مخصوص انداز کے ساتھ برقرار رکھا ہے۔ ''دیوانِ غالب'' کا مطالعہ کیجئے تو غزل کے عام موضوعات مثلاً عشق و ہجر، وصال، یاس و نا امیدی، جور و جفاء، معشوق کی بے وفائی، بے تابی، تمکین و ضبط، تسلیم و رضا، استقامت و بے زبانی وغیرہ غالبؔ کے ہاں بھی آپ کو ملیں گے۔ محبوب کے حسن کے بیان میں بھی زلف، رخسار، لب، کمر، قد وغیرہ کے حوالے نظر آئیں گے۔ رقیب کی روسیاہی، محبوب تک اس کی رسائی، عاشق کا رشک کی آگ میں جلنا، دیوانہ وار پھرنا اور اسی قسم کی روایتی باتیں آپ کو غالب کے ہاں بھی ملیں گی اور یوں معلوم ہوگا کہ نہ صرف غزل کی ظاہری فضاء اس میں قائم ہے بلکہ روایتی رموز و کنایات بھی پوری طرح موجود ہیں۔'' (۶۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے غالب کی روایت پسندی پر بات کی ہے ان کے نزدیک غالب نے غزل کی روایت کو قائم رکھا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے مگر غالب نے فکر و فلسفہ کو بھی اُردو شاعری میں پہلی مرتبہ بیان کیا ہے انسانی نفسیات کو بھی بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے غالب کی فارسی شاعری پر تفصیلی مقالہ تحریر کیا ہے۔ غالب کی فارسی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مرزا غالب ان تمام نامور شعرائے فارسی کے کلام سے گہری واقفیت رکھتے تھے جنہوں نے فارسی شعر و ادب میں تخلیقی سطح پر کارہائے نمایاں انجام دئے تھے۔ ان سب کے اثرات ان کے زبان و بیان پر نظر آتے ہیں اور انہیں شعراء سے وہ سند لیتے تھے اور ان میں بھی انوری، عرفی، خاقانی، طالب آملی، ظہوری، نظیری، علی حزیں اور بیدل وغیرہ وغیرہ کو وہ استاد مانتے تھے۔ بیدل کا ان کا شاعری پر گہرا اثر ہے اور وہ اس لئے بھی کہ بیدل اور غالب کے مزاج کی بہت سی خصوصیات مشترک ہیں۔ مفکرانہ و حکیمانہ نظر اور تصوف سے لگاؤ میں دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔ دونوں رجائی خیال کے دل دادہ ہیں اور آتش پسندی و شعلہ نوائی میں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ دونوں کے لئے زندگی ایک جد و جہد اور عزم استقلال کا نام ہے۔ دونوں مشکل پسند ہیں اور طرزِ ادا میں مابعد الطبیعیاتی رنگ کے حامل ہیں۔ طرزِ بیدل کا تتبع غالب کے ہاں محض تقلید نہیں ہے بلکہ ان کے مزاج و فطرت کا تقاضا ہے۔ قصیدہ گوئی میں وہ عرُفی سے حد درجہ متاثر ہیں انہوں نے کم و بیش پندرہ قصیدے عرفی کی زمین میں کہے ہیں اور عرفی ہی کی طرح مفکرانہ و حکیمانہ انداز اختیار کیا ہے۔ دونوں میں جدتِ طبع بھی تھی۔ اور خود پرستی و خودستائی بھی۔ مضمون آفرینی بھی دونوں کے مزاج میں شامل تھی۔ غزل میں بھی نظیری کا اثر غالب کے ہاں موجود ہے لیکن ان سب اثرات کے باوجود

اپنی جدتِ طبع وذکاوت سے ان تمام اثرات سے بالاتر ہو کر نکل گئے اور اپنا الگ رنگ بنایا۔'' (۶۴)

غالب جن شعراء سے متاثر تھے ان میں بیدل اہم ہیں بیدل اور غالب میں مشکل پسندی، فکر و فلسفہ اور حکیمانہ اندازِ نظر مشترک ہے دونوں کا انداز ایک ہے تاہم غزل میں نظیری سے بھی غالب متاثر ہیں۔

پہلی فصل کے تمام ابواب اپنے مندرجات کے اعتبار سے اہم ہیں تاہم ڈاکٹر موصوف نے شعراء کے سوانح اور کلام کی تفہیم کے لئے اعلیٰ تحقیق اور تنقید کا معیار قائم کیا ہے۔ فصل دوم اُردو مرثیہ کے متعلق ہے اس میں عمومی طور پر ذیلی عنوانات کے تحت تیرہ ابواب ہیں۔ پہلے پانچ ابواب اُردو مرثیہ، روایت وارتقاء، انیس و دبیر، خلیق، مظفر حسین ضمیر، چھنو لال دلگیر، مرزا جعفر علی فصیح وغیرہ سے متعلق ہیں۔ خصوصاً میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر کے متعلق الگ الگ ابواب قائم کئے ہیں اور سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

فصلِ سوم بہت اہم ہے اس میں اُردو نثر کا تنوع، طنز و مزاج کی روایت کی بات کی گئی ہے۔ اودھ پنچ اور ان کے لکھنے والوں پر پہلے دو ابواب لکھے گئے ہیں، سر سید احمد خان، خواجہ الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اسی فصل سوم کے آخر میں روایت شاعری کے فروغ پر بات کی گئی ہے۔

فصل چہارم میں اُردو داستانیں موضوع بنی ہیں۔ طلسم ہوش ربا، بوستان خیال، فسانہ آزاد اور سرشار پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ فصل چہارم میں ابواب قائم کرنے کے بجائے ذیلی عنوانات سے کام چلایا گیا ہے۔ مثلاً داستان اور ناول کا امتزاج، دوسری اصناف نثر کا مطالعہ مذہبی تصانیف میں اُردو نثر، تذکروں میں اُردو نثر، کتب تواریخ میں اُردو نثر، اُردو نعت گوئی کا نیا رنگ، نئی روایت، شاعری کے دو روایتی رنگ، انیسویں صدی کا خاتمہ اور جدید دور کا ارتقاء شامل ہیں۔

سب سے آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے اشاریہ افراد و اشخاص کتب و رسائل، مخطوطات، مطبوعات کا دیا گیا ہے۔ مجموعی طور دیکھا جائے تو جلد چہارم ایک جامع کتاب ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اُردو، بک کارنر جہلم پاکستان، ستمبر ۲۰۱۶ء، ص۔۱۸

۲۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اُردو، اُردو اکیڈمی سندھ، طبع چہارم، ۱۹۸۸ء، ص ص۔۳،۴

۳۔ ایضاً ص۔۱

۴۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اُردو، اُردو اکیڈمی سندھ، ایضاً ص۔۶۰

۵۔ ایضاً ص۔۸۴

۶۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ، ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۔۲۹۹

۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو، (جلد اوّل) قدیم دور (آغاز سے ۱۷۵۰ء تک) مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور ص۔۳

۸۔ ایضاً ص۔ز

۹۔ ایضاً ص۔ح

۱۰۔ ایضاً ص۔۳۴

۱۱۔ ایضاً ص۔۵۷

۱۲۔ ایضاً ص۔۴۷

۱۳۔ ایضاً ص۔۸۹

۱۴۔ ایضاً ص۔۹۳

۱۵۔ ایضاً ص۔۱۸۶

۱۶۔ ایضاً ص ص۔۱۵۴، ۱۵۵

۱۷۔ ایضاً ص۔۱۹۰

۱۸۔ ایضاً ص۔۲۶۵

۱۹۔ ایضاً ص۔۲۸۰

۲۰۔ ایضاً ص۔۴۱۱

۲۱۔ ایضاً ص۔۵۱۷

۲۲۔ ایضاً ص۔۵۲۹

۲۳۔ ایضاً ص۔۵۴۰

۲۴۔ ایضاً ص۔۵۹۰

۲۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو، (جلددوم) (اٹھارویں صدی) مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور طبع چہارم، جنوری ۲۰۰۵ء، ص۔۲

۲۶۔ ایضاً ص۔۱۱

۲۷۔ ایضاً ص۔۲۰

۲۸۔ ایضاً ص۔۱۹

۲۹۔ محمد ایوب قادری، ڈاکٹر، اُردو نثر کے ارتقاء میں علما کا حصہ شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، طبع اوّل، ص۔۲

۳۰۔ ایضاً ص۔۱۸

۳۱۔ ایضاً ص۔۲۳

۳۲۔ ایضاً ص ص۔۳۰، ۳۱

۳۳۔ ایضاً ص۔۳۲۶

۳۴۔ عابدہ بیگم، ڈاکٹر، اُردو نثر کا ارتقاء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبع اوّل، دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ص۔۹، ۱۰

۳۵۔ ایضاً ص۔۱۰۶

۳۶۔ ایضاً ص۔۲۶۳

۳۷۔ ایضاً ص ص۔۳۰۹، ۳۱۰

۳۸۔ ایضاً ص۔۳۵۲

۳۹۔ سید وقار عظیم، پروفیسر، فورٹ ولیم کالج (تحریک اور تاریخ)، ترتیب، تعارف، تعلیقات (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)، یونیورسل بکس، اُردو بازار، لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۸ء، ص۔۲

۴۰۔ ایضاً ص۔۶۷

۴۱۔ ایضاً ص۔۱۰۰

۴۲۔ ایضاً ص۔۸۰

۴۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، طبع نہم، ص۔۲

۴۴۔ ایضاً ص۔۱۱

۴۵۔ ایضاً ص۔۲۵

۴۶۔ ایضاً ص۔۲۰۸

۴۷۔ ایضاً ص۔۳۲۱

۴۸۔ ایضاً ص۔۳۶۹

۴۹۔ ایضاً ص۔۵۱۹

۵۰۔ ایضاً ص ص۔۵۶۰، ۵۶۱

۵۱۔ ناہید کوثر، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا ارتقاء، (۱۷۳۹ء تا ۱۸۰۳ء)، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۔۴

۵۲۔ ایضاً ص۔۱

۵۳۔ ایضاً ص۔۹۱

۵۴۔ ایضاً ص۔۳۲۰

۵۵۔ ایضاً ص۔۲۶۲

۵۶۔ ایضاً ص۔۳۸۲

۵۷۔ ایضاً ص۔۱۹۴

۵۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو، (جلد سوم) (انیسویں صدی: نصف اوّل)، مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور طبع اوّل، جنوری ۲۰۰۶ء، ص۔۳

۵۹۔ ایضاً ص۔۱۵

۶۰۔ ایضاً ص۔۶۵

۶۱۔ ایضاً ص۔۴۰۷

۶۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد چہارم) علی پرنٹرز، ۱۹۔اے ایبٹ روڈ لاہور، ص ۲

۶۳۔ ایضاً ص۱۱۴

۶۴۔ ایضاً ص ص۱۶۴، ۱۶۵

باب ششم: ماحصل

انسانی تاریخ کا آغاز حضرت آدمؑ سے شروع ہوا تھا جس کا سراغ ہمیں قرآن حکیم سے ملتا ہے۔ پچھلی دوصدیوں سے انسان جہاں کائنات کو سمجھنے اور اسے تسخیر کرنے کے لئے کوشاں ہے وہاں وہ انسانی تاریخ کو جاننے کی بھی کامیاب کوشش کرتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے اور آنحضرتؐ کے دورِ مبارک تک انسانی تاریخ ہزاروں لاکھوں سال کا فاصلہ طے کر چکی تھی۔

آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے مسلمانوں کی تاریخ کا آغاز آنحضرتؐ کے وجود مبارک سے ہوا۔ مسلمان دنیا کے ہر کونے میں آباد ہیں۔ لیکن زیادہ آبادی براعظم ایشیاء میں ہے۔ مسلمانوں کا قبلہ سعودی عرب میں ہے اور زبان عربی ہے۔ عربی زبان مسلمانوں کی مذہبی یعنی قرآن کی زبان ہے۔ مسلمان جو عرب ممالک میں ہیں ان کی سرکاری اور مذہبی زبان عربی ہے۔ تاہم کچھ ممالک ایسے بھی ہیں جو اسلامی ہیں لیکن ان کی سرکاری زبان عربی نہیں ہے۔

براعظم ایشیاء میں موجود پاکستان بھی ایک ایسا ملک ہے جو اسلامی ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق طے پایا کہ آئندہ پندرہ سال کے اندر ایسے انتظامات کئے جائیں کہ اُردو کو سرکاری زبان بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں سپریم کورٹ آف پاکستان اور وزیر اعظم پاکستان کی جانب سے واضح ہدایات جاری ہو چکی ہیں اور ان پر عملدر آمد بھی ہو رہا ہے۔ تاہم اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء کی داستان طویل اور دلچسپ ہے۔ اُردو زبان کے ساتھ ساتھ اُردو ادب بھی ایک دلچسپ اور کلاسیکی ادب کا درجہ رکھتا ہے۔

کائنات کے گزرے لمحات کو ماضی، تاریخ یا ہسٹری وغیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انسان اپنے ماضی کو محفوظ کرنے کے لئے گوناگوں طریقوں سے محفوظ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بادشاہ اپنے آپ کو ماضی میں زندہ رکھنے کے لئے اپنے عہد پر مشتمل کتب تحریر کرواتا ہے تو مصنف یا شاعر اپنی ذات اور غمِ دوراں کو اپنے عہد کی خوبیوں اور خامیوں کو قلم زد کرتا ہے۔ دنیا کی بیش تر آبادی کسی نہ کسی صورت میں اپنے ماضی کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ گویا تاریخ کو محفوظ کرنے اور تاریخ بنانے کا سلسلہ ازل سے ابد تک جاری وساری رہے گا۔

تاریخ دنیا کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ادبی تاریخ کی بات کی جائے تو یہ منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ ادبی تاریخ تہذیب یافتہ قوموں کے عروج و زوال کی داستان پیش کرتی ہے۔ دنیا کی ہر مکمل زبان کا ادب زندگی کی مختلف اکائیوں کا پیش خیمہ ہوتا

ہے۔ جو زبان اپنے ادب کو کلاسیکی حیثیت دینے کی طاقت رکھتی ہے۔اس کا ادب خود بخود عالمی ادب بن جاتا ہے۔شعراء و ادیب ہر معاشرے میں اس لئے اہمیت اختیار کر جاتے ہیں کہ وہ عام لوگوں سے مختلف سوچ کے حامل ہوتے ہیں۔ چیزوں کو باریک بینی سے دیکھ کر جزئیات نگاری کرتے ہیں۔ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ادیب نہ صرف سچائی تک پہنچتا ہے بلکہ قارئین تک اسے خوبصورت انداز سے پیش بھی کرتا ہے۔ بندشِ الفاظ، تخیل کی پرواز اور ادبی قواعد کو ہم آہنگ کر کے ادبی دنیا میں نام کماتا ہے۔ادب جب لحہ بہ لحہ سفر کرتے ہوئے صدیوں کی مسافت طے کرتا ہے تو مؤرخ اسے محفوظ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب تاریخ کی کتب کا ذخیرہ بن جاتا ہے تو وہ زبان وادب کی تاریخ کہلاتا ہے۔جس زبان کا ادب جتنا مضبوط ہوگا، زندہ جاوید رہے گا۔میرا تحقیقی مقالہ ''تواریخِ ادبیاتِ اُردو کا تحقیقی جائزہ'' کے عنوان سے ہے۔تواریخ ادب کا جائزہ لینا جان جوکھوں کا کام تھا کیوں کہ جتنی بھی ادبی تواریخ مرتب کی گئی وہ یا تو ادھوری تھیں یا پھر تاریخ کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالتی تھیں تاہم اس باب میں ایک مرتبہ پھر تمام کام کو یکجا کر دیا گیا ہے۔تاریخ بہ ذات خود ایک سائنس ہے۔اس کی حقیقت اور ماہیت جب تک معلوم نہ ہو اس وقت تک تاریخ نگاری کا فریضہ سرانجام نہیں پا سکتا۔تاریخ درحقیقت ان واقعات کا نام ہے جو معنی خیز اور ماضی، حال اور مستقبل سے پیوستہ ہوتے ہیں۔ان میں ایک ارتقائی سفر نظر آتا ہے۔تاریخ اقوام کے عروج وزوال کا بیانیہ ہے۔تاریخ واقعات کے تسلسل کو پیش کرتی ہے۔تاریخ کا ایک سماجی پسِ منظر ہوتا ہے۔جیسے جیسے سماج میں تبدیلی آتی ہے تاریخ کے واقعات ترتیب پاتے چلے جاتے ہیں۔تاریخ میں معاشرت، رسم و رواج، زبان اور ادب سب کچھ شامل ہوتا ہے۔تاریخ درحقیقت سماج اور کلچر کو بھی بیان کرتی ہے اور ان تبدیلیوں کو بھی موضوع بناتی ہے جو ادب پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ان واقعات کو بھی جو زبان و ادب پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔گویا تاریخ اور سماج کا گہرا تعلق ہے۔

تاریخ کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کیونکہ تاریخ ہی سے اقوام کے عروج وزوال کا اندازہ ہوتا ہے اور ترقی کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔تاریخ سے ہی اقوام کی سماج ترقی یا پستی کے اسباب کا علم ہوتا ہے۔تاریخ سے ہی انسان کے رجحانات، طبع، رویوں اور عادات واطوار سے آگاہی ہوتی ہے۔شہری زندگی، زبان وادب بھی تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں۔گویا تاریخ کی اہمیت مسلمہ ہے۔تاریخ میں ادبی تاریخ نگاری بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ ادب بہ ذاتِ خود ایک جامع تاریخ ہے۔جس میں کلچر، تمدن، زبان اور معاشرتی تبدیلیوں کی ایک جامع تاریخ ہوتی ہے۔ادبی تاریخ نگاری خاصی مشکل بھی ہے اور محنت طلب بھی ہے۔کیونکہ ادب کی تاریخ لکھنا گویا افراد کے ظاہر و باطن کو موضوع بنانا ہوتا ہے۔ادبی تاریخ نگاری کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ نگار نہ صرف معروضی واقعات پر نظر رکھتا ہو بلکہ زبان دان ہو، ادب فہم ہو، سماجی علوم پر نظر رکھتا ہو، وسیع مطالعہ کا حامل ہو، تنقیدی نظر رکھتا ہو، تحقیق کی جستجو اس کے باطن میں جاگزیں ہو، ادبی تاریخ نگاری کے لیے ضروری ہے کہ تاریخ نگار ادب،

زبان، سماجی علوم کا ماہر ہوتا کہ اسے ادبی تاریخ نگاری میں کوئی مشکل پیش نہ آسکے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ادبی نگاری کے جائزے کے وقت غائرانہ جائزہ لوں تاکہ ادبی نگاری مسائل اور معائب سامنے آسکیں۔ اُردو زبان و ادب کی تاریخ نگاری بھی ایک اہم موضوع رہا ہے۔ اس حوالے سے بہت اہم تواریخ لکھی گئیں ہیں جن کا جائزہ پیش کر دیا گیا ہے۔ اُردو زبان و ادب کی تاریخ نگاری کوئی اتنی پرانی بھی نہیں ہے۔ ابتداً تذکرتے اور بعد میں مختلف تواریخ سامنے آتی ہیں جن کا تفصیلی جائزہ پیش کر دیا گیا۔ علاقائی، عہد وار اصناف کے حوالے سے لکھی جانے والی تواریخ بہت اہم ہیں۔ ان کے مطالعے سے نہ صرف اُردو زبان و ادب کی تاریخ معلوم ہوتی ہے بلکہ ایک تہذیب اور کلچر سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ ادبی تاریخ نگاری میں تسلسل کا فقدان رہا ہے۔ اس کے اسباب تاریخ نگاری سے عدم دلچسپی رہی۔ لیکن ادبی تاریخ نگاری کا سنہری دور بھی رہا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب مؤرخین ادب نے تاریخ نگاری میں اصولوں کو مدنظر رکھا اور تسلسل کو ضروری سمجھا۔ ادبی تاریخ نگاری کے مسائل بھی بہت زیادہ ہیں جن کو باب اول میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسائل کے باوجود مؤرخینِ ادب نے تاریخ نگاری کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ مؤرخ کے اوصاف میں سب سے اہم وصف جستجو اور حقیقت تک رسائی کے لئے تحقیقی اور تنقیدی شعور ہے۔

مؤرخین ادب کے اوصاف بھی باب اول میں بیان کر دئے گئے ہیں تاکہ ادبی تاریخ نگاری سے دلچسپی رکھنے والے آگاہ ہوسکیں۔ عمومی تاریخ نگاری پر نظر ڈالیں تو آبِ حیات پہلی تصنیف ہے جو ادبی تاریخ نگاری کا نقش اول ہے۔ نقش اول کا وہ معیار تو نہیں ہوسکتا جو بعد میں قائم ہوتا ہے کیونکہ ارتقائی سفر میں بہتری آتی ہے۔ اس باب میں شعرالہند سے لے کر تاریخِ ادبیات اُردو از گارسیں دتاسی کا جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اُردو تاریخ نگاری کس کس طرح ارتقاء کی منازل سے گزری ہے اور کون کون سے تاریخ نگار تاریخ نگاری میں کارہائے نمایاں سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اس باب میں کوشش کی گئی ہے کہ ہر تاریخ کی کتاب کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تاکہ کتاب فہمی میں تشنگی نہ رہ جائے مثلاً ''آبِ حیات'' ہی کو لے لیں۔ اس کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اُس کا بھی تفصیلی تذکرہ کر دیا گیا ہے اور بنیادی ماخذ کو بھی بیان کیا گیا ہے یعنی ''آب حیات'' سے بھی حوالے دے دیئے گئے ہیں تاکہ ''آب حیات'' کے اسلوب اور واقعات کی سچائی پر نظر پڑے۔ عمومی تاریخ کے باب میں درحقیقت تاریخ کو زمانی اعتبار سے موضوع بنایا گیا ہے تاکہ قارئین تاریخ کی ایک مفصل تفصیل سے آگاہ ہوسکیں۔ اس باب میں جتنی بھی تواریخ شامل ہیں۔ اُن کے ذریعے مؤرخین کے نکتہ نظر کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس طرح اس باب میں ایک ایسا جائزہ پیش کیا گیا ہے کہ آغاز ہی میں اُردو زبان و ادب کی تاریخ کے ابتدائی نقوش ابھر کر سامنے آجاتے ہیں جس سے قارئین مستفید ہوتے ہیں۔

باب سوم صنف وار تاریخ نگاری سے متعلق ہے۔ یہ باب اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ اس میں اصنافِ نظم و نثر سے متعلق لکھی جانے والی اہم کتب تواریخ کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حوالے سے چند اہم کتبِ تواریخ میں

''گلِ رعنا'' از سید حکیم عبدالحیی، اُردو میں ڈراما نگاری از سید بادشاہ حسین حیدرآبادی، جدید اُردو شاعری از عبدالقادر سروری، اُردو حج کے سفر نامے از ڈاکٹر محمد شہاب الدین، اُردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند، اُردو کی دو قدیم مثنویاں از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اُردو سٹیج ڈراما از ڈاکٹر اے۔ بی اشرف، اُردو افسانے کا ارتقاء از ڈاکٹر مسعود رضا خاکی، اُردو میں مقدمہ نگاری کی روایت از ڈاکٹر ارم سلیم شامل ہیں۔ تقریباً چوبیس کتب تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصنافِ ادب نے تواتر کے ساتھ ارتقائی سفر طے کیا ہے۔ اس باب کے مطالعے سے اہل ادب اصناف کے ارتقائی سفر کو بہ خوبی سمجھ سکیں گے۔ تواریخ نگاری میں اصناف کا خصوصی مطالعہ اور جائزہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

باب چہارم علاقہ وار تاریخ نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ درحقیقت اس باب میں اُن کتب تاریخ کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے جن سے اُردو کے آغاز وارتقاء کے نظریات کا علم ہوتا ہے مثلاً دکن میں اُردو از ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی میں ڈاکٹر موصوف نے اُردو کے آغاز کے بارے میں نظریہ پیش کیا ہے کہ اُردو آغاز دکن سے ہوا۔ ''پنجاب میں اُردو'' از حافظ محمود شیرانی میں کہا گیا ہے کہ اُردو کا آغاز پنجاب سے ہوا اور اس پر زیادہ سے زیادہ اثرات پنجابی زبان کے ہیں۔ اسی طرح ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی میں شاعری کے متعلق لکھنؤ کی خدمات کو پیش کیا گیا ہے جبکہ دہلی کا دبستانِ شاعری میں دہلی میں اُردو شاعری کے احوال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ سب کتب وہ ہیں جو اُردو نظم ونثر کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کتب کے علاوہ تاریخِ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کا جائزہ لیا گیا ہے جو بہت اہم کتاب ہے۔ اس کی پانچ جلدیں ہیں۔ اس کتاب کا بھی تفصیلاً مطالعہ پیش کیا گیا ہے تاکہ اُردو ادب کی تاریخ کے تمام گوشے سامنے آجائیں۔ اس باب میں مقتدرہ قومی زبان سے شائع ہونے والی پانچ جلدوں میں ''پاکستان میں اُردو'' بھی شامل ہے۔ یہ تاریخ کی بہت اہم کتاب ہے۔ اس میں جلد اوّل سندھ، جلد دوم بلوچستان، جلد سوم سرحد، چہارم پنجاب اور پنجم کشمیر کے متعلق ہے۔ اس تاریخ ادب کو پروفیسر فتح محمد ملک اور سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ نے مرتب کیا ہے۔ اس تاریخ میں مختلف اہل وقلم حضرات نے اُردو زبان وادب پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ باب اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ اس میں اُردو زبان وادب کے آغاز وارتقاء اور حقیقت پر جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب پنجم عہد وار تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس باب میں کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ ادب اُردو کا غائرانہ جائزہ لیں مثلاً داستانِ تاریخ اردو (ابتداء سے بیسویں صدی کے آغاز تک) میں تاریخ اُردو کا بیسویں صدی تک کا تفصیلاً جائزہ لیا گیا ہے۔ زیرِ مطالعہ کتاب سے بیسویں صدی تک اُردو کی پوری تاریخ نمایاں ہوجاتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے دیگر کتب کا مطالعہ ضروری نہیں رہتا۔ اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب تاریخِ ادب اُردو جلد اول تا چہارم ادوار میں تقسیم کی گئی ہے۔ اس کا بھی جائزہ غائرانہ انداز میں لیا گیا ہے۔ اس باب کے مطالعے سے خصوصاً ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب کے جائزے سے تاریخ ادب اُردو کے تمام ادوار سمجھ آجاتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج (تحریک اور تاریخ) از پروفیسر وقار عظیم، اُردو ادب کی

تحریکیں از ڈاکٹر انور سدید، اُردو شاعری کا ارتقاء (۱۷۳۹ء تا ۱۸۰۳ء) از ڈاکٹر ناہید کوثر کا جائزہ بھی اسی باب میں لیا گیا ہے۔فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات انیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتی ہیں۔ یہ کتاب اس لئے بھی اہم ہے کہ اس سے اُردو کے ابتدائی کتب کا پتہ چلتا ہے خصوصاً داستانی ادب جبکہ اُردو ادب کی تحریکیں آغاز سے اب تک کی ادبی اور تنقیدی تحاریک پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کا جائزہ بھی بہت اہم ہے جو اس باب میں خصوصی طور پر لیا گیا ہے۔ اُردو شاعری کا ارتقاء ۱۷۳۹ء تا ۱۸۰۳ء بہت اہم کتاب ہے کیونکہ اُردو شاعری کیا ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے شاعری پر مکمل روشنی پڑتی ہے۔

باب اول سے باب پنجم تک اُردو تاریخ نگاری کا اس طرح جائزہ لیا گیا ہے کہ اُردو شاعری اور نثر کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔اس مقالے کے مطالعے سے تاریخ ادب اُردو ہر اعتبار سے واضح ہو جاتی ہے۔اصناف، علاقائی، عہدوار اور عمومی سطح پر تاریخ ادب اُردو سمجھ میں آجاتی ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ادبی تاریخ نویسی سچائیوں کی عکاس ہوتی ہے۔عہد بہ عہد ادب کا نام ہے۔مؤرخ ان تمام رعنائیوں اور رونقوں کو بیان کرتے ہوئے مآخذ اور معلومات کے خفیہ خزانے قاری پر وا کرتا ہے۔اس لئے اسے عصری شعور کا مالک ہونا چاہئے۔حقائق کو پرکھنے کا ہنر بھی آنا چاہئے جس کے لئے تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ تخلیقی افکار کا مالک ہونا بھی ضروری ہے۔اگرچہ ماضی میں ان تمام باتوں کا کلی طور پر خیال نہیں رکھا گیا جس سے ہماری تاریخ کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ جب انسانی شعور ارتقائی منازل طے کرتا ہے تو وہ مادی تبدیلیوں سے متاثر ہو رہا ہوتا ہے۔اس طرح تاریخ کے ادوار بھی کسی بڑی تبدیلی کے عکاس ہوتے ہیں۔اس میں کسی دور کو نظر انداز کرنا ناانصافی ہے۔ بہرحال ادبی تاریخ لکھنے والے ہی حقائق کے بہت بڑے ذخیروں کو منظر عام پر لا سکتے ہیں اب تک جو ہماری ادبی تاریخ ہے ہم اس پر فخر اس لئے کر سکتے ہیں کہ یہ کسی نکتے پر اپنے آپ کو مکمل ضرور کرتی ہے۔ادب کے ظاہر و باطن تک مؤرخین نے پہنچنے کی جو کوششیں کی ہیں انہیں کامیاب کاوش کہتے ہیں۔ہمیں شرمانا نہیں چاہئے۔ البتہ یہ بات مدنظر رکھنی چاہئے کہ اس کام کو مزید بہتر کرنے کی گنجائش موجود ہے۔اس طرح ہم اپنی قومی اور اجتماعی تہذیب کو ادب کے شیشے میں زندہ دلی سے محفوظ کر کے صفحہ تاریخ پر دنیا کو دکھا سکتے ہیں۔امید کی جاسکتی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ہم ادب کو قومی تہذیب میں ضم کر کے دنیا کی تاریخ میں درج کروالیں گے۔

تاریخ ادب اور تخلیقی ادب بھی ہے تحقیق بھی ہے اور تنقید بھی۔ایک مؤرخ تاریخ لکھتے ہوئے جب تجزیہ کرتا ہے تو وہ تنقید سے کام لیتا ہے اور جب واقعات کی سچائی تلاش کرتا ہے اور اس کے بنیادی مآخذ تک رسائی حاصل کرنے کی جستجو کرتا ہے تو وہ ایک محقق بن جاتا ہے۔اسی طرح جب ایک مؤرخ تخلیقات میں موضوعات کی بازیافت کرتا ہے تو وہ تخلیق کاری کے مقام پر متمکن دکھائی دیتا ہے۔گویا مؤرخ تاریخ نگاری میں کئی حثیات میں کام کر رہا ہوتا ہے۔تاریخ نگاری کے لئے تحقیقی جستجو، تنقیدی پرواز اور تخلیقی صلاحیت ضروری ہے۔

اشاریہ

اسمائے رجال:

اماکن:

اسمائے الکتب:

اسمائے اللسان:

کتابیات

۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر لکھنؤ کا دبستان شاعری، غضنفر اکیڈمی، پاکستان، کراچی، طبع دوم، ۱۹۸۷ء

۲۔ ابواللیث صدّیقی، ڈاکٹر، آج کا اُردو ادب، فیروزسنز لمیٹڈ، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۷۰ء

۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، اُردو شاعری لکھنؤ میں، مشمولہ

۴۔ ابوسعید نورالدین، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات اُردو (حصہ اوّل)، مغربی پاکستان، اُردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۷ء

۵۔ ابوسعید نورالدین، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات اُردو (حصہ دوم)، مغربی پاکستان، اُردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۷ء

۶۔ احتشام حسین، ادبی تاریخ، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''

۷۔ احسن مارہروی، نمونہ منثورات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع نو

۸۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر ''قائم چاندپوری''، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد دوم)

۹۔ اسمٰعیل امروہوی، اُردو کی دو قدیم مثنویاں، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اوّل، جنوری ۱۹۷۰ء

۱۰۔ اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی، مختصر تاریخ ادب اُردو عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، طبع اول ۱۹۵۳ء

۱۱۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر سید (ایم۔اے۔ڈی لٹ) مختصر تاریخ ادب اُردو، آزاد کتاب گھر، کلاں محل دھلی، س ن

۱۲۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر سید (ایم۔اے۔ڈی لٹ) مختصر تاریخ ادب اُردو، اُردو اکیڈمی سندھ، طبع سوم، ۱۹۷۱ء

۱۳۔ ارم سلیم، ڈاکٹر، اُردو میں مقدمہ نگاری کی روایت، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء

۱۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اوّل، فروری ۱۹۹۱ء

۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، طبع نہم

۱۶۔ اے بی اشرف، اُردو سٹیج ڈرامہ (رادھا کنہیا سے انارکلی تک اُردو سٹیج ڈرامے کی مکمل تاریخ)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اوّل دسمبر ۱۹۸۶ء

۱۷۔ آرزو چودھری، داستان کی داستان، عظیم اکیڈمی اُردو بازار لاہور، ۱۹۸۸ء

۱۸۔ آزاد، محمد حسین، آب حیات، خزینہ علم و ادب الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۰۱ء

۱۹۔ آغا سہیل، ڈاکٹر، دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقاء، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، طبع اوّل، دسمبر ۱۹۸۸ء

۲۰۔ بادشاہ حسین، سید، (حیدرآبادی) اُردو میں ڈرامہ نگاری، تاج بکڈپو، اُردو بازار، لاہور ۱۹۶۲ء

۲۱۔ بشیر احمد سوز، پروفیسر، ہزارہ میں اُردو زبان و ادب کی تاریخ، ادبیاتِ ہزارہ، جون ۲۰۱۰ء

۲۲۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ادبی تاریخ کی تشکیل نو کے مسائل، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''

۲۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء

۲۴۔ جلال الدین احمد جعفری، زینبی، مولوی حافظ، قند اُردو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

۲۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد اول) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۵ء

۲۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو، (جلد اوّل) قدیم دور (آغاز سے ۱۷۵۰ء تک) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء

۲۷۔ جمیل جالبی ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد اول) مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع ہفتم ۲۰۰۸ء

۲۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد دوم) مجلسِ ترقی ادب لاہور، طبع چہارم، جنوری ۲۰۰۵ء

۲۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو، (جلد دوم) (اٹھارویں صدی) مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور طبع چہارم، جنوری ۲۰۰۵ء

۳۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اُردو، (جلد سوم) (انیسویں صدی: نصف اوّل)، مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور طبع اوّل، جنوری ۲۰۰۶ء

۳۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد چہارم) علی پرنٹرز، ۱۹۔اے ایبٹ روڈ لاہور

۳۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (معاصر ادب) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء

۳۳۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اُردو، بک کارنر جہلم، پاکستان، ستمبر ۲۰۱۶ء

۳۴۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اُردو، اُردو اکیڈمی سندھ، طبع چہارم، ۱۹۸۸ء

۳۵۔ حنیف نقوی، ڈاکٹر، شعرائے اُردو کے تذکرے، نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ، طبع اوّل، جون ۱۹۷۶ء

۳۶۔ حمیدالدین شاہد باشتراک تبسم کاشمیری، ادبیاتِ گولکنڈہ مشمولہ، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد اوّل)

۳۷۔ راحت افزا بخاری، شیخ محمد ابراہیم زوق، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد سوم)

۳۸۔ رالف رسل، اُردو ادب کی جستجو، (محمد سرور رجا مترجم)، انجمن ترقی اُردو پاکستان، گلشن اقبال، کراچی، ۲۰۰۳ء

۳۹۔ رالف رسل، ''اُردو ادب کی تاریخ کیسے نہیں لکھنی چاہئے''، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''

۴۰۔ رضی عابدی، پروفیسر، اُردو ادب کی تاریخ کیسے لکھی جائے، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی'' (ڈاکٹر سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر) پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، طبع دوم ۲۰۱۵ء

۴۱۔ رشید حسن خاں، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۸ء

۴۲۔ رؤف پاریکھ، مرتب، اُردو تحقیق وتدوین کا تاریخی وتنقیدی جائزہ، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۲۰۱۳ء

۴۳۔ ریاض مجید، ڈاکٹر، اُردو میں نعت گوئی، اقبال اکادمی پاکستان، میکلوروڈ لاہور، طبع اوّل، ۱۹۹۰ء

۴۴۔ زوار حسین، تہذیب، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۰ء

۴۵۔ سبطِ حسن، ''تہذیب سے تمدن تک، مشمولہ ''کلچر'' از اشتیاق احمد بیت الحکمت لاہور، ۲۰۰۷ء

۴۶۔ سجاد باقر رضوی، مغرب کے تنقیدی اصول، اظہار سنز لاہور، ۱۹۷۱ء

۴۷۔ سروری، عبدالقادر، جدید اُردو شاعری، مطبوعہ عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور، طبع سوم ۱۹۴۵ء

۴۸۔ سعد مسعود غنی، ادبی تاریخ نویسی اور تواریخِ ادب اُردو، المضر اب پبلشرز، ملتان، ستمبر ۲۰۰۵ء

۴۹۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اُردو، (مترجم) مرزا محمد عسکری، علمی کتاب خانہ اُردو بازار، لاہور

۵۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو اَدب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

۵۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع تیسویں ۲۰۱۳ء

۵۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، (اضافہ شدہ ایڈیشن)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء

۵۳۔ سلیم بیگ، مرزا، سکسینہ کی تاریخ ادب اُردو، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''

۵۴۔ سنیتی کمار چٹر جی، ہند آریائی اور ہندی، عتیق احمد صدیقی مترجم ۳۱، ترقی اُردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

۵۵۔ سیدّہ جعفر، پروفیسر، گیان چند، پروفیسر، تاریخ ادب اُردو (جلد اوّل)، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، جولائی، ستمبر ۱۹۹۸ء

۵۶۔ سید سلیمان ندوی، نقوشِ سلیمانی، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء

۵۷۔ شاکر کنڈان، ادبی تاریخ نویسی کے اصول، مرتبین ڈاکٹر سید عامر سہیل، نسیم عباس احمر) پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، طبع دوم ۲۰۱۵ء

۵۸۔ شاہدہ بیگم، ڈاکٹر، سندھ میں اُردو، اُردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۸۰ء

۵۹۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر، ''مرزا محمد رفیع سودا''، مشمولہ

۶۰۔ صابر آفاقی، پروفیسر ڈاکٹر، اُردو کی ماں گوجری، مشمولہ اُردو کی خالق گوجری، چوہدری اشرف ایڈووکیٹ

۶۱۔ ظفر الاحسن لاری، ادبی تاریخ کے اصول، مشمولہ ''اُردو کی ادبی تاریخیں'' (نظری مباحث) مرتبہ سلمان احمد (پرویز احمد) قصر الادب حیدر آباد، ۱۹۹۹ء

۶۲۔ عابدہ بیگم، ڈاکٹر، اُردو نثر کا ارتقاء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبع اوّل، دسمبر ۱۹۸۸ء

۶۳۔ عبدالباقی نسیم، گوجراور گوجری زبان، گوجری ادبی بورڈ، پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء
۶۴۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، اُردو کی ابتدائی صحافت، مشمولہ
۶۵۔ عبدالحق، ڈاکٹر، مولوی (بابائے اُردو)، اُردو کی ابتدائی نشو نما میں صوفیائے کرام کا کام، انجمن ترقی اُردو، پاکستان کراچی، طبع چہارم، ۱۹۷۷ء
۶۶۔ عبدالحیی، مولانا حکیم، گلِ رعنا، عشرت پبلیشنگ ہاؤس، ہسپتال روڈ، انارکلی، طبع اوّل ۱۹۶۴ء
۶۷۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، تنقیدی نقوش، مشتاق بک ڈپو، کراچی ۱۹۶۲ء
۶۸۔ عبدالسلام ندوی، شعرالہند (حصہ اوّل) معارف اعظم گڑھ (سلسلہ دارالمصنّفین)، طبع سوم، ۱۹۴۲ء
۶۹۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، اُردو ادب ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۶ء، مکتبہ خیابان ادب، چیمبرلین روڈ، لاہور، طبع اوّل، ستمبر ۱۹۶۷ء
۷۰۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، دیباچہ، مشمولہ مقالاتِ، حافظ محمود شیرانی (حصہ اول)، مظہر محمود شیرانی (مرتبہ) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء
۷۱۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید، ''میر تقی میر''، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد دوم)
۷۲۔ عفت زریں، ڈاکٹر، فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں، ۱۹۹۲ء، مکتبہ جامع دہلی
۷۳۔ علی جواد زیدی، تاریخ ادب اُردو کی تدوین، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''
۷۴۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اُردو کی پیدائش اور اِرتقاء، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد اوّل)
۷۵۔ علی محمد خان، ڈاکٹر، لاہور کا دبستانِ شاعری، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء
۷۶۔ عین الحق فریدکوٹی، اُردو زبان کی قدیم تاریخ، ارسلان پبلی کیشنز لاہور، (مغربی پاکستان) جون ۱۹۷۲ء
۷۷۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، اُردو زبان اور اُردو رسم الخط لسانی تعبیر اور روحانی تفسیر، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان
۷۸۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، (مرتبین) پاکستان میں اُردو (جلد اوّل)، سندھ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء
۷۹۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، مرتبین پاکستان میں اُردو (جلد دوم) بلوچستان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء
۸۰۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، مرتبین پاکستان میں اُردو (جلد سوم) اباسین (سرحد + شمالی علاقہ جات)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء
۸۱۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، مرتبین پاکستان میں اُردو (جلد چہارم) پنجاب،

مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء

۸۲۔ فتح محمد ملک، پروفیسر، سید سردار احمد پیرزادہ، تجمل شاہ، مرتبین پاکستان میں اُردو (جلد پنجم) کشمیر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، طبع اوّل، ۲۰۰۶ء

۸۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو کی فنی تاریخ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، پاکستان، طابع گنج شکر پریس، لاہور، سال اشاعت ۲۰۰۳ء

۸۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، انجمن ترقی اُردو، کراچی پاکستان، ۱۹۹۸ء

۸۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو کی بہترین مثنویاں، الاعجاز پبلی کیشنز، سال اشاعت ۲۰۰۷ء

۸۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو کی منظوم داستانیں، انجمن ترقی اُردو پاکستان، گلشن اقبال، کراچی، طبع دوم ۲۰۰۲ء

۸۷۔ فیاض محمود، گروپ کیپٹن سید، مدیر خصوصی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (اُردو ادب)، جلد پنجم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع اوّل، فروری ۱۹۷۲ء

۸۸۔ کے ایم منشی، گوجر زبان، مشمولہ تاریخِ گوجر، علی حسن چوہان، (مرتب) انٹرنیشنل پریس، کراچی، ۱۹۸۹ء

۸۹۔ گارسیس دتاسی (تاریخ ادبیات اُردو) فرانسیسی سے اُردو مترجم (لیلیان سکستین نازرو)، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، طبع اوّل، فروری ۲۰۱۵ء

۹۰۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اُردو مثنویاں (ہندوستانی قصوں سے ماخوذ)، فروغ اُردو زبان دہلی، دسمبر ۲۰۰۱ء

۹۱۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ، ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، ۱۹۹۳ء

۹۲۔ گیان چند، ڈاکٹر، اُردو کی ادبی تاریخیں، انجمن ترقی اُردو پاکستان ۲۰۱۵ء

۹۳۔ گیان چند، ڈاکٹر، اُردو کی نثری داستانیں (اضافہ شدہ ایڈیشن) ۱۹۶۹ء

۹۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، ''اُردو کی ادبی تاریخ کا ارتقاء'' (ڈاکٹر سید عامر سہیل/نسیم عباس احمر) مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور

۹۵۔ گیان چند، ڈاکٹر، اُردو میں تحقیق و تدوین، مشمولہ اُردو تحقیق و تدوین کا تاریخی و تنقیدی جائزہ، مرتب رؤف پاریکھ

۹۶۔ مسعود حسین خان، ڈاکٹر، تاریخ زبان اُردو، اُردو مرکز لاہور، (صدر دفتر اُردو اکیڈمی سندھ)، ۱۹۶۶ء

۹۷۔ مسعود رضا خاکی، ڈاکٹر، اُردو افسانے کا ارتقاء، مکتبہء خیال لاہور، اگست ۱۹۸۷ء

۹۸۔ مجاہد کامران، پروفیسر ڈاکٹر، طبع دوم، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد اوّل)

۹۹۔ محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اُردو (حصّہ اول)، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، طبع دوم، ۱۹۹۸ء

۱۰۰۔ محمد اشرف، چوہدری، ایڈووکیٹ، اُردو کی خالق گوجری زبان

۱۰۱۔ محمد اشرف، چوہدری، ایڈووکیٹ، گوجروں کا عروج و زوال، نوائے گوجر پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء

۱۰۲۔ محمد اکرام، شیخ، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، طبع ہشد ہم ۱۹۹۴ء اظہار سنز پرنٹرز، لاہور

۱۰۳۔ محمد باقر، ڈاکٹر، اُردوئے قدیم (دکن اور پنجاب میں) مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اوّل، اگست ۱۹۷۲ء

۱۰۴۔ محمد باقر، آغا، تاریخ نظم ونثر اُردو، آزاد بک ڈپو، امرتسر، آزاد بھارت میں باریونین پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۳۲ء

۱۰۵۔ محمد ایوب قادری، ڈاکٹر، اُردو نثر کے ارتقاء میں علما کا حصہ شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، طبع اوّل

۱۰۶۔ محمد حسن ڈاکٹر، تاریخ ادب کی تدریس، مشمولہ ’’ادبی تاریخ نویسی‘‘

۱۰۷۔ محمد زکریا، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان وہند (جلد اوّل)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۹ء

۱۰۸۔ محمد زکریا، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان وہند (جلد دوم)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۹ء

۱۰۹۔ محمد زکریا، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان وہند (جلد سوم)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع دوم، مارچ ۲۰۱۰ء،

۱۱۰۔ محمد زکریا، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان وہند، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، (جلد چہارم)، طبع دوم ۲۰۱۰ء

۱۱۱۔ محمد شہاب الدین، اُردو میں حج کے سفرنامے، یونی ورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، س۔ن

۱۱۲۔ محمد مجیب، دنیا کی تاریخ، سٹی بک پوائنٹ کراچی، ۲۰۰۹ء

۱۱۳۔ محمود بریلوی، پروفیسر، مختصر تاریخ ادب اُردو (باتصویر)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، طبع اوّل ۱۹۸۵ء

۱۱۴۔ محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اُردو (حصّہ اول)، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، طبع دوم، ۱۹۹۸ء

۱۱۵۔ مظہر محمود شیرانی، حافظ محمود شیرانی اور ان کی ادبی خدمات، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۱۶۔ مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر، مرتب، مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (جلد پنجم)، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، جون ۱۹۹۹ء

۱۱۷۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، ادبی تاریخ نویسی: صورتحال ارتقاء مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''

۱۱۸۔ ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر، اُردو مرثیہ لکھنؤ میں (میر ببر علی انیس)، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد سوم)

۱۱۹۔ ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر، داغ دہلوی اور امیر مینائی، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد چہارم)

۱۲۰۔ ناہید کوثر، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا ارتقاء، (۱۷۳۹ء تا ۱۸۰۳ء)، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۲۱۔ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اُردو، بک ٹاک، میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، لاہور، ۲۰۱۴ء

۱۲۲۔ نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر، دہلی کا دبستانِ شاعری، بک ٹاک، میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء

۱۲۳۔ وقار احمد رضوی، پروفیسر ڈاکٹر سید، تاریخ نقد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد/کراچی، طبع اوّل، ۲۰۰۴ء،

۱۲۴۔ وقار عظیم، پروفیسر سید، اُردو ڈرامہ (تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ) سالِ اشاعت ۱۹۹۶ء

۱۲۵۔ وقار عظیم، پروفیسر سید، ہماری داستانیں، الوقار پبلی کیشنز، طابع گنج شکر پریس، لاہور

۱۲۶۔ وقار عظیم، پروفیسر سید، فورٹ ولیم کالج (تحریک اور تاریخ)، ترتیب، تعارف، تعلیقات (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)، یونیورسل بکس، اُردو بازار، لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۸ء

ب (انگریزی)

۱۲۷۔ Muhammad Sadiq, A history of Urdu literature, Oxford University press, London, 1995.

ج۔ لغت

۱۔ فیروز الدینؒ، الحاج مولوی (مرتب)، فیروز اللغات اُردو جامع (نیا ایڈیشن)، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، س ن

د۔ جرائد

۱۔ آسیہ نورین، ادبی تاریخ نویسی، مشمولہ ''زبان وادب''، شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، مدیر ڈاکٹر شبیر احمد قادری، شمارہ ۱۰، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء

۲۔ رضی عابدی، پروفیسر، اُردو ادب کی تاریخ کیسے لکھی جائے، مشمولہ ماہنامہ ماہ نو، گولڈن جوبلی نمبر، اگست ۱۹۹۷ء

۳۔ سبینہ اویس، ڈاکٹر، تواریخ ادب اُردو۔ ایک جائزہ، مشمولہ ''پیغام آشنا''، مدیر، ڈاکٹر علی کمیل قزلباش، شمارہ نمبر ۶۶، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء

۴۔ سعدیہ طاہر، اُردو ادب کی تاریخ ایک جائزہ، مشمولہ 'دریافت'، مدیر ڈاکٹر رشید امجد، نیشنل یونیوسٹی اسلام آباد، ستمبر، ۲۰۰۴ء

۵۔ سہیل احمد اُردو ادب کی تاریخ، تدریس کے لئے تناظرات، مشمولہ خیابان، مدیر، ڈاکٹر بادشاہ منیر بخاری، جامعہ پشاور، بہار ۲۰۱۲ء

۶۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، ''کتاب خانہ شیرانی کے نوادر'' مشمولہ اورینٹل کالج میگزین (شیرانی نمبر)، فروری ۱۹۴۷ء

۷۔ علی جواد زیدی، تاریخ ادب اُردو کی تدوین، مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''، ص ۴۵

۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ''اُردو کی ادبی تاریخ کا بنیادی مواد اور مولوی عبدالحق، مشمولہ 'ماہنامہ'' قومی زبان''، کراچی، اگست ۲۰۰۲ء، ص ۲۴

۹۔ محمد سلیم ملک، ڈاکٹر، بازیافت، شعبہ اُردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شمارہ ۱۰، جنوری ۲۰۰۷ء تا جون ۲۰۰۷ء

۱۰۔ محمد طفیل، مدیر، ماہنامہ نقوش (ادبی معرکے نمبر ۲)، ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، ۱۹۸۱ء

۱۱۔ محمد صادق، ڈاکٹر، نظیر اکبر آبادی، مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (جلد دوم)

۱۲۔ محمد فاروق سولنگی، پروفیسر، گوجری اور اُردو، مشمولہ، اُردو کی خالق گوجری

۱۳۔ محمد طفیل، مدیر، ماہنامہ نقوش (ادبی معرکے نمبر ۲)، ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، ۱۹۸۱ء

۱۴۔ محمود الحسن / شفیق انجم، ڈاکٹر، فنِ تاریخ نویسی اور اُردو ادب کی چند اہم تاریخیں، مشمولہ ''دریافت''، شمارہ ۱۳

۱۵۔ معین الدین، ڈاکٹر عقیل، ادبی تاریخ نویسی: صورتحال اور تقاضے، مشمولہ 'بازیافت''، مدیر ڈاکٹر محمد سلیم ملک

۱۶۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، ادبی تاریخ نویسی: صورتحال ارتقاء مشمولہ ''ادبی تاریخ نویسی''

۱۷۔ ناہید قمر، ڈاکٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیقی خدمات، مشمولہ ''دریافت''، مدیر، ڈاکٹر رشید امجد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوجز، اسلام آباد، بہار ۲۰۰۳ء، شمارہ ۲